

دلچسپ اور ترقی خیز کہانیوں کا مجموعہ

# ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

مئی 2014

محمد انعامی

معراج رشول

پاک سوسائٹی  
ڈاٹ کام

نئی سلسلہ کہانی  
آوارہ گرد  
اس شام میں پہلی قسط



[WWW.PAKSOCIETY.COM](http://WWW.PAKSOCIETY.COM)

55 **سليم انور**  
**موقع شناس**  
 چابک دستی اور ہوشیاری کے کھیل  
 گئی بازی کا چونکا دینے والا اختتام

14 **عبدالرب بھٹی**  
**آوارہ گرد**  
 تحسیر... سنسنی اور ایکشن میں  
 ابھرنا ڈوبنا دلچسپ سلسلہ...

07 **مدیر اعلیٰ**  
**چینی ایکٹو جینج**  
 قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں  
 نامہ دنیا، مجبیتیں، عنایتیں اور کایتیں!

81 **آصف ملک**  
**لاچ کہانی**  
 لاچ طمع میں ایک بے ایک  
 گرفتار ہو جانے والوں کا المیہ

67 **مریم اکبر خان**  
**تنگ آمد**  
 اچھے اور بُرے لوگوں سے دنیا بھری پڑی  
 ہے وہ بھی اپنے لیے کسی نجات دہندہ کا منتظر تھا

65 **بابر نعیم**  
**گورکن**  
 اس گورکن کی مشکل جسے ایک  
 ناگوار فریضہ انجام دینا تھا

145 **مختار آزاد**  
**دندان شکن**  
 عنایت... مصلحت اور کم انواری کے جال میں الجھ کر  
 خطرناک داؤ کھیلنے والے کھلاڑی کا پہاڑ بھارت کھیل...

139 **سکندر علیم**  
**قتل مقتول**  
 انسانی ذہن کی قلا بازیاں... احساسات  
 اور گہرے مشاہدے کی بہترین مثال

96 **احمد اقبال**  
**جواری**  
 زندگی کی بساط پر اندھا جو کھیلنے  
 والے کھلاڑی کی ہوش رُبا داستان

185 **امجد رئیس**  
**آوارہ گردی**  
 اس نوجوان کا قصہ جو سچ کی تلاش  
 میں متواتر حالت سفر میں تھا...

182 **جمال دستی**  
**دوسرا بچہ**  
 ارادے اور خواہش کے ملاپ سے  
 جسم لینے والی جرم کی بازگشت

158 **اقبال کاظمی**  
**شکست**  
 ماضی کا ایک اٹھتہ قصہ جو نقطے سے  
 دائرے کی صورت اختیار کرتا چلا گیا...

193 **دانیال عارف**  
**جانے مرگ**  
 مجبور یوں اور صعوبتوں کے الاؤ میں  
 دھک جانے والے معصوموں کا احوال



189 **منظر امام**  
**بساط عشق**  
 میزان محبت پر چاہتوں کا کپڑا  
 امتحان... ایک نڈل ربا کہانی

224 **سليم فاروقی**  
**قصر جاں**  
 ذہن کے بندھن میں بندھ کے ہر بندھن سے  
 آزاد ہوجانے والے ہوں پرست کا وہ تم کشافنا



207 **سمن باحلم**  
**مسافر**  
 ایک باپ اور بیٹی کے درمیان  
 جاری حیات و موت کی رتاشی...

000 **ادارہ وقارین**  
**تراش خراش**  
 اقتباسات گدگدیاں سکراہٹیں اور قہقہے  
 سب کچھ آپ کی تفریح و تہنیت اور توجہ کے لیے

257 **کاشف زبیر**  
**رابطہ**  
 انسانی ذہن اور باطن کی کیفیات کا  
 ماجرا... ہر بہتہ مازوں کا سنسنی خیز انکشاف

پبلشر و پروپر ایٹر: عذرا رسول  
 مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس  
 کمرشل ایڈمین کورنگی روڈ، کراچی 75500  
 پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ:  
 ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ  
 عذرا رسول

جلد 44 • شماره 05 • مئی 2014 • ذریعہ سالانہ 700 روپے  
 • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •  
 خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200  
 فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021)  
 E-mail: jdpgroup@hotmail.com

## آوارہ گرد

عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور انا تہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنٹوں نے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پوربا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکہ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ پونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی منی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کہیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چنکا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تیسرے سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا  
ڈوبتا پچھلے...

جہاں میں تھا، وہاں کی دنیا ہی الگ تھی۔ یہ نہ جیل خانہ تھا، نہ یتیم خانہ اور نہ ہی اس کا تعلق جرائم سے تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی، سب سے الگ تھلک جہاں ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔ یہ خوشی، چاہے کتنی حقالتی کو مان کر یا انہیں سہہ کر یا پھر مصلحت کوشی کے نام پر سہی... بس! ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔

یہاں ہمیں کھانے کو بھی ملتا، پینے کو بھی اور پہننے کو بھی۔ ہمیں یہاں پڑھایا لکھایا بھی جاتا تھا۔ کسی حد تک دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں کی منظر کا جانے کیا نام تھا مگر سب بچوں میں وہ ”آپا جی“ کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کا رویہ بھی ہم سے محبت بھرا ہوتا تھا۔ ان کی عمر چالیس، پینتالیس کے بیچ رہی ہوگی۔ جسم بھاری، رنگ گورا اور تانک پر نظر کے چشمے نے ان کی شخصیت کو پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ بڑی نرم آواز میں ہم سب سے مخاطب ہوتیں، قد بھی بوٹا سا تھا۔ ہم بارہ بارہ، تیرہ تیرہ سال کے بچے، ان کے برابر کے

”بیٹا! اس طرح مت سوچا کرو۔ بس! خوش رہا کرو۔“ پھر وہ بات بدلتے ہوئے مجھ سے کہتیں۔  
 ”آؤ... آج تمہیں بڑے بچوں سے ملواتی ہوں۔“  
 ”بڑے بچے؟“ میں گولگانداڑ میں بڑبڑا کر رہ جاتا۔  
 آپاجی مجھے باؤ نڈری وال کے .....  
 ... اندر ہی بنی ہوئی ایک دوسری بلڈنگ میں لے آئیں۔ یہاں پہنچ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہاں مجھے بوڑھے ضعف لوگ نظر آئے۔ کوئی کھانس رہا تھا، کسی نے اپنی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کوئی دھوپ سینک رہا تھا۔ کچھ کرسی پر بیٹھے کتاب یا اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔  
 ”آپاجی! یہ تو سب بڑے ہیں۔“ میں نے سوال کیا۔  
 ”ہاں! یہ بڑے ہیں مگر بوڑھے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“ وہ جوابا کہتیں۔  
 میرا معصوم ذہن ان بوڑھوں کو یہاں دیکھ کر بری طرح الجھ سا گیا۔ میں نے پوچھا۔  
 ”آپاجی! کیا ان کے بھی ماں باپ...“ میں اتنا ہی کہہ پایا۔ اور آپاجی ایک درد میں ڈوبی آواز میں بولیں۔  
 ”نہیں، یہ تو بے چارے خود کسی کے ماں باپ ہیں۔“  
 ”تو کیا ان کے بچوں نے انہیں گھر سے نکال دیا؟“  
 میرے فہم وادراک نے جوش مارا۔  
 ”ہاں۔“  
 ”اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔ یہ ہمیں گھر سے نکال کر یہاں چھوڑ جلتے ہیں۔ اب ان کے بچے بھی انہیں یہاں چھوڑ گئے۔ بہت اچھا کیا۔“  
 میرے اندر سے ایک خوابیدہ آتش فشاں کا غبار سا ابلتا۔ آپاجی مجھے ٹوکتیں۔  
 ”ایسا مت کہو... بیٹے! یہ بُری بات ہے۔“  
 ”یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ بچے بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“  
 دفعتاً عقب سے ایک کمزور آواز ابھری۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سفید بے داغ اور عام سے شلوار کرتے میں وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ رنگت سانولی، جسم کمزور، سر کے بال سفید اور اڑے اڑے سے تھے۔ بھوئیں اور مونچھیں بھی سفید تھیں۔ قد لمبا تھا۔ تاہم اس عمر میں بھی

رونے لگا۔ وہ مجھے پچکارنے.... پھر دیگر بچوں کے پاس لے آئی، میں گھبرا گیا۔ مگر یہاں بہلانے کی بہت چیزیں تھیں۔ کھلونے تھے، جھولے تھے۔ میں بچے ہی تو تھا، بہل گیا۔ یہاں بچوں کو بہلانے کے لیے سب کچھ تھا مگر ماں باپ نہیں تھے۔ ادارے کی ایک اور اچھی بات تھی جو بچے نیا نیا آتا یا لایا جاتا، آپاجی اسے چند دن اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتی تھیں تاکہ بچہ زیادہ اداسی محسوس نہ کرے اور جلدی بہل جائے۔ اب آپاجی ہی ہماری ماں تھیں۔  
 میں نیا بچہ تھا، اس لیے آپاجی مجھے اپنے قریب رکھتی تھیں۔ میں شروع میں تو چپ چاپ رہا پھر مختلف سوالات کرتا آپاجی کا سر کھانا شروع کر دیا۔ مگر آفرین ہے اس خاتون پر... ایک ذرا مل تک اپنی پیشانی پہ نہیں لائیں اور بڑی محبت، بڑے پیار سے میرے سارے سوالات کے جواب دیتیں۔  
 ایک دن میں نے پوچھا۔ ”آپاجی! کیا ہم اس طرح ساری عمر ادھر ہی رہیں گے؟“ وہ جوابا بولیں۔  
 ”جب تک اللہ چاہے گا تم سب یہاں ہنسی خوشی رہو گے۔“  
 ”ہمارے ماں باپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ ہم شرارتی ہوتے ہیں اس لیے؟“  
 ”ان کی کچھ مجبوریوں ہوتی ہیں اس لیے۔“  
 میں نے اپنی عمر اور معصومانہ فہم و فراست کے مطابق آپاجی سے کہا۔  
 ”آپاجی! بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں بلکہ شرارتی بچے تو اپنے اماں ابا کے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔“  
 آپاجی میرے سوال پر مسکرائیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ میں تھا بھی دوسرے بچوں سے مختلف، اپنی عادات و اطوار کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ فہم وادراک سے بھی... کئی بار میں ایسے بڑے بڑے پر مغز سوال داغ دیا کرتا تھا کہ ایک لمحے کو آپاجی بھی حیرت آمیز پریشانی میں مبتلا ہو جاتیں۔ مثلاً ایک دن میں نے کہہ دیا۔  
 ”آپاجی! مجھے پتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ انہیں بچوں سے زیادہ اپنی غرض اور اپنی خوشیاں عزیز ہوتی ہیں... ہیں نا... آپاجی؟“ میں معصومیت اور بھولپن سے ان کا چہرہ دیکھا۔ اور گریب کی ایک لکیر ان کے چہرے پر ابھرتی پھر فوراً ہی وہ ہمیشہ کی خلیم طبع مسکراہٹ سے کہتیں۔

عورت... جو بڑی سچ دہج کے ساتھ اور تکسک سے رہتی تھی، مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ پھر اس نے میری ماں کی جگہ کیوں لی؟ میری ماں کہاں گئی؟ پہلی بار دوسری عورت سے مار کھانے کے بعد میں نے باپ سے روتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”بتا کیوں نہیں دیتے رشید کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔“ اس عورت نے جل کر میرے باپ سے کہا۔ باپ جو شاید تنگ آ گیا تھا۔ ”ہاں... ہاں... تیری ماں مر گئی ہے۔“  
 میں مرنے کے مفہوم سے بھی نہ آشنا تھا۔ کسی عجیب بات ہے، بعض معنی اپنے آپ ہی... سمجھ میں آجاتے ہیں۔  
 میں بھی سمجھ گیا تھا۔ مجھے پیار کرنے والی، مجھے اپنے سینے سے لگانے والی ماں مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چلی ہے۔ میں وہ خلا اپنے باپ کی ذات سے بھرنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔ لیکن ماں تو پھر ماں تھی، تاہم ایسے میں مجھے باپ کا دم بھی غنیمت تھا۔ بس ایک مقام پر رک گئی۔ باپ مجھے لے کر نیچے اتر آیا۔ یہ عجیب سی جگہ، شہر سے دور... ہم ایک بانگ نما رکشے میں سوار ہوئے جسے آج کل چنگ چلی کہا جاتا ہے۔  
 وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی اس عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر اترے۔ یہاں اور بھی میری عمر کے بچے نظر آئے، باپ پوچھتا یا چھتا مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں ایک خاتون میز کرسی لگائے بیٹھی تھی۔ یہی ”آپاجی“ تھیں۔  
 انہوں نے ایک رجسٹر میں میرا نام درج کیا۔ پھر جب میرا باپ مجھے چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا...  
 ”ابا! مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ تم تو مجھے باہر گھمانے پھرانے کے لیے لائے تھے؟“  
 میں نے دیکھا، میری بات پر باپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ہولے سے میرا ہاتھ چھڑا کر بولا۔  
 ”اب تم ہمیں رہو گے، میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔“ پھر اس سے کھڑا نہیں رہا گیا۔ فوراً چلا گیا۔ میں رونے لگا۔ ابا... ابا... کہتا... اس کے پیچھے دوڑا۔  
 ”ابا۔ ماں تو مر گئی... تو تو زندہ ہے۔ پھر کیوں مجھے خود سے الگ کر رہا ہے؟“  
 وہ چلا گیا۔ آپاجی نے مجھے تمام لیا۔ میں بچکیوں سے

ہی قدمیں نظر آتے۔  
 ایک باقاعدہ نظم و ضبط یہاں پایا جاتا تھا۔ مہینے میں ایک بار ہمیں باہر بھی سیر و تفریح کی غرض سے لے جایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے کوئٹہ استعمال ہوتی تھی۔ ایک بڑے سے ہال میں ٹی وی بھی دکھانے کا بندوبست تھا۔ ہفتے میں ایک بار کوئی اچھی سبق آموز فلم دکھائی جاتی تھی۔  
 ان سب باتوں کے باوجود... دیگر بچوں کی طرح میرے ذہن میں بھی ایک اداس کردینے والا سوال ضرور ابھرتا تھا... کہ اولاد تو ماں باپ کی آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار ہوتی ہے، ان کا مان اور ان کا نخر ہوتی ہے تو پھر... پھر کیوں... وہ ہمیں زبردستی... ہماری مرضی کے خلاف ہمیں روتا دھوتا یہاں چھوڑ گئے تھے؟  
 میرا اپنا باپ بھی مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ جب میں اس کے ساتھ اس کی انگلی تھامے گھر سے خوشی خوشی نکلا تو میں بہت مسرور تھا کہ وہ مجھے باہر سیر و تفریح کی غرض سے لے کر نکلا ہے۔ ہم ایک بس میں بیٹھے اور پھر ایک طویل سفر شروع ہو گیا۔ ”ابا! ہم کدھر جا رہے ہیں؟“ بس میں ساتھ بیٹھے اپنے باپ سے میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی میرا معصوم سا ذہن ذرا چونکا۔ مجھے باپ کے چہرے پر درد کی آن گنت لکیریں سی گڈمڈ ہوتی دکھائی دیں۔ بہت کرب تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں خاموش رہا۔ پتا نہیں کیوں ابا آج مجھے کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ گھر میں ایک وہی تو تھا جو مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ مجھے کاندھے پر بٹھاتا۔ میرے لیے میٹھی گولیاں لاتا۔ شام گئے تھکا ہارا کام سے لوٹا مگر مجھے دیکھتے ہی اور میری ضد پر ذرا بھی سستائے بغیر مجھے باہر لے جاتا، چیزیں دلاتا، بیٹھے انڈوں کا پیکٹ میں ضرور لیتا تھا۔  
 بچپن کے دھندلے دھندلے شعور میں مجھے ایسی ہی پیار کرنے والی ایک اور شخصیت کا خاکہ بھی ابھرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی، بہت پیار کرتی تھی، مجھے ساتھ سلاتی تھی... میں اس کی چھاؤں میں بڑی ٹھنڈک اور سکون و آرام محسوس کرتا تھا... پر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک اس کی جگہ ایک دوسری عورت نے لے لی۔ یہ پہلی والی سیدھی سادی عورت سے بہت مختلف تھی۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا ناگوار ہوتا تھا، ایک معصوم بچہ... محبت و نفرت کی زبان خوب سمجھتا ہے۔ میں بھی سمجھ گیا۔ پہلے والی عورت مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی جسے میں ماں کہتا تھا۔ وہ

ان کی کمر سیدھی تھی۔

”ارے سرمد بابا..... کیسے ہیں آپ؟“ آپاجی انہیں دیکھ کر خوش دلی سے بولیں۔

”ٹھیک ہوں بیٹی۔“ سرمد بابا نامی وہ بوڑھا بولا مگر ہنوز ان کی گھنی سفید بھوڑوں سے ڈھلکی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

”بہت پیارا بچہ ہے اور سینٹر میں شاید نیا آیا ہے۔“ وہ نہایت شفقت اور پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

”جی ہاں۔“ آپاجی نے مختصر جواب دیا۔

”کیا نام ہے اس پیارے بچے کا؟“

”شہزاد احمد خان۔“ آپاجی نے میرا نام بتایا۔

”مگر ہم اسے شہزاد احمد خان عرف شہزی کہیں گے۔“ سرمد بابا نامی اس عمر رسیدہ شخص نے بڑے عجیب سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر کہا۔

جانے کیوں مجھے اس طرح اپنا نام دہرانے پر..... فخر سامحوس ہوا جیسے میں کوئی بڑا تیس مارخان ہوں۔

”یہ ہمارے ادارے کا سب سے پیارا، معصوم اور ذہین بچہ ہے بابا!“ آپاجی نے گویا فخر سے بتایا تو سرمد بابا بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

”بے شک اس کے چہرے اور آنکھوں سے ذہانت نکلتی ہے۔“

وہ دونوں میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے اپنی تعریفیں سننے میں مزہ آرہا تھا۔ بچوں کی نفسیات ہوتی ہے۔ گھر میں اس کے بارے میں اس کی موجودگی میں باتیں ہو رہی ہوں تو بچے کو بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔

آپاجی کے بعد مجھے اب سرمد بابا بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ انہوں نے تو باقاعدہ میری طرف دوستی کا بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس روز کے بعد سے میری ان سے بڑی پکی دوستی ہو گئی۔ میں روزان سے ملتا تھا۔

بوڑھے اور بچے کی۔ دوستی کا یہ امتزاج بہت عجیب اور انوکھا تھا۔

”باباجی! آپ کی عمر کتنی ہے؟“ اب میرے سوالوں کی توپ کارخ سرمد بابا کی طرف ہو گیا تھا۔

”پینسٹھ سال... مگر ہائے بڑھا پا... اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا ہوں۔ مگر یہ بات بھی نہیں، شاید دکھ نے میری طبیعتی عمر کے مقابلے میں میری جسمانی عمر بڑھا دی ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

”بابا! آپ کو کیا دکھ ہے؟“

”شہزی بیٹا... بسا اوقات بات دکھ کی بھی نہیں ہوتی، دکھ کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ کچھ دکھ وقت کے ساتھ بھلا دیے جاتے ہیں لیکن ہرے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ میرا اپنا جوان سگا بیٹا مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی دکھ نہیں کہ اس نے بڑی چالاکی سے میرا سارا روپا پیسا، میرا کاروبار اپنے نام کر دیا تھا۔ باپ ہوں نا۔ کوئی غیر میری دولت ہتھیالیتا تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا، اپنے بیٹے نے کیا نا... مجھے کوئی دکھ نہیں۔ یوں بھی میرا سب کچھ اسی کا ہی تھا۔“

”تو پھر آپ کو کس بات کا دکھ ہے بابا...؟“ مجھے ان کی عجیب و غریب باتوں میں مزہ آرہا تھا۔

”تم بھی جب تک بات کی تہ تک نہ پہنچو چکے نہیں بیٹے... سنو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”دکھ مجھے خود اپنے آپ پر ہے کہ میں نے بھی اپنے ماضی میں اپنے پیچھے بوڑھے باپ کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔“

”مگر سرمد بابا... مجھے میرا باپ اس عمر میں کیوں.... یہاں چھوڑ گیا؟ میں نے تو کچھ...“

”بیٹا! تقدیر کی طرف کاری اسی کو کہتے ہیں۔ یہ کبھی الٹی گنگا بہاتی ہے، کبھی سیدھی۔“ وہ بڑے گہرے لہجے میں بولے۔

”ہم سب اپنی اپنی لکھی ہوئی تقدیروں کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ہم سب ایک طرح کے مکافات عمل کی زد میں بھی رہتے ہیں۔ اچھائی کرنے والوں کو اچھا صلہ اور برائی کرنے والوں کو برا صلہ ملتا ہے... اور ضرور ملتا ہے۔“

مجھے سرمد بابا کی کچھ بات سمجھ میں آئی، کچھ نہیں۔ میں بولا۔

”تو بابا، میں نے کیا برائی کی تھی جو میرا اپنا باپ مجھے یہاں چھوڑ گیا؟“

”برائی تم نے نہیں کی... تم تو خود بھی بچے ہو... معصوم بچے... فرشتہ صفت... برائی تمہارے باپ نے کی جو اپنے تخت جگر کو خود سے جدا کر کے تمہیں جیتے جی یتیم کر ڈالا۔“

سرمد بابا... پہلے آدمی تھے جنہوں نے میرے باپ کو برا کہا تھا۔ ورنہ آپاجی میرے باپ کے اس عمل کو مجبوری کہہ کر نال دیا کرتی تھیں۔

کچھ روز گزرے، میرا باپ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ میرے لیے بہت ساری چیزیں لایا تھا، میں سب کچھ بھلا کر

باپ سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی مجھے خود سے لپٹالیا اور مجھے بہت پیار کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”بابا! اب مجھے یہاں سے لے جاؤ نا... اب میں شرارتیں نہیں کروں گا۔ نئی امی کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔ اب میں شریف بچہ بن گیا ہوں۔“

میں کہتا رہا۔ اپنے باپ کو کسی طرح مناتا رہا۔ اس کا چہرہ درد سے بھرتا رہا۔ وہ بولا۔

”میرے بچے! تم گندے کب تھے؟ تم تو اچھے بچے ہو مگر ابھی تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔“

وہ ایک بار پھر مجھے روتا دھوتا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں پھر اداس اور غمگین ہو گیا۔ باپ جب بھی آتا اور ایسے لوٹ جاتا تو میری یہی کیفیت ہو جاتی۔ مگر پھر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہل جاتا۔

میری شخصیت میں واضح طور پر تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب میرے باپ نے بھی رفتہ رفتہ آنا چھوڑ دیا۔ پہلے وہ ہفتے چند دن میں آ جایا کرتا تھا۔ پھر مہینے بھر بعد آنے لگا۔ پھر ایک سال گزرنے کے بعد... اور میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ میں باپ کو یاد کرتا رہا۔ باپ نے ساتھ چھوڑا تو ماں کی یاد آئی مگر ماں تو پہلے ہی مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

پھر اس کے بعد سے میری فطرت، میرا مزاج دیگر بچوں سے مختلف ہونے لگا۔ میں خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ آپاجی نے ہی نہیں، سرمد بابا نے بھی میری ان کیفیات کو محسوس کر لیا۔ آپاجی تو خیر شروع ہی سے میرے لیے مہربان خاتون تھیں۔ وہ مجھے دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ چاہتی تھیں۔ یہ قول ان کے میں اس ادارے کا سب سے پیارا اور معصوم صورت بچہ تھا۔ اور اب اداس اور خاموش طبیعت نے تو مجھے دیگر بچوں سے اور بھی مختلف بنا دیا تھا۔ اب آپاجی کے بہلانے سے بھی میرا دل نہیں بہلتا تھا۔

مگر سرمد بابا وہ واحد آدمی تھے جن سے کچھ نہ کچھ میری طبیعت بہل جاتی تھی دیگر بچے دوسری تفریحات میں اپنا دل بہلایا کرتے تھے، میں سرمد بابا کے پاس آ جاتا تھا۔ سرمد بابا سے میرے دل لگنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی شخصیت میرے احساس محرومی کا کسی حد تک مداوا کرتی تھی۔ ماں تو میری مرچنگی تھی مگر باپ زندہ ہوتے ہوئے بھی مر گیا تھا۔ مرے ہوئے پر صبر آ جاتا ہے مگر زندہ آدمی کا منہ موڑ لینا دل کو بہت تکلیف دیتا ہے۔

انہی دنوں دو نئے مزید بچوں کا اضافہ ہوا۔ وہ بھی

اوارہ گرد

تقریباً میرے ہم عمر ہی تھے۔ ایک کا نام اشرف معلوم ہوا، دوسرے کا بلال... ابتدا میں وہ بھی روئے، اداس ہوئے پر رفتہ رفتہ آپس میں مکمل مل گئے۔ میری ان سے دوستی ہو گئی۔ چند دنوں میں ہی بلال اور اشرف نے پر پڑے نکال لیے۔ وہ ادارے کے شرارتی بچوں کے طور پر مشہور ہونے لگے۔ آپاجی کا ناک میں دم کر دیتے۔ مگر ایسے بچوں کو سدھارنے کے لیے دو آدمی... رکھے ہوئے تھے جو بچوں کی عمر کے مطابق انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ چھوٹی موٹی سزا بھی دیتے۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کا اشتیاق ہوا۔ بلال نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے ماں باپ کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اسی لڑائی میں باپ اشتعال میں آ کر مجھے بھی پیٹنے لگا۔ ماں تڑپ جاتی اور باپ سے لڑنا بھول کر اسے سنبھالنے کو لپکتی، پھر باپ کا بھئی دتیرہ بن گیا۔ لڑائی ماں سے ہوتی، وہ مجھے مارنے لگتا۔ اس طرح وہ میری ماں کو بلیک میل کیا کرتا تھا۔ پھر تنگ آ کر ماں مجھے یہاں چھوڑ گئی۔ اشرف کی کہانی زیادہ لرزہ خیز اور ڈراؤنی تھی۔

اشرف کا تعلق بھی بہت ہی غریب گھر سے تھا۔ جہاں پہلے ہی اس کے بھائی بہن موجود تھے۔ اس نے اپنے بارے میں یہ لرزہ خیز انکشاف کیا کہ ایک روز باپ بارے میں گئے مزدوری کر کے گھر لوٹے۔ ماں کے ساتھ تو اکثر جھگڑا کرتے ہی تھے۔ غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ اس روزرات کو گھر پہنچے تو خلاف توقع میری ماں سے انہوں نے جھگڑا کیا، نہ بچوں کے ساتھ مار پیٹ کی، کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس کھوئے کھوئے سے رہے اور صحن میں پچھی چار پائی پر لیٹ گئے۔

میرے علاوہ دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی جو مجھ سے چھوٹے تھے۔ تین جھلنگا چار پائیوں میں ہم سوتے تھے۔ کسی آہٹ پر رات کے نصف پہر میری آنکھ کھلی تو میں بری طرح دل گیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذبح کی ہوئی لاشیں چار پائیوں پر پڑی دیکھیں اور باپ اس وقت مجھے قصائی کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا خون آلود چھرا تھا۔ میں لیٹے لیٹے چیخی ہوئی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ نہ ہونے لگا۔ باپ میری طرف بڑھنے لگا۔ اچانک میری ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میرے خونیں باپ نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ماں بھی کم صحت مند نہ تھی، اپنے جگر کے گلزوں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی پھری ہوئی شیرینی بن گئی۔ اس نے اپنی جان کی پروا کیے

گئے۔ عابدہ نے بھی خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ کتابی چہرہ، ستواں ناک، حسن دل آرا میں مصحوبیت کی آمیزش... بڑی بڑی کجراحی آنکھیں، بال گھنے اور ہلکے بھورے مائل، سرو قد اور متناسب جسامت۔

میں اگر اپنے ذلیل ڈول اور وجاہت کے لحاظ سے اپنے لڑکوں کے گروپ میں نمایاں تھا تو وہ بھی اپنی غیر معمولی خوبصورتی اور پُرکشش شخصیت کے باعث لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ یہ عجیب اتفاق کی ہی بات تھی کہ جس روز حاجی صاحب آئے تھے، اس روز ہماری گروپ بندی بھی کر دی گئی تھی جس کے مطابق ہم جوان لڑکوں کا گروپ کا مانیٹر مجھے بنایا گیا تھا جبکہ لڑکیوں کے گروپ کی پرفیکٹ عابدہ کو بنایا گیا تھا۔ وہ اپنی عمر کے سولہویں برس میں قدم رکھ چکی تھی۔

عابدہ تو میرے بچپن کی پسند تھی اور میں بھی اسے اتنا ہی پسند تھا۔ بلال اور اشرف میرے قریبی دوست تھے مگر ان دونوں کا مزاج مجھ سے مختلف تھا۔ بہر حال کوئی تو وجہ تھی جس کی وجہ سے ہم تینوں میں گاڑھی چھتی تھی۔

آپاجی ہی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ بہت جلد حاجی صاحب دوبارہ دورے کے لیے اطفال گھر آنے والے ہیں۔ اس بار ان کے دورے کی وجہ بہت اہم تھی۔ آپاجی کے اس اعلان کے بعد لڑکوں میں ہی نہیں، لڑکیوں میں بھی ایک بے چینی اور سنسنی پھیل گئی۔ ایک انواہ سی تھی جو گردش کرنے لگی تھی مثلاً اس بار حاجی صاحب... جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مستقبل اور اگلے ٹھکانے کا بندوبست کریں گے یا پھر انہیں "اطفال گھر" سے کسی طریقے سے بے دخل کر دیا جانے والا تھا وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے اب ہم "اطفال" نہیں رہے تھے۔

"یار! کجا بات ہے، میرا یہاں سے جانے کوئی نہیں چاہتا۔"

بلال نے کہا تو اشرف اس کی تائید میں بولا۔ "کہتا تو ٹھیک ہے، اب یہاں رہنے کی ہمیں عادت ہی ہو گئی ہے۔"

بلال ذبلا پتلا اور دبے ہوئے قد کا لڑکا تھا جبکہ اشرف نسبتاً لمبے قد کا اور میری طرح کسرتی بدن کا مالک تھا۔

"تو کیا کہتا ہے شہزی؟" اشرف نے مجھے ٹھوکا دیا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ دونوں ہر وقت دوسرے گروپ کی لڑکیوں ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے چاہتا۔

پچھی ہی در آنے لگیں۔ دل میں کچھ کرنے کی امنگیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ آٹھ سال کی عمر سے بارہویں سال میں قدم رکھنے کے بعد جب اٹھارہویں سال میں قدم رکھا تو... میں اپنی تبدیلی پر خود حیران تھا۔ وقت کی یہی تو طرفہ کاری ہوتی ہے، کہاں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت گزر رہی نہ رہا ہو... رکا ہوا ہو... اور پھر کھٹ سے گویا ایک زق قد بھرتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہو۔

☆☆☆

"اطفال گھر" نامی اس ادارے کے روح رواں ملک کے ایک معروف سماجی شخصیت حاجی محمد اسحاق تھے۔ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا۔ درمیانہ قد، باریش چہرہ، سادہ لباس... اپنی وضع قطع سے وہ پرہیزگار اور متقی انسان نظر آتے تھے۔

اس روز "بڑے بچوں" کی چھانٹی ہوئی تھی۔ ان میں "بڑی بچیاں" بھی شامل تھیں۔ ان کا باقاعدہ الگ رجسٹریار کیا جا رہا تھا۔ اور نئے سرے سے اندراج ہو رہا تھا اور یہ ساری کارروائی، حاجی محمد اسحاق کی موجودگی میں ہو رہی تھی اور ان کے آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

یہ ایک ہال کمر تھا۔ پہلے "بڑے بچوں" کو نمٹایا جا رہا تھا۔ ایک صوفے پر حاجی صاحب براجمان تھے۔ ان کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے خود بھی ایک ڈائری اپنی گود میں کھول رکھی تھی۔ ان کے بائیں ہاتھ پر بڑی ہی میز تھی۔

وہاں ایک پختہ عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا رجسٹر کھول رکھا تھا۔ یہ مشتاق صاحب تھے، حاجی صاحب کے سیکریٹری۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر آپاجی براجمان تھیں۔ انہوں نے بھی ایک ایسا ہی رجسٹر کھول رکھا تھا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون کے علاوہ دو اور افراد بھی تھے۔

ہر لڑکے کا باری باری نام پکار کے بلا لایا گیا۔ پھر ہال میں میرا نام پکارا گیا۔ میں آگے بڑھا۔ ایک شخص جو پینشن وغیرہ کر رہا تھا، میرے قریب آ گیا۔ وہ مجھے ایک قریب کی دیوار کی طرف لے گیا۔ پھر بہ آواز بلند میرا اندراج ہونے لگا۔

عام لڑکوں کے مقابلے میں میرا ذلیل ڈول غیر معمولی تھا۔

پھر مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

یہ عمل لگ بھگ صبح دس بجے شروع ہوا اور ایک بجے تک نمٹا لیا گیا۔ حاجی صاحب اپنی لمبی سی گاڑی میں چلے

"میں اپنے بیٹے حامد کو بھی کا کا ہی کہتا تھا۔ تم بھی اسے میرے لیے... میرے اپنے بیٹے کی طرح ہو... اس سے بڑھ کر..."

کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے۔ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ یونہی بھولپن اور مصحوبیت میں پوچھ لیا۔

"بابا! کیا آپ اب بھی اپنے بیٹے حامد سے یاد کرتے ہیں؟" وہ جواباً ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔

"ہاں بیٹا... بھلا ماں باپ اپنی اولاد سے نفرت کر سکتے ہیں؟"

"اس کے باوجود بھی بابا... کہ اس نے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا؟" میرے لہجے میں مصحوبانہ حیرت تھی۔

"ہاں کا! اس کے باوجود بھی..."

"آپ کو اپنا بیٹا یاد آتا ہے؟"

"ہاں مگر مجھے اپنے دو چھوٹے پوتا پوتی بہت یاد آتے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، بہت مانوس تھے مجھ سے... میرے بغیر تو وہ بھی اداس رہتے ہوں گے۔"

میں چپ ہو گیا۔ میں سرمد بابا کو زیادہ دیکھی ہوتا تھا۔ دیکھ سکتا تھا اس لیے انہیں کم ہی اس سلسلے میں کرید کرتا۔

☆☆☆

وقت کا کام چلتے رہتا ہے... رکنا نہیں، ورنہ پچھلے سے وقت ہی کیوں کہا جاتا۔ کوئی فلم تھی جو اپنی ابتدا سے انتہا کی طرف گامزن تھی۔ ایک دور تھا جو بیست رہا تھا ایک عہد تھا، جو اپنے ایفا کے سفر پر رواں دواں تھا۔ ایک زمانہ تھا جو گزر رہا تھا۔ "اطفال گھر" بھی وقت کے ان بدلے انداز و اطوار کی زد سے نہ بچ سکا۔

اطفال گھر کے بچے لڑکپن میں داخل ہونے لگے تھے۔ ان میں چند ایسے خوش نصیب بچے بھی تھے جنہیں یہاں میں ان کے ماں باپ یا وارث واپس لے جا چکے تھے بہت سوں کے تو مر بھی چکے تھے، یا لاپتا تھے۔ لاپتا ماں باپ میں میرا باپ بھی شامل تھا...

بات صرف وقت کی تبدیلی کی ہی نہ تھی بلکہ انسانوں کی تبدیلی کی بھی تھی۔ ہمارے اندر بھی تبدیلی آنے لگی زندگی کے محسوس کرنے والے سارے رنگ اب ایک سے ڈھنگ میں بدلنے لگے تھے۔ میری مسیں بھیگنے لگی تھیں محسوسات کو اظہار کی زبان ملنے لگی تھی۔ شعور میں لڑکپن کی

بغیر، چلا کر مجھے بھاگ جانے کو کہا۔ میں نے گھر سے نکلے ہوئے باپ کے یہ الفاظ سنے تھے جو وہ میری ماں کو قتل کرنے کے دوران کہہ رہا تھا۔ "تو حرافہ عورت، تیرا بھی یہی حشر کروں گا۔ کس کے بچے تھے... یہ... یہ میرے بچے نہیں تھے۔"

"پھر میری ماں کی گلی کے باہر تک ایسی چیخ سنائی دی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔"

اشرف یہ بتا کر چپ ہو گیا۔ ہمارے مصحوم ذہن تھے، ابھی ہمیں ان باتوں کا کیا پتا تھا۔

بلال اور اشرف یہاں بہت خوش تھے، میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔

"اطفال گھر" نامی اس ادارے میں صرف ہم بچے ہی نہیں تھے، بچیاں بھی تھیں۔ جب ہم تیرہ چودہ برس کی عمروں کو پہنچے تو ان بچیوں کا الگ پورشن بنا دیا گیا جس کی دیوار ہمارے پورشن کے ساتھ ہی ملتی تھی۔ بچپن میں ہی ساتھ کھیلے کودے تھے، ان سے بھی انسیت ہو گئی تھی۔ جب انہیں ہم سب سے الگ کر دیا گیا تو ہمارا اداس ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ میری بھی ایک بچی سے دوستی تھی، اس کا نام عابدہ تھا۔ اس کی کہانی پتا نہیں کیا تھی۔ مگر وہ مجھے اچھی لگتی تھی، اس نے مجھے اپنا نام عابدہ بتایا تھا۔

عابدہ، پتا نہیں کون تھی۔ آپاجی نے بتایا کہ اسے کسی نے اغوا کیا تھا... اور پھر کسی طرح یہاں پہنچی۔ (توت گویا ہی سے محرومی) عابدہ سے مجھے بہت گہری انسیت تھی، بچپن کے جذبات انسیت کے نام پر ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پورشن الگ ہونے کے باعث ہم اداس تو ہوئے تھے مگر یہ اداسی وقتی ثابت ہوئی تھی... کیونکہ ہم بہر حال رہتے تو ایک ہی جگہ پر تھے۔

ایک روز سرمد بابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ہر وقت اپنے وارڈ کے ایک کونے پر چار پائی پکڑ کر بیٹھ جاتے اور اپنا سینہ پکڑے کھانتے رہتے۔ میں نے آپاجی سے سرمد بابا کی حالت زار کا ذکر کیا۔ میری کچھ کوششوں سے وہاں ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ اپنے میڈیکل باکس سے ایک انجکشن نکال کر بھی انہیں بازو پر لگا یا پھر کچھ دوا میں تجویز کر کے چل دیے۔ دوا میں اگلے دن منگوئی گئیں۔ میں زیادہ تر وقت سرمد بابا کے ساتھ گزارنے لگا۔ ان کی حیا ر داری کرتا، ان کا خیال رکھتا۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہوئے۔ میری توجہ اور دیکھ بھال کے باعث وہ جلد ہی رو بہ صحت ہو گئے۔ وہ مجھے پیار سے کا کہنے لگے۔ بولے۔

تھے۔ تاہم عابدہ کے سلسلے میں محتاط رہتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ وہ میری پسند ہے۔

میں نے کہا۔ ”یار از زندگی عمل کا نام ہے۔ ہمیں اب اطفال گھر کے ”پنگوڑے“ سے نکلنا چاہیے۔ اپنے زور بازو پر کام کرنا چاہیے۔ مجھے اب یہاں مزہ نہیں آتا۔“

میری بات پر بلال بولا۔ ”اے باہر کی زندگی بڑی مشکل ہے۔ یہاں ہم مزے میں ہیں۔ فکر نہ فاقہ پیش کرے گا۔“

”صحیح۔“ اشرف بھی اپنے مخصوص لہجے میں اس کی تائید میں کہتا۔

”کھانا، پینا، نہانا، سونا، سب فری۔ چھوٹا موٹا کام کرنے پر خرچی بھی مل جاتی ہے۔ چونکہ ار کے ہاتھ میں چند نوٹ تھما کر باہر کی دنیا بھی گھوم آتے ہیں۔ بس، لڑکیوں کے معاملے میں ٹھوڑی سختی ہوتی ہے۔ ورنہ تو نعمانہ، شمرین اور نوشین بھی ہمارے ساتھ باہر جانے کو تیار ہیں۔“

”یار شہزی! تمہارا دل نہیں کرتا، عابدہ کے ساتھ باہر نکلنے کو؟“ اشرف آخر میں مجھ سے کہتا۔

”یہ بدحوہ ہے۔ کسی لڑکی کو باہر کیا لے کر جائے گا۔ خود تو پہلے باہر نکل کر دکھائے۔“ بلال نے مجھ پر طنز کیا تو میں نے کہا۔

”خاطر جمع رکھو۔ اب تمہارے یہ سارے مزے ختم ہونے والے ہیں۔ عنقریب حاجی صاحب ہمارے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اب ہم یہاں رہنے کے اہل نہیں رہے ہیں۔“

”اس کا حل بھی ہم نے سوچ رکھا ہے۔“ اشرف معنی خیز لہجے میں بلال کی طرف دیکھ کر ازدارانہ مسکراہٹ سے بولا۔ گویا، بلال بھی اس کا راز داں تھا مگر میں چونک گیا۔

”کیسا حل؟“

”اگر اس بڑھے کھڑوس نے ایسا کوئی فیصلہ کیا بھی تو ہم بائیکاٹ کر دیں گے۔ یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

بالآخر اشرف نے کہا۔ حاجی صاحب کے بارے میں ان کا یوں مذاق اڑانا مجھے سخت ناگوار گزرا تھا مگر انہیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چپ رہا۔

”اطفال گھر“ میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ملنے کی سختی سے ممانعت تھی مگر پھر بھی ہم تینوں چھپ چھپا کر یہ کام کر جاتے تھے۔ اشرف اور بلال کی تو کوئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن میں صرف عابدہ سے ہی ملتا تھا۔ اب وہی میرا سب کچھ تھی اور میں اس کا۔

اس معاملے پر وہ بھی کچھ متوحش اور فکر مند تھی۔ اس روز جب ہم کھڑکی کے راستے... چوری چھپے باتیں کر رہے تھے تو اس نے اپنے خدشے کا اظہار مجھ سے کیا۔

”شہزی! میں نے سنا ہے، ہمیں اب یہاں سے نکالا جانے والا ہے۔“

”سنا تو میں نے بھی یہی ہے لیکن... کم از کم لڑکیوں کے لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا رہا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تم۔“ اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی بے چینی اور تشویش میرے نام کی تھی۔ میں اس کی بے قراری اس کی آنکھوں سے بھانپ گیا تھا۔

”تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟“ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب ایک طمانیت کا احساس تھا۔ ہم ٹھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ سلاخوں والی کھڑکی کے راستے میں اس کے نرم نرم ہاتھوں کو سہلاتا رہا۔ پھر میں اپنے پورشن کی طرف لوٹ آیا۔

ان ماہ و سال نے سرد بابا سے بھی خراج وصول کیا تھا۔ وہ اور زیادہ ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے تاہم خود کو فٹ رکھنے کے لیے وہ روزانہ واک کرتے۔ اس سلسلے میں میں نے سرد بابا سے بھی ذکر کیا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق حاجی صاحب ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والے تھے؟ ظاہر ہے وہ بھی قیاس آرائی کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم لڑکوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر وغیرہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ تاکہ ہم عملی میدان میں بھی قدم رکھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے... ہمیں مختلف ٹولٹیوں میں بانٹ کر... مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں بھی کام پر لے جایا جاتا تھا۔ ہماری دولڑکوں کی ٹولی میں بلال شامل تھا جبکہ اشرف دوسری ٹولی میں تھا۔ وہاں سے ہمیں ڈپٹی وینچر کے طور پر کچھ پیسے مل جایا کرتے تھے۔ ہم ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔

اس روز ہم شام گئے واپس لوٹے۔ میں ہر روز عابدہ سے ہی نہیں سرد بابا سے بھی ضرور ملاقات کرتا تھا۔ اس شام عابدہ سے کھڑکی میں ملاقات کرنے کے بعد جب میں سرد بابا سے ملنے پہنچا تو ہمیں ایک چونکا دینے والی خبر ملی۔

آج صبح ہی کوئی خاتون، دو بچوں کے ساتھ اطفال گھر آئی تھیں اور سرد بابا کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

اوارہ گرد

بے چارے بوڑھوں کو زیادہ اپنی فکر ہو رہی تھی کہ پتا نہیں اب ان کا اس عمر میں کیا بننے والا تھا؟ جبکہ آپاچی کو بچوں کی فکر ستا رہی تھی اور جوان لڑکیوں کی بھی۔ جبکہ ہم نوجوان اس فکر و تشویش سے قدرے آزاد تھے کیونکہ اب ہم نے اپنے بچروں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا۔ تاہم ایک بے نام سا تجسس تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا؟

اس ادارے میں اب جو کچھ ہونے والا تھا، وہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ مکروہ، کریمہ اور بھیا تک تھا۔

حاجی صاحب کی موت کے بعد سب کچھ ایک دم ہی بدلا تھا۔ اطفال گھر کی چونکہ ایک الگ دنیا تھی، بہت آرام دہ اور پرسکون جگہ... جیسے یہاں کسی مہربان اور رحم دل بادشاہ کی حکمرانی ہو۔ مگر اب جیسے کوئی سخت گیر حکمران نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ بہت واضح تبدیلی دیکھنے میں آنے لگی۔ جیسے کوئی ہماری اس پرسکون، آرام دہ اور پُر امن دنیا پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہ رہا ہو اور جلد سے جلد اپنا تسلط جمانے کی کوشش و جستجو میں ہو۔

سب سے پہلے عملے کے وہ لوگ رفتہ رفتہ تہہ میل کیے گئے... یہ الفاظ دیگر نکالے جانے لگے... جو عرصے سے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کی جگہ عجیب و غریب صورت افراد نے لے لی تھی، چند عورتیں بھی تھیں جو انہی مردوں کی طرح خزانہ صورت تھیں۔ آپاچی تو اس طرح غائب کر دی گئیں کہ جیسے بھی اطفال گھر میں بھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ حالانکہ وہ سب بچوں کی ”مان“ کہلاتی تھیں اور ہم سب بھی گویا ان کی گود میں کھیل کر جوان ہوئے تھے۔

ایک خوف کی فضا تھی جو اس ادارے پر دھیرے دھیرے طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر کوئی جیسے اپنے ارد گرد کے ماحول سے ڈرا ڈرا اور سہا سہا ہوا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا تھا۔

بالخصوص جوان لڑکیوں کا گروپ زیادہ متوحش اور سراپیمہ تھا۔ وہ ہم سے زیادہ خوف اور تشویش آمیز بے چینی کا شکار تھیں۔ بالخصوص عابدہ... مگر اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں جبکہ خود میری اپنی دل و دماغ کی کیفیات اگرچہ ان سب سے مختلف نہ تھیں لیکن میرے دل و دماغ میں خوف کی جگہ پریشانی اور فکر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب یہاں کچھ غلط ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ عملے کے نام پر جو افراد یہاں متعین کر رکھے تھے، وہ ہمیں ہمدردی کی نگاہ سے کم تھائی کی نظر سے زیادہ دیکھا کرتے تھے۔ ان کی صورتیں بھی ایسی



انسان کے دل ہی میں نہیں سوچ اور ذہن میں بھی ایک طرح کی نزاکت ہوتی ہے۔ انسان کو سماجی درندہ ایسے ہی نہیں کہا گیا۔ یہ اپنے جیسے انسانوں میں مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ اطفال گھر میں بھی ہم سب مل جل کر رہتے آئے تھے۔ کئی لوگوں سے پرانی انسیت بھی ہو گئی تھی۔ کوئی اچانک ساتھ چھوڑ دیتا تو دکھ سا ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ سرد بابا کے یوں اچانک چلے جانے سے میں بھی اداس تھا۔ عابدہ بھی اداس تھی۔

حالات اشارہ کر رہے تھے کہ اطفال گھر کے حالات بدلنے والے تھے... اس کا اندازہ اس جانکاہ خبر کے بعد ہوا۔

جن دنوں حاجی صاحب نے اطفال گھر کا دوبارہ دورہ کرنا تھا اور بڑے بچوں اور بڑی بچیوں سے متعلق حتمی فیصلہ آتا تھا، اس کے ایک روز قبل ان کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔

پھر تو جیسے پورے اطفال گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ کیا بوڑھے، کیا بچے کیا جوان... حتیٰ کہ ادارے کے عملے کے افراد بھی حاجی صاحب کی اچانک موت پر پریشان اور تشویش زدہ ہو گئے۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو ہر ایک کے حلق میں گویا آنکڑے کی طرح انک کر رہا تھا کہ... اب کیا ہوگا؟ اب اس ادارے کا والی وارث کون ہوگا؟ اور اب جو ہوگا، وہ کون ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ وغیرہ۔ کیونکہ حاجی صاحب کی زندگی میں ہر کوئی بہت خوش اور آرام و سکون سے تھا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم ڈائری، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

فروشوں کا اڈا بن چکا تھا۔ ہم سے بیگا رہا جانے لگا۔ ہمیں صبح سویرے ایک بند کنٹینر والے ٹرک سے کسی نامعلوم مقام پر لے جایا جاتا، وہاں پتھر کوٹنے کا سخت کام لیا جاتا تو کہیں اینٹوں کے بھٹے پر سخت کوشی کروائی جاتی۔ میں تو خیر ان سختیوں کو جھیل ہی رہا تھا مگر بلال اور اشرف کی حالت زیادہ پتلی ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ دونوں آرام طلب تھے۔ یہ سختیاں جھیلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بھی انکشاف سننے میں آیا کہ چھوٹے معصوم بچوں سے بھیک منگوانے کا بھی کام لیا جاتا تھا۔

انہی دنوں میں نے بلال اور اشرف کو ساتھ ملایا۔۔۔ کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونا چاہیے۔ اس کی ہم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ میرا ارادہ سب کو یہاں سے آزاد کروانے کا تھا مگر اشرف اور بلال نے اختلاف کیا کہ یہ ابھی مشکل ہوگا۔ لہذا فی الحال پہلے خود آسانی کے ساتھ اس جہنم سے فرار ہوا جائے، اس کے بعد۔۔۔ باہر نکل کر پولیس سے مدد لی جاسکتی تھی۔ اس کی بات میں وزن تھا، میں نے اختلاف نہیں کیا۔۔۔ مگر۔۔۔ میں عابدہ کو ان بھیڑیا صفت لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ لہذا میں نے بلال اور اشرف سے اس بارے میں صاف صاف کہہ دیا۔ وہ کچھ سوچ کر راضی ہو گئے۔

گو یا جان جو سہم میں ڈال کر ایک دن چوری چھپے میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف ملاقات کر ہی لی اور اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ ساتھ ہی اس نے بھی کئی لرزہ خیز انکشافات کرے ہوئے مجھے یہ بتا کر جان لیوا تشویش میں مبتلا کر ڈالا کہ۔۔۔ یہ بدکردار لوگ ان پر بھی بڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چند جوان لڑکیوں کو جانے کدھر غائب بھی کر چکے ہیں۔ شنیدھی کہ پہلے ان معصوم لڑکیوں کو انہوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، اس کے بعد کہیں فروخت کر ڈیا تھا۔

عابدہ کی زبانی یہ سب سننے کے بعد میں نے اسے لے کر یہاں سے فرار ہونے کا پختہ عزم کر لیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ چاہے جان چلی جائے اپنے ارادے سے ہرگز نہیں آؤں گا۔

”شہزی! مجھے اب یہاں بہت ڈر لگنے لگا ہے۔ سب بتانے کے بعد عابدہ خوف سے لرزتے لہجے میں یوں کھڑکی کی ٹھنڈی ٹھار سلاخوں سے اس نے اپنا۔۔۔ مر مر

تھیں کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ سب کے سب بٹے کئے مشنڈے اور چھٹے ہوئے بد معاش نظر آتے تھے۔ یہی نہیں ہمیں تو ان کے پاس اسلحے کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔ آباچی کی جگہ جو عورت آئی تھی، وہ شکل و صورت سے انہی کے قبیل کی نظر آتی تھی، نہایت کالی موٹی اور بھدی، مگر یہاں کا سارا نظام بہ الفاظ دیگر۔۔۔ نگرانی۔۔۔ ایک ٹیم ٹیم اور سیاہ رنگت کے حامل شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان سب کا سرغنہ تھا۔ بعد میں ہمیں اس کا نام مع عرفیت کے معلوم ہوا جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھا، دلشاد خان عرف استاد گنگل۔۔۔ وہ ہمیں ایسی نظروں سے گھور کے دیکھا کرتا تھا جیسے ہمیں نظروں ہی نظروں میں تول رہا ہو۔

ہمیں اب کام پر بھی نہیں بھیجا جاتا۔ نہ ہی باہر لے جایا جاتا۔ گیٹ اور چہار دیواری کے اوپر خاردار باڑھ نصب کر دی گئی تھی۔ پہرے پر انہی کے بد معاش صورت آدمی رہا کرتے تھے۔ نی وی، بڑھنا لکھنا، کتابیں اور ایسی دیگر مہربان چیزیں عنقا کی چاکلی تھیں۔ بوڑھوں کو تو ابتدائی چند دنوں میں ہی نکال باہر کیا گیا تھا۔ البتہ بچے اور ہم لڑکے لڑکیاں اپنی تعداد میں موجود تھے۔

مجھے دال میں کالنا نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ اطفال گھر۔۔۔ اب اطفال گھر نہ رہا تھا گو یا ایک جیل خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ یا پھر اوباش اور گینگسٹر لوگوں کا اڈا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر عابدہ کی۔۔۔ ہونے لگی۔ اس صورت حال سے وہ بہت زیادہ خوف زدہ اور متوحش تھی۔ ایک دن میں نے یونہی گیٹ سے باہر نکلنا چاہا تو وہاں متعین ایک خزانہ صورت پہرے دار نے مجھے خونخوار لہجے میں جھڑک دیا اور تنبیہ بھی کر ڈالی کہ میں دوبارہ ان کی اجازت کے بغیر گیٹ سے باہر تو کجا گیٹ کے قریب بھی آنے کی جرأت نہ کروں۔

اب میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ہمیں ہال کمرے میں ہر وقت بند کر کے رکھا جانے لگا تھا، گو یا ہم قیدی ہوں۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا مگر کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک روز میں نے سب لڑکیوں کے پورٹن کا چوری چھپے رخ کیا تو عین اس وقت جب میں پورٹن کی دیوار والی مطلوبہ کھڑکی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ میری کمر پر جا بک پڑا۔ میں درد اور اذیت سے بلبلا کر رہ گیا۔ ایک سرخ لکیر میری جو میری پیٹھ پر نمودار ہو گئی تھی، جس کی جلن میں کئی دنوں تک سہتا رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ اطفال گھر اب بردہ



میدان کے صحیح معنوں میں کھلاڑی تھے، اور مجھے ان سے اختلاف بھلا کر کے ان سے کچھ سیکھنا چاہیے تھا۔  
 تھوڑی دیر بعد ہی اشرف لوٹ آیا اور میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔  
 ”چلو، نکلو باہر... اب تمہاری باری ہے۔ جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرنا ہے۔ چلو اٹھو۔“ ان کی کارکردگی دیکھ کر میرے اندر جوش و جذبہ جاگا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ کھڑکی کے راستے باہر نکلا، اور پتلی گلی کی دیوار سے چپکا چپکا لڑکیوں والے پورشن کی طرف بڑھا۔ اشرف کی ہدایت کے مطابق دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں پہرے دار نہ تھا، شاید وہ منگشت کرتا ہوا تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھیوں کے پاس جا چکا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی بند تھی۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے چھوا تو حیران رہ گیا۔ وہ ڈھیلی تھیں، بس اکھڑنے کی دیر تھی۔ اشرف کی بتائی ہوئی ساری باتیں درست ثابت ہو رہی تھیں۔ اس نے بڑی چابک دستی، ہوشیاری اور مہارت سے ان سلاخوں کو بھی ہلا جلا کر ڈھیلا کر دیا تھا۔ دروازے پر میں نے ہلکے سے دستک دی۔ سب اشرف کے ..... طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا عابدہ کا چہرہ نمودار ہوا۔  
 ”میں سلاخیں اکھڑ رہا ہوں، تم باہر نکلنے کو تیار ہو؟“ میں نے عابدہ کا چہرہ دیکھتے ہی سرگوشی کی۔ وہ کچھ تڑپ سی تھی۔ بس اثبات میں سر ہی ہلا سکی۔ میں نے بہ آہستگی مگر بڑے آرام سے چار پانچ سلاخیں نکال دیں۔ ہال میں خاموشی تھی، شاید باقی لڑکیاں گہری نیند میں تھیں۔ دفعتاً مجھے عابدہ کے عقب میں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ اسے کیا... بلکہ میں تو ہال کی ساری لڑکیوں کو ہی پہچانتا تھا مگر جانتا تھا صرف عابدہ کو ہی تھا۔ مگر اس وقت عابدہ کے ساتھ میں کسی شناسا لڑکی کا چہرہ دیکھنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے بری طرح چونک پڑا... اور سرگوشی سے عابدہ سے بولا۔ ”یہ کیا؟“ میرے اس مختصر سے استفسار نما جملے میں تہیہ بھی تھی۔  
 ”یہ... یہ... میری عزیز اور قریبی سہیلی شکیلہ ہے۔“  
 ”لیکن میں اس وقت اسے بھی... میرا مطلب ہے...“ مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔ وقت کم تھا... عابدہ نے پتا نہیں کیوں یہ حرکت کر ڈالی تھی۔  
 ”تم غلط سمجھے ہو شہزی!“ عابدہ میرا اضطراب بھانپ

سکتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اس بدلتے ماحول سے خوش تھے۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا... جب دونوں نے تصانی صورت پہرے داروں اور بالخصوص استاد گنگل کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش چاہی تھی۔ بلال اور اشرف نے ان کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کے ساتھ ان کا بندہ بے دام یا واضح الفاظ میں ان کا ”کارپرداز“ بننے کا اشارہ دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ ضمیر فریاد اور اپنی عزت نفس، اپنی آزادی کو ایک جابر اور مطلق العنان آدمی کے پاس گروی رکھنے کے مترادف تھا۔  
 یہ محسوس کر کے مجھے ان دونوں سے نفرت سی ہونے لگی تھی مگر میں نے ابھی اس کا دونوں کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔ ممکن تھا کہ میں غلطی پر ہوں مگر جب ان دونوں نے ایک روز اچانک فرار کے منصوبے پر میری رائے لیہنا چاہی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بے شک ایسا منصوبہ تو میرے دل و دماغ میں بھی پل رہا تھا لیکن... جب بلال اور اشرف نے پہل کی تھی، تو میں اس پر سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ اور ان دونوں کے بارے میں مجھے اپنے تجربے کی نفی کرنا پڑی تھی۔  
 بہر طور... رات کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا... اوائل سہرا کی سرد راتیں تھیں اور شام میں ہی رات کا گماں ہوتا تھا۔ تاہم رات کے ایک مقررہ پہرے... جب اطفال گھر کے درو دیوار پر ٹھہرتے سنائے اترنے لگے اور ہال کمرے کی بیتیاں بجا دی گئیں تو منصوبے کے مطابق سب سے پہلے اشرف حرکت میں آیا۔ دیگر بستروں پر ہماری عمروں کے لڑکے گہری نیند میں مستغرق تھے۔ اشرف دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر کی سن گن لی پھر سیدھے ہاتھ کی دیوار کی جانب سرک گیا۔ میں اور بلال اپنے کونے والے بستروں پر دیکھے اس کی حرکات و سکنات کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب گیا جہاں آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ اور بلال چند روز پہلے ہی سے اس پر زور آزمائی کر چکے تھے اور اب صرف انہیں اپنی جگہ سے اکھڑنے کی دیر تھی۔ اشرف یہ کام نمٹا کر کھڑکی کے راستے دوسری طرف کود گیا۔ ہال میں مدھم روشنی تھی۔ میرے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے اور میں بڑی حیرت اور تشویش کے طے چلے تاثرات کے ساتھ اشرف کی یہ مہم جوئی دیکھ رہا تھا، جبکہ بلال کے چہرے پر ایسے تاثرات علقا تھے، جس پر مجھے حیرت تھی۔ وہ شاید مطمئن تھا، مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ بلال اور اشرف عملی

ہوگا؟“  
 ”ہاں یار! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے چبھتی... مسکراہٹ سے تائیداً کہا۔ وہ پھر عجیب سے انداز میں ہنسا مگر بولا کچھ نہیں۔  
 ”مگر میں نے اس کی تسلی کروادی ہے۔“ پھر توشیحی طلب انداز میں باری باری بلال اور اشرف کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 ”یار... تم دونوں کو کیا لگتا ہے؟ ہم چاروں پر آسانی آج رات نکل جائیں گے یا یہاں سے؟“  
 ”ہمارا منصوبہ بے داغ ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟“ بلال نے بے لاروائی سے کہا۔  
 ”صرف تالے کھولنے کی بات ہے۔ وہ میرے ذمے، بس تم اور عابدہ وقت کا خیال رکھنا۔ ایک منٹ بھی ضائع مت کرنا۔ تمہیں معلوم ہے نا... کیا کرنا ہے تمہیں؟“  
 ”بالکل یاد ہے۔“ میں نے جوش سے کہا۔  
 مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ رات کے ایک مقررہ پہرے... لڑکیوں کے پورشن کی طرف جا کر عابدہ کو نکالنا تھا۔ یہ قول اشرف کہ وہ اس سے ذرا دیر قبل اس طرف جا کر لاک کھول دے گا۔ پھر بلال سے جا ملے گا جو عمارت کی چار دیواری کے جنوبی سمت والے اس دروازے پر زور آزمائی کرنا چاہتا تھا جہاں سے روزانہ کچرا اٹھانے والی ٹریکٹر شراں اندر داخل ہوتی تھی۔ وہاں صرف ایک پہرے دار تھا جو گا بے گت کے دوران بیڑی یا پٹھر پینے کے لیے ذرا فاصلے پر بنی ایک کوٹھی کا رخ کرتا تھا۔ وہاں تین مزید پہرے داروں کی رہائش تھی۔ یہی وہ صورت ہوگا، جب بلال یا اشرف، دروازے پر زور آزمائی کا ارادہ رکھتے تھے۔  
 ”فرار“ کا یہ منصوبہ خالصتاً بلال اور اشرف کا ترتیب کردہ تھا۔ مجھے صرف اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے سے غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی بات پر ان سے متفق ہوا تھا۔ ورنہ تو میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ میری ان دونوں سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نہ صرف سوچ بلکہ مزاج اور فطرت کے حوالے سے وہ دونوں ایک تھے اور ایک فطرت بھی۔ جب سے اطفال گھر کے ”حالات“ تبدیل ہوئے تھے، میں نے محسوس کیا تھا، کہ اس ماحول سے بلال اور اشرف کے مزاج اور اطوار میں کچھ ایسی تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ جسے میں بہ آسانی کسی حمایت یا تائید سے تشبیہ

ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ کی کپکپاہٹ نے مجھے میرے وجود تک کولرزہ بر اندام کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ وقت کم تھا۔ تصانی صورت کوئی پہرے دار ہمیں کھڑکی سے یوں باتیں کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔  
 ”عابدہ! تم حوصلہ رکھو، اب تم ہی میری ہمت اور میرا عزم ہو جس کے بل بوتے پر آج رات ہی میں نے تمہارے ساتھ اس جہنم سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔“  
 میری بات پر اس کی کاجل آنکھوں میں سستی ہوئی۔ سراسیمگی قدرے ماند پڑی۔ وہ بولی۔ ”کیا واقعی... تم سچ کہہ رہے ہو شہزی؟“ لیکن... یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟ یہاں اب ان خوفناک صورت والے سفاک پہرے داروں نے تو ایک دوسرے سے بات تک کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔“ اس کے لہجے میں غیر یقینی درآئی۔ میں نے ازراہ نشئی کہا۔  
 ”مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔ یہاں تک بھی آن پہنچا ہوں تو یہ بھی ہماری منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔“  
 ”ہم کون... کیا اور بھی...؟“  
 ”ہاں! بلال اور اشرف بھی میرے ساتھ ہیں۔“  
 ”مگر ہمارے ہال کمرے کا دروازہ تو لاک ہوتا ہے؟“  
 ”یہ کام اشرف بہ آسانی کر لے گا۔ اسے بند تالے کھولنے کا ہنر آتا ہے۔“  
 ”کیا؟“ چہلی بار عابدہ کے چہرے پر خوشی امید بن کر چمکی تھی۔  
 ”بس! اب میں چلتا ہوں... ابھی کسی سے اندر ذکر مت کرنا۔ ایک بار باہر نکل جائیں تو یہاں پھنسے ہوئے سب لوگوں کو آزاد کروالیں گے۔“  
 میں نے کہا اور پھر اس کا نازک ہاتھ تھپتھا کر اپنے پورشن میں آ گیا۔  
 ہم تینوں ہال کے ایک کونے میں اپنے بستروں پہ بیٹھے تھے۔  
 ”تسلی کرو آئے ہو عابدہ کی۔“ بلال نے پوچھا۔  
 میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 اشرف عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”بے چاری عابدہ! میرا خیال ہے، اسے تمہاری مہم جوئی کا یقین نہیں آ رہا



اس کے جڑے پر رکھ دی۔  
”خبردار جو آئندہ میں تم دونوں کو کھسر پھر کرتے دیکھوں۔“

پھر وہ میری جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بڑھا۔ میں اپنے بستر کے قریب خاموش کھڑا ہو کر اس کے چہرے کی طرف نکلنے لگا۔

وہ وحیاً نہ نظروں سے مجھے چند ثانیے گھورتا رہا۔ پھر بہ غور میرا نیچے سے اوپر تک جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ”بڑا دھاکڑ جوان ہے رے تو... اتنی مار پڑنے کے باوجود اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔“ میں کچھ نہیں بولا اور منتظر رہا کہ وہ مزید مجھ سے کیا کہنے والا ہے۔

”اب دوبارہ تو ذلیل حرکت نہیں کرے گا... نا؟“

مجھے اس بار اس کے لہجے میں نرمی کا احساس ہوا۔ میں تب بھی چپ رہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تجھے یہاں کیا تکلیف ہے؟ تیسرا پورا بچپن یہاں گزرا ہے۔ پھر... کیوں یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے؟“ وہ خمیشت کسی مقصد کے لیے شاید دھیرے دھیرے اپنی کینچی بدل رہا تھا۔

بوڑھے سرد بابا کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ان سے عقل و سوجھ بوجھ اور دنیا داری کی کبھی بہت سی باتیں سیکھی تھیں۔ وہ اب وقت کے ساتھ ساتھ... ”ایکپرسیس“ ہو رہی تھیں۔ گنگل خان کے اس طرح کینچی بدلنے پر میں پہلے حیران ہوا تھا۔

”دیکھو شہزی! تم دوسرے کا کون (لڑکوں) کے مقابلے میں مجھے زیادہ جی دار، صحت مند اور قد آور جوان لگتے ہو اور سخت جان بھی... تمہاری یہ خوبیاں مجھے پسند آئی ہیں لیکن... یہاں سے جانے یا نکلنے کا خیال... دل سے نکال دو۔“

”کیا ہمیں ساری عمر قیدی بنا کر یہاں رکھا جائے گا اور... بیچارہ لی جاتی رہے گی ہم سے؟“ بالآخر ہمت کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں پہلی بار آج آئے سامنے گنگل خان سے مخاطب ہو کر بولا تھا۔ گویا اس کے سامنے اڑنے کی ایک خم ٹھونک دی تھی میں نے۔

”ساتھی بن کر بھی رہ سکتے ہو... جیسے تمہارے وہ دونوں ساتھی...“ وہ رواروی میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”بلال اور اشرف کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر کہہ دیا۔

”ہاں۔“ اس کا جواب اثبات میں پا کر میرے پورے وجود میں اشرف اور بلال کے لیے نفرت کی ایک لہر

اشرف اور بلال تو تمہارے قریبی دوست تھے تم ان کی فطرت و اطوار کو نہ سمجھ پائے؟“

”میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے جسم کو ورزشی انداز میں تروڑ مروڑ کر وارم اپ کرنے لگا۔ وجود میں ابھی تک ٹیسس اٹھ رہی تھیں مگر اب قابل برداشت تھیں۔ زخم بھی قدرے بھر گئے تھے۔ میں نے شوکت حسین کا شکر یہ ادا کیا اور بولا۔ ”دوست! تم نے مجھ پر بلاشبہ احسان کیا... اور میں نے اپنی کم عقلی کے باعث تم پر شہرہ... رہی بات بلال اور اشرف کی تو میں ان کی فطرت وغیرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں... مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایسی غداری کے مرتکب کیونکر ہو سکتے ہیں لیکن ابھی میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے عابدہ کی فکر لاحق ہو رہی ہے۔ تم عابدہ کے بارے میں کچھ جانتے ہو... کہ وہ کس حال میں ہے؟“

میری بات پر شوکت... مسکرایا... پھر بولا۔ ”اشرف اور بلال کے بارے میں سمجھیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان دونوں کے مکروہ چہرے ہم سب کے سامنے بے نقاب ہو چکے ہیں۔ رہی بات عابدہ کی تو شکلیہ کے مطابق وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

مجھے عابدہ سے متعلق اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا۔ کیونکہ گنگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے خیر کی کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ میرے چہرے پر ابھمن کے تاثرات بھانپ کر شوکت بولا۔ ”عابدہ کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا... مگر دوست! اصل بات تشویش و فکر کی اور ہے، جو شکلیہ نے مجھے بتائی ہے...“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہال کمرے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ ہم دونوں چونک کر دروازے کی طرف نکلنے لگے۔ پھر گنگل خان اور اس کے دو حواریوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شوکت حسین فوراً میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکائے اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

”کیوں بے لہڈے! اب تیری باری ہے۔“ راستے ہی میں گنگل خان نے اس کی گردن پر ہاتھ جمادیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا پھر اسے لات رسید کر دی۔ شوکت ہال کے پختہ فرش پر جا گرا... لوہے کے بیڈ کا کونا اس کی پیشانی سے ٹکرایا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ گنگل خان نے ایک اور لات اسے رسید کر دی۔ اور اسے فرش پر چست لٹا کر اپنے پاؤں کے موٹے سول والے بوٹ کی ایڑی

ہوائے فریڈ تھا۔ اور اس روز رات کو عابدہ نے مجھے شکلیہ اور شوکت حسین کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ راز دونوں کی مخبری کے باعث افشاں ہوا ہوگا۔

اطفال گھر کی چار دیواری میں محدود زندگی گزارنے والے آدمی کی عقل بھی اس حد تک کام کر سکتی تھی کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے شوکت حسین اور شکلیہ کو اس کا قصور وار ٹھہرا دیا۔ حالانکہ سوچتا تو یہ بات میری سمجھ میں آسکتی تھی کہ انہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم سب تو ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور پھر میرے اور عابدہ وغیرہ کے فرار سے خود ان کے لیے بھی تو فائدہ تھا۔ پھر ان تین دنوں میں شوکت حسین ہی تھا جس نے میرا خیال رکھا اور اب میری حالت قدرے بہتر تھی۔ فطری طور پر ایک غلط فہمی دل میں گھر کرتی ہے، لیکن میں زود فہم بھی تھا، عقل سلیم بھی استعمال کرنا آتی تھی۔ جب میں نے شوکت حسین سے اپنی نفرت کا اظہار کرنا چاہا تو وہ ناراض ہونے کے بجائے مسکرا دیا۔ بہ دستور میرے ساتھ دوستانہ لب و لہجہ اپنائے رکھتے ہوئے بولا۔ ”شہزی! مجھے غلط مت سمجھو۔ شکلیہ نے مجھے پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ میں چاہتا تو خود بھی تمہارے فرار کا منصوبے میں شمولیت اختیار کر لیتا۔ شکلیہ کا مجھ پر یہی دباؤ تھا مگر میں نے ایسا دانت نہیں کیا تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے اسے نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ اگر اس منصوبے میں صرف تم اور عابدہ ہوتے تو یقیناً میں اور شکلیہ تمہارے ساتھ شامل ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے... مگر تمہارے ساتھ... بلال اور اشرف کو دیکھ کر میں نے مصلحتاً چپ سا دھ رکھی تھی اور پھر میرا شک درست ثابت ہوا۔“

بلال اور اشرف کے ذکر پر میں نے ان کے متعلق سوچنا چاہا۔ ”ان دونوں پر تمہیں کس بات کا شبہ تھا؟“

”پہلے یہ سوچ پی لو دوست! بڑی مشکل سے تمہارے لیے جن سے چرا کر لایا ہوں...“ شوکت حسین نے مسکرا کر کہا اور ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اپنے اندر طاقت کی بحالی کا احساس ہوا۔

میں نے شوکت... کی باتوں پر غور کیا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ اس کی باتوں میں مجھے وزن محسوس ہوا تھا۔

میرے سوال دہرانے پر اس نے ایک نظر ہال پر ڈالی۔ ہال میں ہم دو ہی تھے، بولا۔ ”کمال ہے دوست!

خان نے اپنے ان دونوں مذکورہ حواریوں کو اشارہ کیا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح دونوں حرکت میں آ گئے۔ کمرے میں جوجا لالہ بکھرا ہوا تھا، اس سے کچھ خوفناکی کا تاثر ابھرتا تھا۔ اب پتا چلا تھا کہ یہ کمرہ کس لیے استعمال ہوتا تھا۔ میرے منہ پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہاتھ پاؤں بھی ریشمی ڈور سے باندھ دیے گئے۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو اس کے جواب میں مجھ پر تار بڑ توڑ گھونسوں کی بارش کر کے نڈھال کر دیا گیا۔ ساری رات مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر اعلیٰ الصباح مجھے میدان میں لکڑی کا عارضی آٹھ فٹ لمبا چوکھٹا بنا کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ اس پر بھی بس نہ ہوا تو مجھ پر ایک حواری نے ہنزوں کی بارش کر دی۔ میں پہلے ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا، اب یہ ایک نئی اذیت تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی ماؤف تھے۔ مجھے پہلے رات گئے تک اتنی سخت اذیتوں اور تشدد سے گزارا گیا تھا کہ اب پورا جسم ہی سن ہو کر بے حس ہو گیا تھا۔ اب کسی نئی اذیت یا تکلیف کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

گنگل خان نے اس طرح گویا میری حالت زار کو اور مجھے نشان عبرت بنا کر دیگر لڑکوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ اس ہال کمرے میں پھینک دیا گیا۔ زخم جب تک گرم رہے۔ اتنی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو شدید ٹیسوں کی صورت میں جاگنے لگتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا۔ جسم میں خون کی گردش اور تیزی معمول پر آئی تو پورا بدن جیسے پھوڑا بن گیا۔ میرے حلق سے مارے در دو اذیت کے چچھیں تک نکل گئیں۔ میں کونے کے بستر پر کسی زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ کچھ لڑکے ہمدردی کے لیے مجھ سے پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے۔ مجھے اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میرے زخمی وجود میں ٹھنڈک بھرنے لگی ہو۔ کوئی تھا جو جانے کہاں سے میرے لیے دوائی اور مرہم پٹی کا سامان چرالایا تھا اور باقاعدگی سے مجھے مرہم پٹی کرتا تھا۔ یہی نہیں اور درد کش دوا بھی مجھے کھلاتا تھا۔

تیسرے چوتھے روز میری حالت سنبھلی تو میں نے اپنی نیم جان آنکھوں کے سامنے ایک نیم شناسا چہرہ دیکھا اور جیسے یکنخت میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دوبارہ سے عود کر بحال ہونے لگی۔

اپنے فرار کی ناکامی کا میرے ذہن میں جو پہلا سبب ابھرا تھا، وہ یہی شخص تھا۔ یعنی شوکت حسین... یہ شکلیہ کا

بالا بولا۔ ”اپنے لڑکوں پر نظر رکھو اور پھر کسی کی فرار ہونے کی کوشش نہ کرو۔“

”یعنی اس طرح دھوکے سے ان کی مخبری کر دوں، جس طرح تم دونوں نے میرے اور عابدہ کے ساتھ کیا تھا؟“

۔۔۔ میرے اندر کا آتش فشاں آخر پھٹ ہی پڑا۔

”دوست، مطلب براری کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے۔“

اشرف۔۔۔ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے خود پر قابو پایا۔۔۔۔۔ اور جبراً مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہاں، میں نے تمہی سے ہی یہ سبق سیکھا ہے۔ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو قربانی کا کبرا بناؤ۔ میں اس طرح اپنا مقصد حاصل کروں گا۔ مجھے تم دونوں سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں ہے بلکہ تم دونوں کا مشکور ہوں کہ تم نے مجھے یہ سب سکھایا۔ مجھے لگتا ہے کچھ لڑکے فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔“

”یہ کی ناجی داروں والی بات۔ لگے رہو۔ ایک دن ہماری جگہ آنے پر کامیاب ہو جاؤ گے۔“ دونوں یہ کہہ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان دونوں پر لعنت بھیجی اور کام میں لگ گیا۔

ایسا سب کچھ میں نے دانستہ اور دونوں سے کہا تھا تاکہ وہ اپنے استاد یعنی گنگل خان سے میرے سلسلے میں اس طرح کی باتیں کرتے رہیں۔ اور وہ مجھ پر ہی نہیں عابدہ پر بھی نرمی کا ہاتھ رکھیں۔۔۔ مگر ایسا کب تک چلتا۔۔۔ مجھے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔

میں نے رفتہ رفتہ اشرف اور بالے سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی۔ میں انہیں کریدنے کی زیادہ کوشش کرتا تھا۔ ان دونوں کا در پر وہ کام ہی یہی تھا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے اور میں نے ان دونوں کو اپنی حمایت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان سے باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرتا تھا کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ آیا کہ بس یہی لوگ تھے یا ان کی پشت پر اور بھی لوگ تھے۔۔۔ تو وہ کون تھے اور کہاں تھے؟

غرضیکہ وہ دونوں بھی مجھے اس سلسلے میں بتانے سے معذور تھے۔

لیکن سوچنے کی بات میرے نزدیک تھی کہ اچھا بھلا مشہور و معروف اور معزز نظر آنے والا ادارہ ”اطفال گھر“ حاجی اسحاق کے مرحوم ہوتے ہی یکدم جرائم پیشہ افراد کے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا؟ اور اگر چڑھ بھی گیا تھا تو ابھی تک معمول کے مطابق یہاں شہر کی کسی اعلیٰ معیار اور معزز شخصیت

”کیا بات ہے، شاعری بھی شروع کر دی ہے۔۔۔“

اشرف ہنسا۔ پھر سگریٹ کا گہرا کش لیا اور فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ”قسمت قسمت کچھ نہیں ہوتی، سارا کھیل دماغ کا ہے پیارے!“ اس نے اپنی انگلی سے اپنی کپٹی ٹھوکی۔ ”تم بھی اپنا دماغ استعمال کرو۔۔۔ اور ہماری طرح مزے کرو۔“

”بلکہ استاد کو تو تم پسند بھی آگئے ہو۔“ اس بار بالے نے کہا۔ اس کی بات پر میں اندر سے چونکا۔ گویا گنگل خان کی طرف سے خاصی قرابت داری استوار ہو چکی تھی۔ جواباً میں اس طرح گرم توے پر بیٹھی روٹی جیسی مسکراہٹ سے بولا۔

”ہاں یار، باتیں تو تمہاری بھی سچ ہی ہیں مگر میں شاید تمہارے استاد کے معیار پر پورا نہ اتر سکوں۔“

”ارے ہم کون سا تیس مار خان تھے پھر ان کے گینگ میں شامل ہو کر پیدا گیری ہمیں بھی آپکی ہے۔ تم بھی استاد کے دل و دماغ پر اپنا اعتماد بٹھانے کی کوشش کرو۔“

اشرف مکارانہ۔۔۔ مسکراہٹ سے بولا۔

میرا مقابل زبردست تھا اور میں زبردست۔ مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ اب میرا مقصد صرف عابدہ نہیں رہی تھی بلکہ میں نے یہاں رہنے والے ان سب قیدی لڑکا لڑکیوں اور بچوں کو چھڑانے کا عزم کر رکھا تھا۔ کیونکہ یہ ظالم لوگ نہ صرف ہم سے بلکہ معصوم بچوں سے بھی بیگار لیتے تھے۔ یہی نہیں، ان بچوں سے بھیک بھی منگواتے تھے۔ یہ قول شوکی کہ اصل لوگ یہ نہیں تھے جو عملے کی صورت میں نظر آرہے تھے، ان کی پشت پر بااثر لوگ تھے۔ گنگل خان وغیرہ تو محض ان کی کٹھ پتلیاں تھے۔

”کیا سوچتے لگے؟“ بالے نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں خیالات کے چٹنگل سے نکلا۔

”میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح میں تمہارے استاد پر اپنا اعتماد قائم کروں کہ اسے میری وفاداری پر یقین آجائے۔ اور میں بھی تم دونوں کی طرح خوب مزے کروں۔ سچ پوچھو تو میں اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔“

”یہ ہوئی نا۔۔۔ شیروں والی بات۔“ اشرف چپک کر بولا۔ بالے کے چہرے پہ بھی معنی خیز مسکراہٹ آئی۔

دونوں بے خبر تھے کہ میرے دل و دماغ میں ان کے لیے کھولنا ہوالا داخل پڑنے کو بے چین تھا۔ میرا بس چلتا تو ان دونوں حرام کے پلوں کی گردنیں مروڑ دیتا۔

”اس کے لیے تمہیں بہت آسان کام کرنا پڑے گا۔“

اتارا گیا۔ ہمارے بیروں میں فولادی زنجیروں کے کڑے ڈالے ہوئے تھے۔ ایک خشک نالے کی ریت بھری کھوپڑی وہاں پہلے سے موجود ٹریکٹر ٹریلیوں پر لادنا محنت طلب کام تھا۔ مگر ہمارے لیے اب یہ سخت کوشی نئی بات نہیں رہی تھی۔ اینٹوں کے بھٹوں پر ہم نے اس طرح کی جال کسل جفاکشی کی تھی۔ پتھر بھی توڑے تھے، مٹی۔۔۔۔۔

کام کیا تھا۔ آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی، میں ڈر سستانے کے لیے ایک طرف بیٹھ گیا۔ گنگل خان کے خوں خوری ہاتھ میں ہنتر نما چابک لیے ہم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں اسلحہ بھی نظر آتا تھا۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے سستانے کی اجازت دی جاتی، مقرر مدت سے ایک سیکنڈ بھی دیر ہو جاتی تو چابک نما ہنتر ہماری پشت پر پڑتا اور بلبلہ کر ہم دوبارہ جان توڑ مشقت میں لگ جاتے۔ میں اپنی قلیل مدت کی مہلت پر ایک طرف خشک بیٹھے کی ڈھلان پر جا بیٹھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آج مجھے تکلیف کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ تشدد تھا جو کچھ دن پہلے مجھ پر کیا گیا تھا۔

میری سستانے کی مہلت ختم ہو گئی تھی مگر مجھ سے ہنک نہیں جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے بیٹھے کی ڈھلان پر ایک گرائڈل ٹھنک کا سایہ ابھرتے دیکھا اور یلکھت تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت ”شائیں“ کی سنسناتی آواز فضا میں ابھری تھی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نیم دراز پڑا لے لے سانس لے رہا تھا، عین اس جگہ پر ہنتر کی ضرب پڑی تھی۔ میں دوبارہ کام میں جت گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ بروقت ہنتر کی جال کش ضرب سے محفوظ رہا۔

”بڑے بڑے حالوں میں ہو پیارے!“ کام کے دوران ایک زہر نپکائی آواز میری سماعت سے نگرانی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ دونوں مردود میرے سامنے کھڑے تھے، بلال عرف بالا اور اشرف۔ بالے نے مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے۔ دونوں نے چست پینٹ شرٹ چھڑا رکھی تھی۔ بیروں میں اچھے جوتے تھے۔ ہاتھ میں سگریٹ، اشرف نے سیاہ چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ دونوں کی ”نور“ دیکھ کر لگتا تھا وہ اب ہماری طرح قیدی یا بیگاری نہیں رہے تھے اور خوب مزے میں تھے۔

میں نے یہ مشکل اپنی اندرونی کھولتی ہوئی کیفیات قابو پاتے ہوئے ان کی طرف مسکرا کر پوچھ دیکھا جیسے مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں اور بولا۔ ”جو قسمت میں لکھا ہے دوست! وہی بھگتنا تو پڑتا ہے، سو بھگتتہ ہے ہیں۔“

دوڑ گئی۔ گویا شوکت۔۔۔۔ کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ اور اب میرا یہ تجزیہ بھی کہ درحقیقت بلال اور اشرف نے خود کو گنگل خان وغیرہ کے سامنے سرخ رو کرنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ مجھے اور عابدہ کو فرار پر اکسا کر۔ ان خبیثوں نے ہمیں استعمال کیا تھا، گنگل خان کی ہمدردیاں سینٹنے کے لیے۔ یہ طاقت کی نہیں مکاری کی جنگ تھی۔ بلال اور اشرف نے دماغ کی جنگ لڑی تھی اگر مجھے یہ جنگ جیتنا تھی تو خود کو زبردست کے سامنے زیر دست بنائے رکھنا تھا۔

گنگل خان تھوڑی دیر کو اس کرنے کے بعد چلا گیا۔ میں شوکت۔۔۔۔ کی طرف بڑھا۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ سچا آدمی تھا۔ میں نے فوراً بستر کی ایک چادر کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کی پیشانی والے زخم پر رکھ دیا اور اسے سنبھالا۔ ”میری وجہ سے تمہیں یہ چوٹ آئی۔ میں اس پر شرمندہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

”کوئی بات نہیں، نہ جانے کتنی اور ایسی چوٹیں میرے مقدر میں لکھی ہیں۔ تم نے دیکھ لیا نا بلال اور اشرف کا اصل چہرہ۔“

”ہاں۔“ میں نے مختصر آ کہا۔

”مجھے ابتدا ہی سے ان دونوں پر شبہ تھا۔ انہوں نے خود کو ان خبیث درندہ صفت شیطانوں کی غلامی میں دے دیا ہے۔“

شوکت۔۔۔۔ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور اپنی پیشانی کی چوٹ سہلانے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

بلال اور اشرف اب ہمارے ساتھ نہیں رہتے تھے یعنی ہم سے الگ کر دیے گئے تھے۔ وہ اب گنگل خان کے حواریوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ مگر ابھی ان دونوں کی حیثیت ان کے نوکروں اور غلاموں کی ہی تھی۔ تاہم یہ کیا کم بات تھی کہ دونوں نے گنگل خان کا اعتماد جیت کر پالا مارا تھا۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر ہم پر اور بالخصوص مجھ پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ اچھے وقتوں کے انتظار میں صبر اور مستقل حراستی عقل و فراست کے اعلیٰ اصولوں میں شمار ہوتی تھی۔ سرمد بابا کی اس نصیحت پر میں اب کار بند رہتے ہوئے کوئی مضبوط پلاننگ بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ۔۔۔۔ ہم پر مسلط کیا جانے والوں کی طاقت کا مجھے اب اچھی طرح اندازہ ہو چلا تھا۔

اس روز میری بلال اور اشرف سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں ایک بڑے سے بندرگاہ میں کہیں لے جایا گیا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ ایک ویرانے میں لا کر ہمیں

نے بھی کوئی وزٹ نہیں کیا تھا؟ حالانکہ اس سے پہلے شہری کی نہیں بلکہ ماضی میں ملک کی بڑی اہم سیاسی و غیر سیاسی اور سماجی شخصیات نے دورہ کیا تھا بلکہ ادارے کی ترقی و ترویج کے لیے خطیر رقم عطیہ بھی کی جاتی رہی تھی۔

ابھی میں اس سلسلے میں غور و فکر کر رہی رہا تھا کہ ایک غلط فہمی مچ گیا۔ شہر کی ایک بڑی کاروباری شخصیت ادارے کو ایک بڑی رقم کے چندے کا چیک دینے کے لیے عنقریب دورہ کرنے والی تھی۔

اس خبر پر مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری طرح دوسرے بھی حیران تھے اور خوش بھی۔ ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ہمارا کوئی نجات دہندہ آنے والا ہو... جو ہمیں اس جہنم سے نکالنے والا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ آخر کون سا شخص اور اس کے حواری یہ کیونکر چاہیں گے کہ باہر کا کون سا آدمی اور وہ بھی شہر کی کوئی معروف کاروباری شخصیت یہاں کا دورہ کرے اور ان کے کالے کرتوتوں سے آگاہ ہو سکے کیونکہ یہاں سب جو کچھ ہو رہا تھا یا کیا جا رہا تھا، وہ سب بیرونی دنیا سے خفیہ رکھا جا رہا تھا۔ تو پھر یہ لوگ اتنا بڑا رسک کس طرح لے رہے تھے اور کیوں؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی، خطیر رقم کی صورت ملنے والے چندے کا لالچ یا پھر وہ کسی اعلیٰ شخصیت کو دورے سے منع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

ہم اس نجات دہندہ کے بے چینی سے خنجر تھے بلکہ آپس میں بھی ہم نے ایک خفیہ نشست جمانے کے دوران یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ آنے والی شخصیت کو حلق پھاڑ پھاڑ کر ان دہندوں کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتادیں گے۔ کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ممکن تھا؟ کیا دلشاد خان عرف استاد کنگل واقعی ہی بے وقوف تھا؟

اشرف اور بالے کی مہربانی سے میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف چوری چھپے ملاقات کی۔ اس رات ناکامی کے بعد سے میری عابدہ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کا چہرہ پڑمردہ تھا، مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ شکلیہ بھی اس کے عقب میں گھڑی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ ”عابدہ! تم ٹھیک تو ہونا... تمہارے ساتھ کوئی فریادتی تو نہیں کی ان بھیڑیوں نے؟“

”نہیں... لیکن... شہزی! حالات بہت خراب ہونے والے ہیں۔“ عابدہ نے گویا انکشاف کیا۔ نہ جانے کیوں ہر بری خبر مجھے اپنے حوالے سے کم عابدہ کے حوالے سے زیادہ پریشان کر دیتی تھی۔

”کیا ہوا، خیریت؟ کیا ہونے والا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں دریا یافت کیا۔

اس نے ایک نگاہ اپنے ساتھ کھڑی شکلیہ پر ڈالی، گو اسے بولنے کا خاموش اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر بولی۔ ”شہزی بھائی! پہلے یہ تو بتائیں شوکی کیا ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا بہت اچھا دوست بن گیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ عنقریب وہ بھی تم سے ملے آئے۔“ میں نے اسے شوکت حسین کے سلسلے میں تسلی دی پھر پوچھا۔ ”شکلیہ بہن کیا ہونے والا ہے... خیریت ہے؟“

”ہمیں شبہ ہے خدا کرے غلط ہو۔ عنقریب ہم میں سے چند خوبصورت لڑکیوں کو کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جانے والا ہے۔“ اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”کک... کیا مطلب؟ اور... اور... تمہیں... اس بات کا شبہ کیسے ہوا؟“

”اب تک تو شبہ ہی ہوا ہے مگر خطرہ کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ بتانے لگی۔ ”میں نے اور عابدہ نے ان دونوں موٹی کالی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا بھی تھا۔“ یہی نہیں سمجھتا تھا کہ چند دنوں میں دوبار کچھ لوگ اندر آئے تھے جنہوں نے سب لڑکیوں کو بڑی تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس وقت ہمیں قطار کی صورت میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ ہمیں بڑا تشویش ہوئی... پھر جب ہم نے گراں عورتوں کی باتیں سنیں تو انہیں یہی کہتے سنا نہ جانے کن پانچ خوبصورت لڑکیوں کی قسمت پھونسنے والی ہے۔ دوسری ہنستے ہوئے جوابا بولی۔ پانچ میں سے دو تو بچی ہیں۔ ایک عابدہ اور دوسری شکلیہ۔ وہ اتنا بجا کر خاموش ہو گئی۔ شکلیہ کے مقابلے میں عابدہ کمزور دل کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ ایک دم ہی ہراساں نظر آنے لگی۔ شکلیہ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہونے والا تھا... کب؟ یہ ابھی پتا نہیں چل سکا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ دوسری بار اگر پکڑا جاتا تو میرے ساتھ یقیناً ان دونوں کی بھی شامت آ جاتی۔ میرے پاس عابدہ کو اور پھر شکلیہ کو تسلی دینے کے سوا اور کیا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے اس بات پر تھا تھا کہ میں نے اشرف اور بالے سے ابھی تک دوستانہ تعلقات استوار کر

تھے، جبکہ ہر لڑکا جان گیا تھا کہ اب وہ دونوں ہم میں سے نہیں رہے تھے۔ ہم پر مسلط کیے جانے والے درندہ صفت انسانوں کے آلہ کار بن چکے تھے۔ میں نے شوکت حسین کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے کہا۔

”ان دونوں نے میرے اور عابدہ کے ساتھ بہت برا کیا۔ مگر اس سے بھی بڑا جرم ان کا یہی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مل گئے ہیں جنہوں نے ہم پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر میں نے ان کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے ہیں تو اس میں ایک مصلحت ہے۔ ایک کڑوی مصلحت، بالکل اسی طرح جیسے کسی بیماری کو دور کرنے کے لیے کڑوی گولی لگی جاتی ہے۔“

”صاف اور سیدھی بات کرو شہزی!“ شوکی سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا تم بھی ان کے زر خرید سا بھی بننا چاہتے ہو؟ کیا تم بھی اشرف اور بالے کی طرح ہم میں سے کسی کی مخبری کر کے...“

”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم ایسی نا سنجھی والی باتیں کرو گے۔ شوکی!“ میں نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ہماری گرما گرم بحث پر ہال میں موجود اور لڑکے بھی ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ وہ بالخصوص میری طرف کڑوی اور عصبانی نظروں سے گھور رہے تھے۔ شوکی نے بہت ناوقت یہ فضول بحث چھیڑ دی تھی۔

”اس سے اب بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔“ ایک لڑکے نے کہا۔

”تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو... ایسا نہیں ہے۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ مگر شوکی سمیت کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔ سب مجھے اپنا دشمن سمجھ رہے تھے، جبکہ ان نادانوں کو کیا پتا تھا کہ میں تو خود ان سب کو اس جہنم سے نجات دلانے کی فکر پریشانی میں مبتلا تھا۔ میں انہیں صاف بات بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ... یہ میری ایک چال ہے۔

بعض جو شیطانی قسم کے نوجوانوں کو مجھ پریش آیا اور وہ مجھے مارنے کو بھی لپکے مگر شوکت حسین نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ تاہم وہ بھی اب مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور تشدد کے بعد میری تیار داری کی تھی۔ اس کا یہ احسان میں نہیں بھول سکتا تھا مگر ایک ذرا سی غلط فہمی کے باعث اس نے مجھے بھی ان درندہ صفت لوگوں میں شمار کر لیا تھا۔

میں ان سے مایوس ہو کر اپنے کونے والے بستر پر



اور ان کی سگم آپس میں بہت محبت کرتے تھے لیکن ان کے ماموں نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ دس برس بے۔ ایک دن بیمار ہوئے اور بیماری بڑھنے سے اللہ کو مایوس ہو گئے طارق حسنا لکھن دفن کے بعد گھر واپس آئے تو بھوی سے کہا: ”اللہ تمہارے ماموں کو جنت میں جگہ دے گا نہ تو انہوں نے کبھی ہمیں چین نہیں دیا۔“

”کیا؟“ سگم حیرت سے بولیں۔ ”اے خدا میں تو آج تک کبھی سمجھتی رہی کہ وہ تمہارے ماموں ہیں۔“

مترسلہ... متنوع کرنا... تراویندی

جا بیٹھا۔ اب ان کا لیڈر میں نہیں شوکت حسین تھا۔ یہ لوگ اب جب بھی آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے، مجھے خود سے دور رکھتے۔ نہ مجھ سے کوئی بات کرتے، نہ کسی گفتگو وغیرہ میں شامل کرتے۔ یہ مجھے خدا اور اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ یہی حال شوکی کا بھی تھا۔ تنگ آ کر میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

جس کاروباری شخصیت نے یہاں کا دورہ کرنا تھا، اس کا نام... مجھے اشرف اور بالے کے ذریعے سیٹھ منظور ڈراچ معلوم ہوا تھا۔ اسے تین چار روز میں... یہاں کا دورہ کرنا تھا۔ میں نے اشرف اور بالے سے یہ بات معلوم کرنا چاہی تھی کہ کیا ایسا ہونا ان کے ”مفادات“ کے خطرے کا باعث نہیں بن سکتا تھا؟ اس پر جواب دینے کے بجائے ان دونوں نے محض معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ وقت قریب آیا تو حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ نہ جانے کدھر سے مزید بچے، نوجوان لڑکے لڑکیاں، گاڑیاں بھر بھر کے لائے گئے، جبکہ ہمیں یعنی پرانے لوگوں کو ایک الگ ہال کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ ہال کمرہ گودام زیادہ نظر آتا تھا۔ نہ اس کی دیواروں میں کھڑکیاں تھیں، نہ دروازے، بس ایک بڑا سا چوبی گیٹ تھا۔ اور بلند چھت کے قریب والی دیوار پر چھوٹا سا روشن دان... یہاں اندھیرا کر دیا گیا تھا۔

پھر وزٹ والے دن ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ ہونٹوں پر اسکاچ ٹیپ چپکا دیا گیا۔ ساتھ ہی ہمیں دھمکیاں بھی دی گئیں کہ کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو اس کی خیر نہ ہوگی۔ مجھے ان کی چالاک کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی

تھی مگر اب بھی میں الجھا الجھا سا تھا۔

سارے لڑکے رن بستہ حالت میں کونوں میں دوپکے گئے تھے۔ تاہم میں ذرا ہمت کر کے بند دروازے کی باریک متوازی جھری سے آنکھ چپکائے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اب باہر کا سارا ماحول ہی بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ نئے آنے والے جانے والے بچے، جوان لڑکیاں، لڑکے آزادی کے ساتھ باہر میدان میں گھوم پھر رہے تھے اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔ گگل خان اور اس کے حواری بھی ڈھنگ کی حالت میں تھے۔ یعنی ان کے پاس خلاف معمول کوئی اسلحہ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ شریفانہ لباس اور شریفانہ صورتیں بنائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ مجھے اب سب کچھ میں آ رہا تھا۔ ہمیں اس لیے یہاں ڈرا دھکا کر بند کر دیا گیا تھا کہ کہیں ہم آنے والی شخصیت سے ان کے کالے کرتوتوں کی شکایت نہ کر دیں اور ان کے مکروہ چہرے بے نقاب نہ کر دیں۔

ہمارے گودام نما قید خانے کے بڑے سے چوٹی گیٹ کے سامنے ہی وہ میدان تھا جہاں اسٹیج اور ڈانس وغیرہ لگانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں بند دروازے کے قریب ہی بیٹھا باہر کی کارروائی کا منظر دیکھتا رہتا تھا۔ امید کی جوت جاگی تھی، وہ بھی اب بجھ گئی تھی۔ شوکت حسین بھی میری طرح یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے بھیا تک چہرے پر کس چالاکی اور مکاری سے نہ صرف نقاب ڈالی تھی بلکہ اس کاروباری شخصیت یعنی سیٹھ منظور وڑائچ سے ایک بھاری رقم چندے کی صورت میں بھی وصول کرنے والے تھے۔

بہر حال وہ وقت بھی آ گیا جب اس شخصیت نے دورہ کرنا تھا۔ اسٹیج پر صوفے اور کرسیاں لگائی جا چکی تھیں۔ مجھ سمیت چند اور لڑکے بھی میری تقلید کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر بند گیٹ کی طرف آن پہنچے۔ ان میں شوکی بھی تھا۔ میں دم سادھے اپنی آنکھ جھری سے چپکائے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے باہر مرکزی گیٹ تک کا بھی منظر واضح تھا۔

سب لوگ جن میں ”عملے“ کے لوگ بھی تھے، مہمان کے استقبال کے لیے ہاتھ میں پھولوں کے گل دستے تھے۔ معا کھڑے تھے۔ اشرف اور بالا بھی ان میں شامل تھے۔ معا ایک کبھی سنی نئے ماڈل کی چمچاتی کار اندر داخل ہوئی، میری نظر کار پر تھی۔ یقیناً میری طرح یہاں موجود اور لڑکوں کی آنکھوں میں بھی حسرت سمٹ آئی تھی۔ اس بات کی کہ ہم

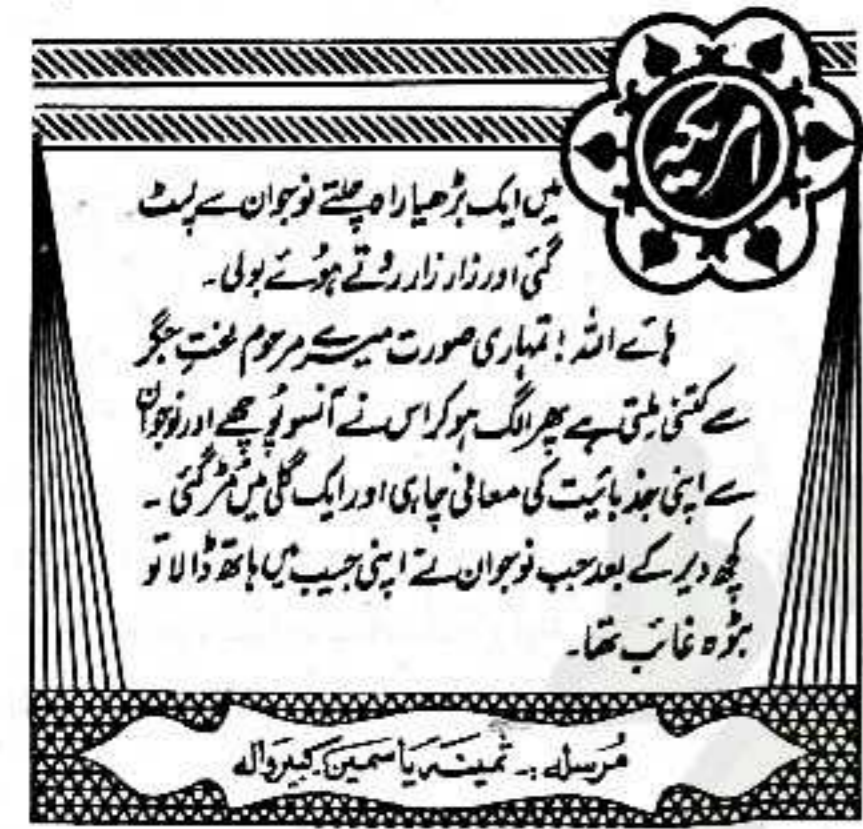
کتنے بے بس تھے اور اپنے نجات دہندہ سے چیخ چیخ کر اپنی حالت زار اور یہاں پر ہونے والے مظالم کی داستان بھی اسے سنانے سے قاصر تھے۔ کاررک گئی، باوردی ڈرا پور اُترا۔ اس نے جھٹ سے دروازہ کھولا تو ایک عمر رسیدہ شخص قیامت سوتھ میں برآمد ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک اور سیکریٹری نائب آدمی بھی اترتا تھا مگر میری نظریں اس معزز مہمان پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنی وضع قطع سے مہمان خصوصی ہی نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یلخت جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے اپنے آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری دم بہ خود نظریں متور معزز مہمان سیٹھ منظور وڑائچ پر جم کر رہ گئی تھیں، جو کوئی اور نہیں سرمد بابا تھے۔

☆☆☆

سرمد بابا... کو پہچانتے ہی میری آنکھوں کی بے بسی اور حسرت آہٹا کو پہنچ گئی۔ فرط جوش سے میرا وجود بھی مرتعز ہونے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ لکڑی کے اس جوہر بند دروازے کو دیوانہ وار اپنے سر کی ٹکروں سے توڑ ڈالوں رن بستہ وجود کو ایک پھری ہوئی انگڑائی لے کر جکڑ بندوں سے آزاد کر دوں۔ اور میں نے ایسی کوشش کرنا بھی جانی تھی کیونکہ اب ہم بچے کہاں رہے تھے، میں خود ایک گہرو اور کڑیل نوجوان کے روپ میں ابھرا تھا۔ میرے سامنے بھی جوان مرد بن چکے تھے۔ جاتے تو مل کر اپنے راستے کی دیوار توڑنے یا گرانے کی کوشش کر سکتے تھے، مگر یہ ممکن نہ تھا شاید شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں سے میرے اندر کی پھری ہوئی بے چینی بھانپ لی تھی مگر دوسرے ہی لمحے ذاتی خاصیت اور غلط فہمی کے باعث پروان چڑھتی شقاوت قلبی کے باعث فوراً اس نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔

سرمد بابا المعروف سیٹھ منظور وڑائچ اب ڈانس پر کھڑے، خطاب کر رہے تھے۔ ان کے سامنے لاوارث اور نیم بچوں کو باقاعدہ کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ اور سرمد بابا اس ادارے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلم مار رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب یہ اطفال گھرا ایک جرائم پیشہ لوگوں کا ڈابن چکا تھا۔

ایک مضبوط امید میرے اندر جاگی۔ ہاں... سرمد بابا... کوان نئے لائے جانے والے لڑکے لڑکیوں کیپ دکھا کر دھوکا تو دیا جاسکتا تھا مگر اس تعلق کو اس رشتے اور جذبے کو کس طرح دھوکا دے سکتے تھے جو میرے اور سرمد بابا کے بیچ بہت پہلے سے استوار ہو چکا تھا... مجھے یاد تھا



میں ایک بڑھیا راہ چلتے نوجوان سے ہلٹ گئی اور زار زار روتے ہوئے بولی۔

ہائے اللہ! تمہاری صورت میرے مرموم غنبت جگر سے کتنی ملتی ہے پھر لگ ہو کر اس نے آنسو پوچھے اور نوجوان سے اپنی ہزہ بابت کی معافی چاہی اور ایک گلی میں ٹوٹ گئی۔

کچھ دیر کے بعد جب نوجوان نے اپنی حبیب میں ہاتھ ڈالا تو بڑھ غائب تھا۔

میرسلہ۔۔۔ شہادت یا سہمیں کبیروالہ

سامنے کار روک دی گئی۔ مجھے اتارا گیا اور پھر میں اس سٹیج کے مختصر قدمی طے کرتا ہوا اور سرمد بابا کے پاس جا پہنچا۔ بابا نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور میں جیسے ان کے بازوؤں میں بھر گیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے دیکھا سرمد بابا کی بوڑھی آنکھیں بھی ڈبڈبائی تھیں۔ سرمد بابا سے بہ ظاہر میرا کوئی خون کارشتہ نہ تھا۔ مگر انسان کے قابل احترام جذبات کو کھنسا انسانی رشتوں ناتوں میں نہیں تو لانا جاتا

سرمد بابا نے بھی مجھے اپنی سگی اولاد کی طرح خود سے بھینچ لیا تھا۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر وقت نہیں تھا۔ گنگل خان نے کچھ ہدایتیں مجھے بعد میں کار میں سوار ہوتے وقت بھی دی تھیں۔

سرمد بابا کو میں نے وہی کچھ بتایا جو مجھ سے کہا گیا تھا اور انہیں میرے بارے میں جیسا بتایا گیا تھا۔۔۔ جبکہ میرے استفسار کرنے کے باوجود بابا نے اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا کہ ان کی اچانک کس طرح کا یا کلپ ہوئی تھی۔ نیز وہ مہربان عورت کون تھی جو ایک دن ان کا سہارا بنی اور انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ بابا مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے پھر کسی وقت کا کہہ کر ٹال دیا۔ انہوں نے مجھے اپنا سیل فون نمبر لکھ کر دیا۔ وہ میں نے ذہن نشین کر لیا۔ اس دوران میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بابا سے مدد کا کہہ سکوں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ گنگل خان، اس کے حواری اور مردودا شرف اور بالائی "نگراں" نظریں نہ صرف میری ایک ایک حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں، بلکہ وہ میری آواز کا بھی دھیان رکھے ہوئے تھے کہ میں سرمد بابا سے ایک ذرا سرگوشی بھی نہ

میں گیت سے اندر لے جایا جائے گا۔ اور سرمد بابا سے ملو کر ان کی تسلی کروادی جائے گی لیکن تم نے انہیں وہی کچھ کہنا ہوگا جو تمہیں پہلے سے بتایا گیا ہے۔"

"اور یاد رکھنا اگر تم نے ذرا بھی چالاک کی کرنے یا ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو بھیا تک انجام تو تمہارا مقدر ہوگا ہی مگر اس سے پہلے تمہاری معشوقہ کا حشر برا کر کے رکھ دیں گے۔" آخر میں گنگل خان نے بڑے بھیا تک لہجے میں مجھے تنبیہ بھی کر دی۔

میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "شہزادو... یہی وقت ہے دماغی جنگ لڑنے کا۔ وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوت فیصلہ بھی۔ آگے تمہاری قسمت۔"

میں نے فوراً ہائی بھرتے ہوئے گنگل خان سے کہا۔ "استاد! تم تو مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ اب تک اشرف اور بدل کی طرح میں بھی تمہاری وفاداری کا دم بھرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر انفسوس اب تک مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مگر اب میں اس سنہری موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔"

"کیا کہتا تھا میں استاد! وقتاً اشرف نے گنگل خان سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری بات مان جائے گا۔"

"ہاں، ویسے بھی اس کے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" گنگل خان نے طاقت کے زعم اور پُر غرور لہجے میں کہا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی، تاہم ناامید نہ ہوا۔

یہ سب باتیں مجھے ایک کونے میں لے جانے کے بعد سرگوشیوں میں ہوئی تھیں۔ جبکہ باقی لڑکوں کو مجھ سے دور کر دیا گیا تھا۔ اب وہ سب شوکی سمیت یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اپنی آزادی کی خاطر ان کے ساتھ کوئی خفیہ قسم کی ساز باز کر رہا ہوں۔

مجھے نہایت ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ گودام سے باہر نکالا گیا۔ ظاہر ہے اب میرے ہاتھ پاؤں آزاد کر دیے گئے تھے۔ سامنے اسٹیج تھا، اس لیے اب درمیان میں ایک اور قناعت کھڑی کر کے دیواری بنا دی گئی تھی۔ یہ کام گنگل خان کے حواری پہلے ہی کر چکے تھے۔

مجھے ایک نسبتاً بہتر کمرے میں لایا گیا۔ یہاں میں نئے کپڑے پہن کر جتنی جلدی تیار ہو سکتا تھا، ہو کے دوسرے دروازے سے باہر آ گیا۔ میرے ہمراہ خود گنگل خان اور اس کے حواری بھی تھے۔ پھر ان کا ایک حواری کار لے آیا۔ مجھے اس میں سوار کیا گیا۔ اور کار گھما کر مین گیٹ کے راستے دوبارہ مجھے عزت و احترام کے ساتھ اندر لایا گیا۔ اسٹیج کے

باتیں کر رہا تھا اور گنگل خان کا انداز کسی بے دام غلام کی طرح تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے آخر میں سرمد بابا سے جھک کر کچھ کہا اور اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں ہی نہیں، بلکہ دروازے سے یاس زدہ آنکھیں چپکائے ہوئے دیگر لڑکے بھی بری طرح ٹھنک گئے۔ پھر جیسے یک تک کھلونوں میں چابی بھر گئی۔ جکڑ بندوں کے باعث ہم سب جتنی تیزی کے ساتھ رینگ رینگ کر دروازے سے دور ہو سکتے تھے ہوئے رہے کیونکہ اسٹیج سے اترنے کے بعد گنگل خان کا رخ اس گودام کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھڑ سے دروازہ کھلا۔ گنگل خان اندر داخل ہوا۔ بدنما چہرے کی خوشخواری لیکھنے لوٹ آئی تھی پھر اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ میری طرف لپکا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کے تین حواری بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے دو اشرف اور بالائی تھے۔

"تم... شہزاد احمد خان میری بات غور سے سنو۔ اب تک کی ساری صورت حال تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اس لیے میں کچھ بات نہیں کروں گا۔ سیٹھ صاحب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟" گنگل خان نے کھردرے اور فیصلہ کن لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مگر میں نا سمجھ میں آنے والے ایکٹنگ کرنے لگا۔ "تم سمجھاؤ اسے اچھی طرح..."

خان نے مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر تھکسا نہ انداز میں اشرف اور بالے سے کہا تو وہ دونوں فوراً حکم کے غلام بنے میرے جانب بڑھے۔ سب سے پہلے بالاجھ سے بولا۔

"سنو شہزی! یہی وقت ہے تمہاری استاد گنگل خان کے ساتھ وفاداری دکھانے کا۔ ہمیں بھی یہ حقیقت معلوم ہے کہ سیٹھ منظور سرمد بابا کے نام سے یہاں چند سال گزارے تھے اور تمہاری ان سے بہت قربت داری تھی۔ اب وہ وہاں سے خد ہیں کہ تمہارے سلسلے میں انہیں مطمئن کیا جاسکے۔" وہ تو یہاں سے اشرف نے بات اچک لی اور مجھ سے بولا۔

"ہم نے تمہارے سلسلے میں سرمد بابا کو پہلے ہی سے دیکھا ہے کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔ مگر چونکہ ہم یہ کہہ کر بھی جان چھڑا سکتے تھے کہ تم بھاگ گئے ہو۔ اس طرح ان کی نظریں میں ادارے کی بنی بنائی ساکھ خراب ہو سکتی تھی اس لیے ہمیں یہ بہانہ کرنا پڑا کہ تم اب ادارے سے نکل کر نہیں آئے۔ جگہ نوکری کر رہے ہو۔ اور اپنی زندگی سے خوش ہو۔ مگر سرمد بابا یہ ضد ہیں کہ اگر تم جا چکے تھے تو اس کا ریکارڈ موجود ہے چاہے تم، سو ہمیں اس سلسلے میں انہیں اثبات میں ہی جواب دینا پڑا۔ اب ہم تمہیں خاموشی اور آزادی کے ساتھ یہاں سے باہر نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں کار میں بٹھا

اچھی طرح سے کہ سرمد بابا نے مجھے اپنے گلے بیٹے سے بھی بڑھ کر کہا تھا۔ یہ بات گنگل خان اور اس کے ساتھی حواریوں کے سامنے وگمان میں بھی نہ تھی کہ سیٹھ منظور وڑائچ یعنی سرمد بابا اور میرے بیچ کیا رشتہ تھا۔ بے شک سرمد بابا نے یہاں اپنے بڑھاپے کے چند سال بتائے مگر ان چند سالوں میں انہوں نے مجھے برسوں کا مان دیا تھا۔

میں اب حیرانی سے جھری کے پار ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ جہاں بھی رہے تھے اب تک یقیناً نسبتاً اچھے حالوں اور اچھے ماحول میں رہیں ہوں گے۔ جیسی اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی صحت ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ وہ زندہ دل انسان تھے۔ یقیناً پہلے کے مقابلے میں اب انہیں جسمانی اور ذہنی آرام و خوشی نصیب ہوتی رہی تھی۔

سرمد بابا یعنی سیٹھ منظور وڑائچ یہی ان کا اصل نام رہا ہوگا۔ وہ تقریباً کرنے کے دوران مائیک پر کھڑے تھے۔ "شاید بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہوں گے کہ میں نے بھی ماضی قریب کے چند سال یہاں گزارے ہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں ان چند سالوں میں عملے کے پرانے لوگ نظر نہیں آ رہے۔ خیر... جوئے ہیں میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ وہ حاجی صاحب کے انتقال کے باوجود اس ادارے کا نظم و نسق بہ احسن خوبی درست خطوط پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ گنگل خان وغیرہ نے بھی باری باری مختصراً خطاب کیا۔ اس کے بعد سرمد بابا کو وزٹ کرانے کے لیے ادارے کے مختلف پورشن میں لے گئے۔ اپنے خطاب کے آخر میں انہوں نے ادارے کو اپنی جانب سے ایک خطیر رقم کا چیک بہ طور چندہ بھی دیا تھا۔

سرمد بابا میری نظروں سے غائب ہو گئے تھے اور ایک بار پھر مایوسیوں کے اندھیرے میرے اندر کالے پادلوں کی طرح چھانے لگے۔ مجھے سرمد بابا سے پوری امید تھی کہ وہ اپنے خطاب کے دوران میرا ذکر ضرور کریں گے۔ وہ یہاں کے منتظمین کو جب مجھے ان سے ملانے کا کہیں گے تو ان کے پیروں تلے زمین سرک جائے گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ "کیا سرمد بابا مجھے بھول گئے تھے؟" ایک تکلیف دہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

کافی دیر بعد میں نے سرمد بابا کو کچھ لوگوں کی معیت میں دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا اور اس بار وہاں بارہائیں چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ وہ اسٹیج پر رکھے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔ ان کا سیکرٹری گنگل خان سے کچھ

کر سکوں۔ یہ کیسی بے بسی تھی۔ بابا... میرے ہی نہیں یہاں قید ہم سب بد نصیبوں کے لیے نجات دہندہ بن سکتے تھے میں انہیں ایک لفظ تک بھی مدد کے لیے نہ کہہ سکا۔  
یوں بھی اگر بھانڈا پھوٹ بھی جاتا، تو ان بھیڑیا صفت لوگوں سے خیر کی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔  
میرے ہر دل عزیز سرد بابا کا دیا ہوا اسل فون نمبر میرے لیے امید کی ایک کرن ضرور تھا جسے میں نے فوراً اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا، بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ سرد بابا کے رخصت ہوتے ہی مجھ سے وہ کاغذ چھین لیا گیا تھا جس پر ان کا اسل... نمبر درج تھا۔

☆☆☆

اس اہم ترین مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی میں اب تک گنگل خان پر اپنا اعتماد اور (جھوٹی) وقاداری نہیں بٹھاسکا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک بار یہاں سے فرار کی کوشش کر چکا تھا۔ گویا مجھے اب بھی قیدیوں کی طرح ہی بیگار پر رکھا جا رہا تھا۔ میرے ہم جولیوں نے اگرچہ مجھ سے بات چیت ترک کر رکھی تھی۔ اور مجھے ہر وقت ان کی پھبتی ہوتی نظروں کا سامنا رہتا تھا۔ مگر اس روز شوکت عرف شوکی مجھ سے بات کیے بنا نہ رہ سکا۔ ایک زہر آلود اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

”اب کون سی نئی ساز باز کر رہے ہو ان لوگوں کے ساتھ؟“

”میں کوئی ساز باز نہیں کر رہا۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ میں اس وقت اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ شوکت حسین نے میرے بیڈ کی پائنتی پر ایک پاؤں ٹکا دیا تھا اور بڑے اسٹائل کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ یہ لوہے کی پائنتوں والے اسپرنگ کے بیڈ تھے۔

”اچھا؟“ وہ بہ دستور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”کوئی تو نئی کھجڑی تم ان کے ساتھ مل کر پکا ہی رہے ہو۔ کہاں لے کر گئے تھے تمہیں یہ لوگ اس دن؟“

”تم سے مطلب؟“ اس کے مستقل طنزیہ اور روکھے لہجے نے... بالآخر میرے خون کو بھی گرمادیا تھا۔ ”اچھا اب تم اپنی ٹانگ بٹاؤ میرے بیڈ پر سے بستر کی چادر میلی ہو رہی ہے۔“

شوکت اپنا پاؤں ہٹانے کے بجائے انتہائی بے دردی سے اپنے جوتے کو میرے بستر کی چادر سے صاف کرنے لگا اور انتہائی نفرت آمیز لہجے میں... بولا۔  
”جن کا ضمیر ہی میلا ہوا نہیں بھلا چادر کے میلے ہونے کا کیا غم

ہوسکتا ہے۔“

”شوکی! میں کہہ رہا ہوں میرے بستر سے اپنا پاؤں ہٹاؤ۔“ اس بار میرے اندر لاوا کھولنے لگا تھا اور میں نے خوب چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کیے۔... میری نظریں اس کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ اس نے پھر بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تو... جیسے میرے اندر غیظ و غضب کی آگ سی بھر گئی۔ میں اس سے بھڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے بہ دستور نفرت اور تضحیک آمیز رویے نے مجھے اس سے بھڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے حرکت میں آیا اور ایک زوردار ٹانگ کی ٹھوک اس کی ٹانگ پر رسید کر دی۔ جو میرے بیڈ پر ٹکی ہوئی تھی۔ نتیجتاً شوکی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لڑنے پر اتر آیا تو میں بھی بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ صحت میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ تھا البتہ قدم میں مجھ سے مار کھاتا تھا۔ اپنے لیڈر کے ساتھ مجھے بھڑتے دیکھ کر باقی لڑکے جو مجھ پر پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے، مشتعل جھٹے کی صورت میں میری طرف لپکے تو شوکی نے فوراً ایک ہاتھ کے اشارے سے ان کی میری طرف پیش قدمی کو روک دیا۔  
”اس ضمیر فروش بزدل آدمی کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“ اس کے ان الفاظ نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی اور پھر میں اس پر دراندہ وار جھپٹ پڑا۔

میرے ایک ہاتھ کا ٹھونسا اس کے چہرے پہ پڑا۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، وہ اپنے حلق سے کراہ آمیز آواز نکالتا ہوا چند قدم پیچھے کولڑ کھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خون کی سرخی نمودار ہوئی۔ اور وہ وحشانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر لپکا۔ اور اپنے جسم کی ٹھوک لگائی، شکر تھا کہ میرے عقب میں بستر تھا۔ میں اس پر پشت کے بل جا کر۔ وہ مجھ پر کودا تو تب تک میں اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا چکا تھا۔ شوکت حسین میری ٹانگوں سے ٹکرایا تو میں نے اسے پرے اچھال دیا۔

دو دو لڑائی یا ہاتھ پائی میں یہ بات فطری ہوتی ہے کہ انسان لڑائی بھڑائی کا ماہر نہ بھی ہو مگر اپنے دفاع اور چوٹ کھانے پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ میں بھی کوئی ماہر جنگجو نہ تھا تاہم میری فطرت میں قدرتی طور پر ایک ٹھہراؤ اور ہوش مندی کا دخل زیادہ تھا۔ ایسی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں جنہیں غصہ بہت کم آتا ہے مگر جب آتا ہے تو پھر اس کی انتہا بھی دیکھنے کی ہوتی ہے۔ قدرت نے میری فطرت میں یہ دونوں خوبیاں رکھی تھیں۔ اپنے دونوں بیروں سے شوکی کو میں نے اچھالا تو وہ

اوارہ گود دیا۔ اچھا کھانا پینا اور دیکھ بھال کی گئی۔ مجھے ان دنوں بیگار پر بھی نہیں لے جایا گیا۔ پھر اشرف اور بالانے آکر مجھے بتایا کہ استاد گنگل خان تم سے خوش ہے۔ اب تم بھی ہم دونوں کے ساتھ کام کرو گے۔ میں نے پہلے تو دل ہی دل میں گنگل خان پھر بالا اور اشرف پر لعنت بھیجی اور بظاہر خوشی سے بولا۔

”تم دونوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ میں خوش ہوں تمہارے ساتھ رہ کر۔“ لیکن بالا اور اشرف نے واضح لفظوں میں مجھے یہ بھی بتا دیا کہ ابھی ان کی... اپنی حیثیت ویسی نہیں ہوئی جیسی کہ گنگل خان کے اپنے حواریوں کی تھی بلکہ بالا اور اشرف خود ابھی تک گنگل خان کے حواریوں کے تابع تھے۔ اور انہیں یعنی بالا اور اشرف کو ویسی آزادی بھی نہ تھی کہ وہ بغیر کسی کو بتائے عمارت کی اس چار دیواری سے باہر قدم بھی رکھیں وغیرہ۔ ان کی باتیں سن کر مجھے ٹھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی تاہم میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے کم از کم بیگار کرنے اور اس ہال کمرے سے آزادی مل گئی تھی۔ میں چار دیواری کے اندر ہی مگر آزاد گھومتا پھرتا تھا۔ تاہم اندر کے چھوٹے موٹے کام بجالانا میری ذمے داری میں تھا۔ یہاں پر کھانا چائے بنانے اور صفائی کرنے والے بھی گنگل خان کے اپنے ہی آدمی تھے، مگر اب یہ کام ہم تینوں کو کرنا پڑتے تھے۔ میں اس میں بھی خوش تھا۔ ہم تینوں کو رہنے اور سونے کے لیے ایک ہی بڑا کمرادیا گیا تھا۔ اچھی سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ سگریٹ وغیرہ تو میں نہیں پیتا تھا۔ اب ہمارا کام بیگار پر لڑکوں اور بچوں کی نگرانی کرنا بھی ہوتا اور ساتھ ساتھ حواریوں کو پانی پلانے کا کام بھی ہمارے ذمے ہوتا۔ ظاہر ہے جاں کس بیگار کاٹنے سے یہ کام قدرے بہتر تھا۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ اشرف اور بالا کی باتیں غلط نہ تھیں۔ ہمیں واقعی ابھی وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو گنگل خان کے حواریوں کو تھی۔ خیر... سردست میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ چار دیواری کے اندر کسی، ہاتھ پاؤں ہلانے کی تو آزادی تھی۔ اس دوران میں نے عابدہ سے بھی ایک بار ملنے کی کوشش کی تھی۔ جب چھپتے چھپاتے کھڑکی کے نزدیک پہنچا تو مجھے دیگر لڑکیوں کی جھلک دکھائی دی۔ ایک شاسٹرا کی کورازداری سے پاس بلا کر میں نے دھڑکتے دل سے عابدہ کے بارے میں پوچھا تو ایک سنسنی خیز اور دل ہلا دینے والا انکشاف سامنے آیا۔ یہ ثریا تھی، وہ بولی۔  
”شہزاد بھائی! عابدہ سمیت پانچ لڑکیوں کو راتوں رات غائب کر دیا گیا ہے۔“

سیدھا اپنے ساتھیوں کے قدموں تلے جا کر۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ شوکی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو رہا تھا۔ یہی حالت اس کے ہم خیال لڑکوں کی تھی۔ شوکت اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جارحانہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہوش میں آؤ شوکی! میں لڑائی سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن ہمارے بیچ لڑائی مناسب نہیں۔“

مگر وہ پھر مجھ پر جھپٹا اور میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا ہم دونوں اپنے وجود کا زور لگا کر ایک دوسرے کو دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم کوئی ماہر لڑاکا نہ تھے۔ یہ خالصتاً ”دبلی مارکہ“ لڑائی تھی، مگر جب میں نے شوکی کو دو بار زک پہنچائی تو میرے اندر ایک دلولہ جاگا۔ ایسا دلولہ جو لڑنے والے کو خود اعتمادی بخشتا ہے۔ شوکی نے مجھے اڑنگ لگانے کی کوشش کی، اس میں وہ کامیاب بھی رہا کیونکہ میں گرنے کے انداز میں لڑ کھڑا گیا۔ مگر پتا نہیں یہ میری عقل مندی تھی یا پھر عام سی لڑائی میں اپنا دفاع کرنے کا فطری انداز تھا کہ میں نے اس کا گریبان نہ چھوڑا تھا، نتیجتاً شوکی بھی میرے ساتھ گرا تو میرے بجائے وہ زرد میں آ گیا۔ وہ زمین پر جا پڑا۔ میں اس کے اوپر تھا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پختہ فرش سے ٹکرایا یقیناً اسے چکر آگئے ہوں گے۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دیوچ لی۔ اب دیگر لڑکوں سے میرے ہاتھوں اپنے لیڈر کی پٹائی نہیں دیکھی گئی۔ وہ شور مچاتے ہوئے بیک وقت مجھ پر پل پڑے۔ میں اتنے ساروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب غصے اور جنون میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ میں حلق کے بل چیخنے لگا تو میری چیخ دیکار سے کئی حواری ہاتھوں میں ہنتر نما چابک لیے اندر داخل ہوئے۔ ان میں بالا اور اشرف بھی تھے۔ ہنتر مار مار کر انہوں نے مجھے لڑکوں سے چھڑایا۔ میں نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ اشرف اور بالے نے مجھے سنبھالا دیا۔

”یہ... یہ... لوگ اس شہپر مجھے مار رہے تھے کہ میں تم لوگوں کا سانھی اور مخبر ہوں۔“ میں نے ہانپتے ہوئے انہیں بتایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ نسبتاً ایک بہتر کمرے میں لا کر مجھے بستر پر لٹا دیا گیا۔ وہاں استاد گنگل خان موجود تھا۔ بالے اور اشرف نے میری طرف داری میں اسے ساری بات سمجھائی۔ شاید اب گنگل خان مجھ سے کچھ متاثر نظر آنے لگا تھا۔ مجھے چند دن اس کمرے میں رہنے



”کک کیا؟“ یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ”یہ... یہ... کیا کہہ رہی ہوں؟ کک... کک... ہو یہ سب...؟“ میں نے لکت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”کل رات کی بات ہے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”ہم سب سو رہے تھے کہ اچانک شور کی آواز سے سب سے پہلے میری ہی آنکھ کھلی تھی۔ وہ نگران عورتیں تین بٹے کے مردوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں انہوں نے شاید پہلے ہی سے پانچ لڑکیوں کا انتخاب کر رکھا تھا۔ ہم سب خوف زدہ تھے۔ ہمیں خوفناک گنیں دکھا کر خاموش رہنے اور اپنے اپنے بستروں پہ پڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔ پھر ہم میں سے پانچ بد نصیب لڑکیوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ کھینچ کر وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے۔“

”کدھر لے جا رہے تھے وہ انہیں؟“ میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”ہم نہیں جانتے۔ لیکن اندازہ ہے ان لڑکیوں کو کوئی لینے کے لیے آیا تھا۔ اور... وہ...“ ثریا کا دل ڈوب گیا۔ اپنا جملہ نام لے چھوڑ کر وہ رو پڑی۔ شاید اسے اپنا انجام بھی ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔ میں اسے قفل کھلی ہی دے سکتا تھا۔ ثریا نے سنبھلنے کے بعد مجھے عابدہ سمیت لڑکیوں کے نام بھی بتائے تھے، ہنسی بھی ان میں شامل تھی۔ یہ شوکت حسین عرف شوکی کی محبوبہ لونا تھی۔ ثریا روہاسی ہو کر مجھ سے بولی۔ ”شہزی بھائی! تم کچھ کرو نا... عابدہ اور ہنسی نے تو تمہارے سلسلے میں ہمیں بڑی تسلی دے رکھی تھی کہ تم... اور شوکت بھائی (شوکی) مل کر ہم سب کو یہاں سے نکالنے کا عزم کیے ہوئے ہو۔“

اس کی بات سن کر میرے دل پر گھونسا لگا۔ ان بے چاریوں نے مجھے پتا نہیں کیا کچھ لیا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا... میں بھی تو تنکا ہی تھا ان کے لیے... کیونکہ میں ایک بار عابدہ کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں اور عابدہ اس رات منحوس چار دیواری سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ان سب کے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے۔ ابھی میں روتی دھوتی ثریا سے نشی آمیز جملے کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک زوردار بھاری ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھٹا گیا۔ ثریا چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ وہ ایک ہٹا کٹا حواری تھا جس نے مجھے ثریا سے باتیں کرتے چھاپ لیا تھا۔ اس نے مجھے اسی طرح گردن سے پکڑ کے گنگل خان کے سامنے پیش کر دیا۔ وہاں اشرف اور بالا بھی موجود تھے مگر

ان کے بشروں پر سرد مہری طاری تھی جبکہ گنگل خان میری طرف... خوشخوار نظروں سے گھور رہا تھا... پھر اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

”کیوں بے لہڈے! ادھر کھڑکی میں کس سے ملنے گیا تھا؟ تیری معشوقہ تو اب گئی تیرے سے دور... پتا چل گیا تجھے یا نہیں۔“

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”استاد! میری معشوقہ تو اس دن سے ہی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی جب میں نے اسے فرار کرانے کے لالچ میں اس کے ساتھ یاری گمانھی تھی۔ اب ایک نئی لڑکی پھنسی ہے۔“

”ہوں۔“ میری بات سن کر گنگل خان نے مکرو مسکراہٹ سے ہنکارا بھرا۔ میں نے کوشش چاہی تھی کہ کسی طرح اس مردود کو میرے اور عابدہ کے درمیان تعلق خاطر کی جھنک نہ پڑے، لیکن میں اشرف اور بالا کی طرف سے کچھ خائف تھا کیونکہ یہ دونوں خبیث عابدہ کے میرے ساتھ تعلق کی سنجیدگی سے بے خوبی واقف تھے۔

”بڑی بخول بازیاں کرتا ہے، کڑیوں کے ساتھ۔“ گنگل خان ہنسا۔ میں خوش تھا۔ وہ میرے جھانسنے میں آ رہا تھا، ورنہ مجھے ڈرتا تھا کہیں اس جرم میں مجھ سے یہ قلیل آزادی بھی نہ چھین لی جلتے مگر دوسرے ہی لمحے گنگل خان کا بھاری ہاتھ حرکت میں آیا اور ”چٹاخ“ کی زوردار آواز کمرے میں گونج گئی۔ میرے دائیں گال پر گنگل خان کے بھاری تھپڑ کا نشان چھپ گیا تھا۔

”خبردار! جو آئندہ کھڑکی کی طرف بھی گیا... ورنہ چیر کر رکھ دوں گا تجھے۔“ وہ وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔

”معاف کرو استاد! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ اپنے اندر کے غبار پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس کی منت کی۔ پھر وہ قریب کھڑے اشرف اور بالے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے حکمانہ بولا۔ ”سنبھالو اپنے لہڈے کو... اسے میں نے تم دونوں کی سفارش پر باہر نکالا ہے۔ اب اگر اس نے دوبارہ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس کے ساتھ تم دونوں کی بھی خیر نہ ہوگی۔“

اشرف اور بالا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئے اور مجھ سے مجھے بستر پر ترخ دیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یہ کیا کر رہے تھے تم۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گے۔“ اشرف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

بالے نے بھی مجھ پر برہمی نکالتے ہوئے کہا۔ ”کان

سکھول کر سن لوشہزی، اب اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو جہیں دوبارہ قیدی بنا دیا جائے گا سمجھے تم۔“

”یار! ہم آزاد کب ہیں؟“ میں نے بستر پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اب مجھے اپنے غبار پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور میں بالآخر پھٹ پڑا تھا۔“ یہ بھی کوئی زندگی ہے تمہاری؟ جو قید سے بھی بدتر ہے۔ یہ غلامی کی زندگی ہے۔ کیا تم دونوں کے ضمیر مردہ ہو گئے ہیں؟ یہاں اتنے معصوم لوگ قیدی بنا لیے گئے اور ہر روز ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ تمہیں ان معصوموں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا؟ اللہ سے ڈرو۔ وہ گناہگار اور تمہارے جیسے ضمیر فروشوں کی رسی دراز ضرور کرتا ہے مگر ذہیلی نہیں کرتا۔ جب کھینچتا ہے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ وقت کے آنے سے پہلے خدارا سنبھل جاؤ اور میرا ساتھ دو۔ یہاں معصوم جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ جن کی پاک دامن کو یہ مکروہ شیطان لوگ کھلونا بنا کر کھیلتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے پر یہ گناہ بھی تمہارے سر جائے گا۔ تم بھی ان کے برابر کے شریک گناہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لو۔ اور مجھے بتاؤ، کل رات ان پانچ معصوم جوان لڑکیوں کو کہاں لے جایا گیا ہے جن میں عابدہ بھی شامل تھی۔“ میں کہتے کہتے ہانپ گیا۔ وہ دونوں بے غور میرے چہرے پر نظریں جمائے... کھڑے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اشرف میری طرف چند قدم بڑھا اور ایک ٹانگہ بستر پر جما کر قدرے جھک کر مجھ سے بولا۔

”تم کس ضمیر نام کی چڑیا کی بات کر رہے ہو، شہزی! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کا ضمیر کہاں سو گیا تھا، جو ہمیں جہنم دینے کے بعد یہاں پھینک گئے تھے۔ تم بھی تو تھے، تمہارا تو اپنا سا گناہ باپ تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ہمیں یاد ہے تم سے جب ملنے آتا تھا تو کس طرح مگر مجھ کے آنسو بہایا کرتا تھا۔ پھر اس نے آنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ دنیا صرف اپنے اپنے مفادات کو عزیز رکھنے کا ٹھکانا ہے۔ رہی بات آزادی کی تو ہم اب بھی آزاد ہیں۔ کھلا کھاتے بیٹے ہیں۔ موج کرتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد ہمیں باہر بھی آزادی سے آنے جانے دیا جائے گا۔“

اشرف نے اپنی بات پوری کی... تو بالا بھی میری طرف بڑھا۔ اور بولا۔ ”عابدہ کو بھول جاؤ، ہوش کے ناخن لو۔ اور وہی کرو جس کا یہ لوگ حکم دیں۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ کس قدر طاقت ور ہیں اور یہی طاقت ہی عیش و آرام کی

آوارہ گرد زندگی کی ضمانت ہے۔ تمہیں بھی ہمارا یہی مشورہ ہے، بے وقوفی کی روش چھوڑ دو۔ ان کے ساتھ پنگانہ کرو، پھر دیکھو تم کس طرح عیش اور مزے کرو گے۔“

ان دونوں کی باتوں پر مجھے از حد افسوس ہوا، جب مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ عارضی عیش و آرام نے ان کو بے حس بنا دیا تھا، ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا تھا۔ انہیں مزید سمجھانا بے کار تھا۔ اس لیے میں نے بھی چپ سادھ لی مگر وہ دونوں خاموش نہیں ہوئے۔ اشرف بولا۔ ”دیکھو شہزی! اگر تمہارے یہی خیالات ہیں تو کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے ہم سے دور ہو جاؤ۔ بے شک ہم بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں مگر اب حالات مختلف ہیں۔ اب ہمارے بیچ مفادات کی جنگ چھڑ چکی ہے۔ ہم تمہیں صاف صاف یہ بات بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر تم نے ذرا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو استاد گنگل یا ان کے حواریوں سے پہلے ہم دونوں تمہیں کڑی سزا سے دوچار کر دیں گے۔ ورنہ تمہاری وجہ سے ہمیں ان لوگوں کا عتاب سہنا پڑے گا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے بھی تم ہمارا خود پر بہت بڑا احسان سمجھو کہ تمہیں پہلے سے آگاہ

**Alternative & Integrated medicine**  
**B2C Online**

علاجی اور قدرتی اجزاء سے تیار کردہ اور ذیل میڈیسن اب آپ گریٹ بھائی کے پاس

1- **فریشنی کورس برائے خواتین** ہانچا اور بے اولاد خواتین کے نسوانی اعضاء اور بچوٹے و کزوراءوں کو طاقت دے کر قابل اولاد بناتا ہے۔ خون کی کمی اعصابی و جسمانی کمزوری و بچوں کی کمزوری اور کمزور کے لئے بے حد مفید اور موثر ہے۔ بے اولاد خواتین کے لئے امید بہار پورے اعزاء کے ساتھ منگوا سکتے ہیں۔

2- **فریشنی کورس برائے مرد حضرات** مردوں میں بڑھوسوں کی کمی اور کمزوری کو دور کرنے کے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

3- **شادی کورس** سرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے ناکل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کورس۔ اس کے بعد اطمینان سے شادی کیجئے

4- **ازدواجی کورس** شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی توت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لئے موثر ترین کورس

5- **دوائی کورس** جن خواتین و حضرات کے دل و دماغ ہر وقت پریشان رہتے ہیں ان کے لئے قدرتی اجزاء سے تیار کردہ اعلیٰ ترین علاج۔ دل و دماغ کو توت دیتا ہے یادداشت اور حافظہ کی کمزوری کیلئے بہت مفید اور موثر ہے

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین  
 ایم بی بی ایس (پی ایس سی آنرز)  
 معائنہ نسوانی۔ ازدواجی مسائل و باہر بچن

نزدیکیوں کے کراسنگ گورڈ جھنگ صدر  
 03216528001. 03008652456  
 email: b2cteleshop@gmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک بتادو

تین دیہاتی بس میں سوار ہوئے۔ بس میں رش کی وجہ سے ان میں سے ایک چھت پر چڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے باقی جو دو بس کے اندر تھے۔ پوچھا۔ ”کنٹی سواری؟“ ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ ”ایک بٹے دو۔“ کنڈیکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“ دیہاتی پھر بولا۔ ”ایک اوپر، اور دو نیچے۔“ (مرسلہ: مسعود افضل کراچی)

واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ میں کچی کچی نیند کے زیر اثر رہا اور غالباً دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ شور سے میں جاگ پڑا۔ کھڑکی کے راستے کسی گاڑی کی تیز روشنی میرے کمرے کی اندرونی دیوار پر بڑا سا روشن ہالہ بنا کر غائب ہو گئی۔ میں بستر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کار ایک جیپ۔ بغیر ہڈ والی جیپ کے اندر سے حواری اترے، ان میں اشرف بھی تھا، بالائے نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب اسلحہ بردار تھے۔ جیپ میں دو حواری اور اشرف سوار تھے، وہ جیپ سے اترے اور کار کی طرف لپکے۔ کار کے اندر سے بھی دو حواری اترے۔ عقبی دروازہ کھلا۔ اور کسی شخص کو بازوؤں سے پکڑ کر باہر نکالا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے اور وہ معمولی زخمی نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی خیال میرے ٹھکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ لوگ کہیں مارا ماری کر کے کسی کو زبردستی اغوا کر لائے تھے۔ مگر بالے کو غائب پا کر مجھے تشویش ہی ہونے لگی۔ میں نے اپنے کمرے کی لائٹ گل کر رکھی تھی اور واپس بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور اشرف کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد اشرف تھکا تھکا سا لوٹا۔ اس کے چہرے سے فحش اور خوشی کا جوش بھی تھا اور بھیجی بھی آنکھوں میں دکھ بھی۔

”بالا کدھر ہے؟“ میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ اندر آتے ہی میں نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں؟“ وہ مجھ سے قدرے چونک کر بولا اور تھکے تھکے انداز میں اس نے گن دیوار سے لٹکادی۔

”میری بات کا جواب دو۔“ میں نے سرد نظروں سے اسے گھورا۔

”جوڑ گیا، وہ مر گیا۔“ اشرف فلسفیانہ لہجے میں بہ

اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے چہرے پر وہ جوش اور مسرت نہیں تھی جو اشرف کے چہرے سے واضح تھی۔ اس کی جگہ پریشانی اور خوف آمیز تشویش طاری تھی۔ ”کیا بات ہے بالے؟ تم اس مہم پر جانے سے خوش نہیں نظر آتے؟“ میں نے دانستہ اسے بھی کریدا۔ میری بات کا جواب دینے کے بجائے صرف ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اشرف سے مخاطب ہوا۔

”کیا تم نے اسے بتا دیا ہے؟“

”میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر یہ صرف اتنا ہی سمجھ سکا ہے۔“ اشرف بے پروائی سے بولا۔ ”زیادہ تفصیل نہیں بتا ہے۔“

”ہمیں فالتو راؤنڈز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے، اشرف! بالاجگہ سے پہلو تہی کرتے ہوئے یہ دستور اشرف سے مخاطب رہا۔ اس کے لہجے سے بددلی اور کٹی عیاں تھی۔

”اب ان کے ساتھ رہتے ہوئے یہ تو کرنا پڑے گا۔“ اشرف کا انداز بہ دستور لالہ لالی تھا۔

”یہ ہمیں قربانی کا بکرا بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس مہم میں۔“ بالانے اسے ہوش دلایا۔

”ہم اکیلے کب ہیں۔ یہ لوگ بھی تین سے چار ہوں گے۔ تم ایسے ہی خوف زدہ ہو رہے ہو۔ استاد ہمیں ٹرینڈ کرنا چاہتا ہے، ایسی مہمات میں بھیج کر۔ میں استاد کو جانتا ہوں، چلے ہوئے کارتوسوں کے علاوہ وہ نئے کارتوسوں پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد مجھے پورا یقین ہے ہماری حیثیت بدل جائے گی۔ پھر استاد گنل خان کے سوا کوئی ہم پر رحم نہیں چلا سکے گا۔“

”اگر اس مہم سے زندہ بچے تو۔“ بالانے کہا۔

جب رات سر پر اتری تو وہ دونوں اپنی گنیں تانے کمرے سے نکل گئے اور جاتے ہوئے کم بخت حسب معمول باہر سے دروازے کو بولٹ کر گئے۔ میرے اندر... ساری رات پچھل مچی رہی۔ بتا نہیں یہ لوگ کیسی مہم پر گئے تھے؟ اور کیا بد خصلت گنل خان واقعی اشرف اور بالے کو اس خطرناک مہم میں استعمال کرنا چاہتا تھا؟

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ کھڑکی کے راستے ہی میں سامنے آ کر کبھی کبھی باہر کا جائزہ لے لیا کرتا تھا جہاں چند حواریوں کے گشت کرنے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ باقی عمارت میں اندھیرا تھا۔ وسیع و وسیع میدان تھا۔ احاطے میں روشنی نظر آتی تھی۔ میں

کے ساتھ اس سے پوچھا۔ وہ اس وقت خوشی کے نشے سے چور تھا، بولا۔ ”استاد نے دی ہے۔ یہ اب میری ملکیت ہے۔ یہ پہلا موقع ہو گا کہ آج رات استاد مجھے اپنے ساتھ ایک خاص مہم پر لے جا رہا ہے۔“ فخر و انبساط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں ہم والی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا اور پوچھ بیٹھا۔

”مہم؟ کیسی مہم؟“

”تم سے مطلب؟ اپنے کام سے کام رکھو تم۔“ وہ یکدم سنبھل گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ پھر گن ایک طرف دیوار سے ٹکا کر رکھ دی۔ میں نے اس کی تعریف کر کے ہونے کہا۔

”واہ... میرے پار! لگتا ہے تمہاری خوب ٹور ہیں گئی ہے مگر تمہیں تو یہ گن چلانی نہیں آتی۔“

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے گن نہیں چلانی آتی۔“ وہ میری طرف گھور کر بولا۔ ”یہ کلاشکوف ہے، سب سے خطرناک گن مگر استعمال میں بھی سب سے آسان۔ صرف اس کا میگزین سمجھ کر بھی اسے بہ آسانی چلایا جا سکتا ہے۔“

”اچھا!“ میرا انداز بہ دستور تو صیغی تھا۔ ”کیا تم نے سمجھ لیا اسے چلانا؟“

”ہاں! یہ دیکھو...“ اس نے فخر سے کہا اور دو بار گن اٹھالی۔ پھر مجھے بتانے لگا کس طرح میگزین اٹھایا جاتا ہے۔ کب اور کیسے اسے برسٹ اور سنکل شاٹ پر سیٹ کر کے فائر کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں نے اس کے ہاتھ سے گن بھی لی، وہ خاصی وزنی تھی۔ اسلحہ اٹھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ کسی آتشیں ہتھیار کا لمس پاتے ہی اپنے آپ مجھے ایک طاقت کا نشہ محسوس ہونے لگا۔ یہی تو وہ ایک طاقت تھی جو اگر کمزور اور لاغر انسان کے ساتھ ہو تو وہ اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور اور زور آور پر غالب آ سکتا ہے۔ پھر اس نے گن میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ دیوار سے لٹکادی۔ پھر اپنی گنیں اوپر کو اٹھادی۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی شلوار کے نیچے میں چار پانچ فالتو میگزین بھی اڑے ہوئے تھے۔

”واہ میرے پار! تم تو بڑے دھانسو انسان بن گئے ہو۔“ میں اس کی تعریف کرتا رہا اور وہ مسرور سا وہ سب بتاتا رہا جو میں اس سے جانتا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا بالاجگہ اس کے ہمراہ تھا۔ پانچ حواری اور تھے۔ تھوڑی دیر گزری بالاجگہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ مگر میں

کر رہے ہیں۔“

اس کی بات پر میں نے نفرت سے دونوں کی طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ملتویانہ لہجے میں بولا۔

”خدا کے لیے... مجھے عابدہ کے بارے میں بتا دو... اسے کدھر لے جایا گیا ہے۔“

”ہمیں نہیں معلوم...“ بالاجگہ جھٹک کر بولا۔ ”اگر پتا ہوتا بھی تو ہم تمہیں کیوں بتاتے۔“ اس کے بعد کمرے سے جاتے جاتے آخر میں بالے نے کہا۔ ”اب ہمیں تمہیں بھی اپنی نگرانی میں رکھنا پڑے گا۔“ پھر دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔



دونوں جاتے جاتے باہر سے کراہتد کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کمرے سے باہر نکلنا چاہا تو وہ باہر سے بند پایا۔ میں دوبارہ اپنے بیڈ پر آ بیٹھا۔ عابدہ کی طرف سے مجھے شدید بے چینی اور تشویش ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں ان خبیث شیطانوں نے عابدہ سمیت ان پانچوں لڑکیوں کا کیا حشر کیا تھا؟ مجھے سخت پچھتاوا سا ہونے لگا کہ میں اس سے پہلے کچھ نہ کر سکا اور اب بھی کیا کر رہا تھا۔ کیا تھا میرے بس میں...؟

میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہونے لگیں۔ میرے اندر خطرناک و جارحانہ جذبات ابھرنے لگے۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب میرے پاس وقت نہیں رہا تھا کہ میں کسی موقع کا انتظار کروں یا کسی چال کو بروئے کار لاسکوں۔ یہ لوگ میری سوچ سے بھی زیادہ مکار ہوشیار اور محتاط ثابت ہوئے تھے۔ یہی وقت تھا کچھ کرنے کا۔ فیصلہ کن عملی قدم اٹھانے کا۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر شام اتر رہی تھی اور میری بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں اس طرح ٹھہلنے لگا جیسے سب کچھ میرے حکم کے ایک اشارے پر منتظر ہو مگر میں تو خود حکم کا غلام تھا۔

جب باہر شام گہری ہونے لگی تو اشرف اندر داخل ہوا... بالاجگہ کے ہمراہ نہیں تھا مگر میں اشرف کو دیکھ کر چونک پڑا۔ کیونکہ میں نے آج پہلی بار اس کے ہاتھ میں ایک کلاشکوف رائفل دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ مسرور سا نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار گن پر یوں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے وہ اس کا کوئی بہت ہی پالتو جانور ہو۔

”یہ گن کہاں سے لی تم نے؟“ میں نے دھڑکتے دل

ظاہر ہے پروائی سے بولا۔ مگر میں محسوس کر سکتا تھا، اس کا لہجہ کچھ ڈبڈبایا ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ کام آگیا۔ مر گیا وہ۔“ اشرف نے.... سینگ دلی سے کہا۔ مگر اس میں کاٹ دار غم بھی تھا اور حالات کی تلخی بھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ کچھ بھی تھا، بالے کا ہمارا ساتھ بچپن کا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب پہلی بار میں یہاں لایا گیا تھا تو اس کے چند دنوں بعد بالترتیب بلال اور اشرف بھی لائے گئے تھے۔ پہلے روز گھبرا کر وہ دونوں روتے رہے تھے۔ میں نے ہی انہیں بہلانے اور باتیں کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ہم محل مل گئے تھے۔ بنیادی طور پر تو ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہمارا بچپن ایک سچ اور عبرت ناک سبق سے شروع ہوا تھا۔

”تمہیں افسوس نہیں ہوا اشرف؟ بالا ہمارا بچپن کا دوست تھا۔“ میں نے اشرف کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یار تھا وہ ہمارا، بھلا دکھ کیسے نہیں ہوگا مگر شاید اس کے مقدر میں اس طرح کی موت لکھی تھی۔“ وہ بولا۔

”تم تو مقدر کو مانتے ہی نہیں تھے، اب مقدر کا خیال کیسے آ رہا ہے تمہیں؟“ میرے لہجے میں طنز تھا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

”اچھا یار اب سو جاؤ، دماغ مت خراب کرو۔ جاؤ! اپنے بستر پر۔“ اشرف بیزار کن برہمی سے بولا۔

”تم کس کو اغوا کر لائے ہو؟“

”تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“

”یار! خفا کیوں ہوتے ہو؟ اب تو صرف ہم دونوں ہی پرانے دوست باقی بچے ہیں۔ بالا تو گیا بے چارہ۔“

میری بات پر اشرف غم سے پھٹ پڑا۔ اسے واقعی بالے کی موت کا دکھ تھا مگر اپنی فطرت سے بھی مجبور تھا۔ یہ جراثیم پیشہ لوگ شاید اس کی مجبوری بن چکے تھے مگر شاید اس کے اندر تھوڑی بہت انسانیت باقی تھی۔ وہ بے اختیار میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میرے خیال میں اس طرح کے جذبات سے اشرف کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”یار! تو بار بار بالے کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ سب کو مرنا ہے آخر ایک دن۔“

وہ شاید اس طرح کہہ کر خود کو ڈھارس پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کیا اور بولا۔ ”ہاں، مرنا تو آخر سب کو ایک دن ہے ہی مگر اس طرح نہیں۔ دیدہ و دانستہ خود کو موت کے منہ میں

پھینکنا، خودکشی کے ہی مترادف ہے۔“

”تو چپ نہیں رہ سکتا آج کی رات؟“ وہ برہمی سے لہجے میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”اشرف! چھوڑ دے۔“

سب کچھ۔ ایسے کاموں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میری مدد کر۔ میں اپنی ذاتی غرض و غایت کے لیے تم سے مدد نہیں مانگ رہا۔ یہاں موجود محسوم اور بے گناہ قیدیوں کی آزادی کے لیے تم سے مدد اور تعاون کا خواہاں ہوں۔“

”میں بہت دور نکل چکا ہوں، شہزی! میری واپسی ناممکن ہے۔ میں اپنی اس دنیا میں خوش ہوں۔“ وہ بولا۔

”خبردار تم کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا کہ مجھے اپنی گنہگار پر بھی اٹھانی پڑ جائے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔“

اگلے دن اشرف نے میرے لیے ایک نیا حکم نامہ تیار رکھا تھا۔ ”استاد نے اس نئے قیدی کی نگرانی تمہارے حوالے کی ہے۔“

”اچھا۔“ میں طنز آمیز حیرت سے بولا۔ ”بھلا ایک قیدی دوسرے قیدی کی کیا نگرانی کرے گا۔“

”زیادہ۔۔۔ بکو اس کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ جھلا کر بولا۔ میں سچ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

مجھے کیا کرنا تھا، یہ سب اشرف نے مجھے سمجھا دیا تھا۔ میں وہاں پہنچا جہر مغوی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ یہ اس پورشن کا حصہ تھا جہاں پہلے بوڑھوں کو رکھا جاتا تھا۔ انہیں نکالنے کے بعد یہ حواریوں کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں مغوی کو قید رکھا گیا تھا۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ مغوی کے سوا کمرے میں سے خالی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھے گئے تھے اور ایک کونے میں وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کئی عمر کا مرد تو نہیں کہا جاسکتا تھا، مجھ سے کچھ سال ہی بڑا تھا۔ جسم چھریا تھا۔

موچھیں باریک، ہلکے بال، رنگ سانولا قدر درمیانہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ایک عجیب بات جو اس کی شخصیت میں میں نے محسوس کی تھی، وہ نڈر اور دلیر معلوم ہوتا تھا۔ یہ میرا اس کے بارے میں ایک عام سا اندازہ تھا۔ وہ مغوی تھا اور یقیناً یہ کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہو سکتا تھا۔ کل رات اسے ایک خطرناک مقابلے میں اغوا کر کے ہی لایا گیا تھا مگر باوجود اس کے خوف کا ایک ذرا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہ تھا۔

مجھے یوں اپنی جانب بہ دستور تکتا دیکھ کر وہ شاید

میری ناخبرہ کاری کو بھانپ گیا۔

”تو ان کے قبیل کا تو نہیں لگتا۔ کیا نام ہے تیرا کا کے؟“ اس کی بات پر میں کچھ گڑبڑا گیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

”شہزی!“ وہ مسکرایا۔ ”یہ کیسا نام ہے بھلا۔ آدی تو زبردست نظر آتا ہے پھر یہ شہزی، ویزی...“ وہ ہنسا۔

”شہزاد احمد خان نام ہے میرا۔“ میں نے اس بار جے ہوئے لہجے میں اپنا پورا نام بتایا۔

”شادا...“ یہ ہوئی نہ بات۔ شہزاد احمد خان، یعنی... شہزاد کیوں شہزادے۔ کب سے ہے ان لوگوں کے ساتھ؟“

”اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟ ان لوگوں کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“

”آخر...“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میرا نام پوچھتا ہے، سن اول خبر نام ہے میرا۔ سچ تو میں ان کا نہیں ہوں نہ ہی یہ میرے۔“

بڑا عجیب سا نام تھا اس کا۔ میں نے پوچھا۔ ”میرا آخری سوال تم گول کر گئے۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں معاملہ دشمنی کا ہی ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”دشمنی والا معاملہ بہت لمبا ہے۔ تیری سمجھ میں آنے والا نہیں۔ تو بتا چودھری ممتا نہ جانتا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر تلخی میں سر ہلایا۔

”سردار الف خان کو؟“

”نہیں۔“

”نئے پنڈ کا نام سنا ہے؟“

”نہیں۔“

”قسم مولا کی تو ان کا آدی بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان کا وفادار... تو تو مجھے خود ان کا قیدی نظر آتا ہے۔“

میرے بارے میں اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ وہ مجھے گھاگ آدی لگا۔

”کیوں شہزادے؟ میں نے غلط تو نہیں کہا۔“

”آخر...“ چودھری ممتاز اب بے سنج اور گھٹیا کام بھی کرنے لگا ہے۔ حیرت ہے۔ یہ بتانا یہاں آیا ہے یا بھیجا گیا ہے، مجھے میرے پاس؟“ او بھرتا می شخص نے جیوس سیکڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں بدیکھا۔

”مجھے بھیجا گیا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر...“ یہاں بیٹھ میرے پاس۔

”میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھ پر بھی نظر لگنی ہے۔“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرے عقب ہاتھ سے دروازہ کھلا۔ میں چونک کر پلٹا۔ وہاں اشرف تھا۔ گن ہر وقت اس کے پاس یوں رہتی تھی جیسے سچے راتھ اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا ہو۔ اس نے ایک تیزی لہجے میں مجھ پر پھر اول خبر پڑائی۔ پھر درستی سے میری طرف لہ کر بولا۔ ”تم کیا باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ؟“

”کچھ نہیں۔“

”کیا مطلب کچھ نہیں۔“ وہ تھمڑ دشتی سے بولا۔

”استاد نے تمہیں یہاں اس کی نگرانی لینے بھیجا ہے، اس کے ساتھ بات چیت کے لیے نہیں... مجھے تم؟“ مجھے اشرف کا یکدم یوں مجھ پر حاکمانہ اندازہ برہم ہونا انتہائی ناگوار گزرا۔

”کچا ہے تو ابھی کرائے کے ٹیوہ تیری بات میں، تیرے لہجے میں ابھی وہ مردوں والی گرج نہیں آئی۔“

اول خیر تفحیک آمیز لہجے میں اشرف کاف گھور کر بولا۔

”کیا تمہارا وہ زر خرید استاد گنگل خان بھنگل خان اتنا ہی کم عقل ہے کہ اس نے ایک قیدی نگرانی کے لیے دوسرے قیدی کو یہاں بھیج دیا۔“

اس کی بات سن کر اشرف کے چہ پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں کمرے سے باہر آگئے، اندر سے اول خیر کا تہنائی دیا۔ اشرف نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر یکتخت اس لیے بدل گیا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ ناف کرنا یار، یہ میری مجبوری تھی۔“

”کیا مطلب کیسی مجبوری؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دوستانہ اندازہ میں اسے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”آؤ میرے پاس۔“

وہ مجھے لے کر گنگل خان کے پانچا۔ خلاف توقع

گگل خان اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور اس کے چہرے پر برہمی کے آثار کبھی نہیں تھے۔ اشرف نے آگے بڑھ کر فوراً اس کے کان میں کچھ کہا جس پر گگل خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”دیکھو شہزی! تم ہماری وفاداری کا دم بھرتے ہونا۔ اس لیے تم پر ہمیں بھروسہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اس قیدی کی نگرانی کے لیے بھیجا تھا۔“ وہ لمحہ بھر کورکا۔ اس کا لہجہ مجھے پراسرار محسوس ہوا

وہ بستر سے اٹھا اور چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا عام سا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا۔ شاید وہ سونے کی تیاری میں تھا۔ میرے کاندھے پر اپنا بھاری بھرم ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”دیکھو کا کا! اشرف تمہاری بہت سفارش کرتا ہے کہ تم کبھی نہ کبھی ہمارے کام آسکتا ہے۔ شاید اس کا وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے اندازہ ہے اس بات کا کہ تم اب بھی خود کو ہمارا قیدی سمجھتے ہو۔ حالانکہ مجھ سے ہم نے بیگار لینی بھی چھوڑ دی ہے مگر اب اس کے صلے میں تم نے ہمارا ایک اہم کام کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے اس قیدی کے ساتھ کیا باتیں کی ہوں گی۔ ضرور اپنا بھی دکھڑا سے سنایا ہوگا کہ خود تیری اپنی بھی حیثیت یہاں ایک قیدی کی سی ہے اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔“ مجھے حیرت کا جھکا لگا۔ وہ بہت مکار اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ جس بات پر میں حیرانگی محسوس کر رہا تھا، وہ اس کا پہلے سے علم رکھتا تھا۔ آگے بولا۔

”تم نے ابھی ہمارا بس اتنا ہی کام کرنا ہے کہ اس قیدی کے ساتھ اسی طرح ہی خفیہ قسم کے ہمدردانہ تعلقات قائم رکھو۔ اس طرح کہ بہت جلد وہ تمہیں اپنا راز داں سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بہت جلد تمہاری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے اور وہ تمہارے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی مشترکہ منصوبہ بندی کرنے پر بھی آمادہ ہو جائے۔“ وہ رکا۔ میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ بات سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی فی الحال تم اتنا کرو باقی ہدایت تمہیں ملتی رہے گی۔ لیکن خبردار کسی چالاک کو دل میں مت لانا، میرے پاس کام نکلوانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ نہ ہی مجھ سے جوٹی باتوں کا تبادلہ کرنا۔ جو باتیں اس کے ساتھ تم ملے کرو گے اس سے مجھے آگاہ کرتے

رہو گے... سمجھے تم؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے مجھے رخصت کر دیا۔ اشرف کو گگل خان نے اپنے پاس روک لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

یہ سب کچھ اتنا سیدھا اور آسان نہ تھا، جو گگل خان نے مجھ سے کہا تھا۔ درون خانہ کچھڑی اور ہی پک رہی تھی، گگل خان اتنا سیدھا آدمی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرنے لگتا مگر یہ سچ نظر آتا تھا کہ وہ موقع محل کے مطابق مجھے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ قیدی اول خیر سے مجھے قریب ہونے کا موقع دینا اگرچہ اس کے کسی خفیہ مفادات کا حصہ ہی تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ہماری گفتگو کی بھی نگرانی کی جاتی ہوگی۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ میرے لیے کچھ کرنے کا اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میری اپنی مرضی بھی یہی تھی، اول خیر کی مدد سے یہاں سے صرف ایک بار فرار ہو جاؤں۔ اندر سے باہر کی دنیا کا باسی بن جاؤں اور کسی طرح سرمد بابا سے چالموں۔ اس کے بعد ان سب کا شیرازہ بکھر جائے گا اور عابدہ کا بھی ان کی گرفتاری کے بعد سراغ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ مگر یہ سب کرنے کے لیے مجھے ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔

یہ اس روز رات کا ذکر تھا۔ اشرف کافی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں دانستہ سوتا بن گیا۔ پہلو کے بل لیٹے ہونے کے باعث میں پیچی پیچی آنکھوں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ گن اس نے دیوار سے لٹکا دی۔ چند ثانیے کے بعد میری طرف تکتا رہا۔ میں بے بغیر لیٹا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے گہری نیند میں سونے رہنے کا یقین کر لیتا چاہتا ہو کیونکہ اس نے مجھے ہولے سے دو تین بار پکارا بھی تھا مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کے مجھے ہولے ہولے انداز سے پکارنے کا مطلب ہی میں سمجھ گیا تھا۔

جب اسے تسلی ہوئی تو وہ اپنی جیبیں خالی کرنے لگا۔ جن میں رومال، کچھ روپے اور چابیاں بھی تھیں نیچے کے نیچے اپنی جیب کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ادھ کھل آنکھ سے دیکھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون نظر آیا جسے دیکھتے ہی میرے اندر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے بھی اپنے نیچے کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔ اور سیٹھ منظور وڑائج المعروف سرمد بابا کا سیل نمبر میرے دماغ میں گردش کرنے لگا جو مجھے

ابھی تک از بر تھا۔ ایک خطرناک سنسناتا ہوا خیال میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ سیل فون ہم سب کی آزادی کا بگل بجا سکتا تھا مگر کیسے؟ کیا یہ اتنا ہی آسان کام تھا؟ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ مشکل کام کے بغیر یہاں سے آزاد ہونا بھی ممکن نہ تھا اور مجھے یہ مشکل اور خطرناک کام آج رات ہی کو کرنا تھا۔

کمرے میں میرے ساتھ صرف اشرف تھا جو اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے سیل فون کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس قید خانے کی چابی تھی۔ یہی سب تھا میری رگوں میں یکھٹ خون کی گردش تیز تر ہونے لگی تھی۔

ہر سو خاموشی طاری تھی۔ ایسی خاموشی جیسے اچانک کوئی بڑا طوفان اٹھنے والا ہو۔ میرے اندر دلچسپی ہوئی تھی۔ یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا دورانیہ میرے لیے گویا صدیوں کے برابر محسوس ہوا تھا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ اور لیٹے لیٹے کروٹ کے بل ساتھ والے بستر پر اشرف کو پشت کے بل سوتے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ وہ خراٹے لینے کا عادی تو نہ تھا مگر اس کے سینے کا زیرو ہم بتاتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

تب میں آہستگی کے ساتھ اٹھا۔ میں ایک خطرناک قدم اٹھانے چلا تھا۔ اس سے پہلے اللہ کا نام لینا نہیں بھولا تھا۔ جب میں آہستگی کے ساتھ اپنی چار پائی سے اٹھا تو وہ ہولے سے چڑھائی تھی۔ کمرے میں پاور والا بلب روشن تھا۔ کھڑکی بندھی سردی کا احساس بھی کچھ کم تھا۔

میں آہستگی سے آگے بڑھا اور قدرے جھک کر ایک ہاتھ اشرف کے نیچے کھسکا دیا۔ اچانک اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، میرا دل جیسے دھڑکنے لگا۔ وہ جاگا نہیں تھا۔ میری طرف اس نے گردٹ لی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ نیچے کے نیچے سے کھینچ لیا۔ پھر اس کے سر کے پچھلے حصے کی طرف سے نیچے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو میری مرتعش آنکھوں سے سیل فون نکلا گیا۔ میری آنکھوں میں مخصوص چمک ابھری۔ نہایت آہستگی کے ساتھ میں نے سیل فون نکال لیا۔

مجھے اعتراف تھا کہ سیل فون جیسی شے کو آج میں پہلی بار چھو رہا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مجھے اس کے بارے میں بالکل ہی پتا نہ تھا۔ یہ میں نے آپاچی کے علاوہ اس وقت کے عملے کے چند افراد کے پاس بھی دیکھا تھا اور اس کے استعمال کا بھی مجھے علم تھا۔ میں سیل فون قبضے میں

کر کے سیدھا ہاتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے پہلے تو یہ مشکل اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پایا پھر اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ سرمد بابا کے سیل فون کا نمبر سچ کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت سرمد بابا بھی گہری نیند میں تھے یا اپنے موبائل فون کی نیل پر وہ اسے رات کے اس درمیانی پہر اٹینڈ بھی کریں گے یا نہیں۔ اگر میں موقع نہیں گنوا سکتا تھا۔ نمبر سچ کرنے کے بعد میں نے فون کان سے لگا لیا مگر دوسرے ہی لمحے میرا دل مایوسی سے بھر گیا۔ مجھ پر شدید جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔ کیونکہ دوسری طرف سے پاور آف ہونے کی اطلاع مل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا اب کیا کروں؟ یہ فیصلہ کن گھڑی تھی موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا۔ اب نہیں تو بھی نہیں کے مصداق۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میں جتنی جلدی لکھ سکتا تھا، سرمد بابا کے سیل فون نمبر پر ایک ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کر دیا۔ زیادہ تفصیل تو نہیں لکھ سکتا تھا تاہم دریا کو کوزے میں سموتے ہوئے مختصر اصراحت کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو تین ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کر دیے۔ اس کے بعد میں نے سب کچھ مٹا دیا۔ کیونکہ یہ سیل فون میرا نہیں تھا، اشرف کا تھا اور یقیناً یہ گگل خان کا ہی ہوگا۔ وہ اب شاید اشرف پر مکمل بھروسہ کرنے لگا تھا۔ اشرف کا سیل فون ہاتھ میں پکڑے میں سوچتا رہا۔ فوری طور پر مدد کے لیے اور کسے فون کرنا چاہیے تھا؟ سرمد بابا کے سوا کسی کا نمبر مجھے نہیں معلوم تھا۔ میری معلومات بھی محدود تھی کہ کسی ایمر جنسی کال نمبر پر مدد لے سکتا تاہم مجھے امید تھی، سرمد بابا جب بھی یہ ایس ایم ایس پڑھیں گے فوراً حرکت میں آجائیں گے میں نے احتیاطاً آخر میں انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سیل چوری چھپے حاصل کر کے استعمال کر رہا ہوں لہذا دوبارہ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہوگا اس لیے آپ جو کارروائی کر سکتے ہیں کر لیں۔

دل کو کچھ تسلی ہوئی اب میں یہ سیل فون اسی طرح خاموشی کے ساتھ دوبارہ اشرف کے نیچے رکھ دینا چاہتا تھا تا کہ میری یہ ”مہم جوئی“ مکمل طور پر خفیہ رہ سکے، چنانچہ یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا تو بری طرح ٹھنک گیا۔ سامنے اشرف کھڑا میری طرف زہر ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ شاید رات کے کسی پہر جاگ چکا تھا۔ ممکن ہے اسے بھی کوئی فطری حاجت محسوس ہوئی ہو اور وہ دروازے کے

باہر میرے نکلنے کا منتظر تھا، مگر میرے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کر اسے صورت حال کا ادراک کرنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔

”میرے سیل پر کس سے بات کر رہے تھے تم؟“ وہ خطرناک لہجے میں بولا اور ساتھ ہی جھپٹ کر اپنا سیل فون میرے ہاتھ سے لے کر اس کا ڈیٹا چیک کرنے لگا۔ میرا بھانڈا پھوٹ گیا تھا مگر میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور اس نے کہا۔

”معاف کرنا یا! بس ایسے ہی ذرا کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔“

میرا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا، اس نے نفرت سے ہونٹ بھینچ کر میرے چہرے پر پھپھڑا کر دیا اور غصے سے بولا۔

”اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میں جو پہلے ہی اس کے تھپڑ مارنے پر پھر چکا تھا کسی چیتے کی طرح غراتا ہوا اس پر جھپٹا اور ایک زبردست ٹھوکرا سے رسید کر ڈالی۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ میں اس پر پون ٹوٹ پڑنے کی جرأت و ہمت بھی کر سکتا ہوں۔ نتیجتاً وہ سنبھل نہ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ سیل فون ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گر اور کھل گیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کے وحیانیہ غراہٹ کے ساتھ میری طرف پلٹا اور مجھے ٹانگ رسید کرنا چاہی میں نے پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اپنے دفاع میں بے شک یہ میری لاشعوری حرکت تھی، جو موثر ثابت ہوئی تھی۔ اس کی پکڑ میں نے مروڑ ڈالی۔ مگر اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی اور ہم دونوں ایک بار پھر دست و گریباں ہو گئے۔

کامیابی کی خاطر میرا اشرف پر قابو پانا لازمی تھا۔ ورنہ وہ گنگل خان کے سامنے میرا راز فاش کر سکتا تھا۔ بڑی ہی اذیت ناک گھڑیاں اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد مجھے ایک خاطر خواہ کامیابی ملی تھی۔ میں جان لڑا کر بھی اپنی اس ”موقع“ کامیابی کو ضائع نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اشرف میرا ہم عمر اور ڈیل ڈول میں میرا ہم پلہ ہی تھا۔ مگر اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک نیک جذبے کا جوش جنون بن کر سایا ہوا تھا۔ میں اسے پوری قوت سے دھکیلتا ہوا بیڈ پر جا گرا۔ وہ اب میرے نیچے تھا، اس نے میرے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ درد کی لہر نے مجھے چند ثانیوں کے لیے ڈھیلا کر دیا۔ اس بد بخت کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ مجھے خود پر سے دھکیل کر یکدم دیوار سے لٹکی گن کی طرف لپکا۔ گن اس کے قبضے میں آ جاتی تو میں

بے بس ہو سکتا تھا۔ اپنی تکلیف بھلا کر میں بھی اس کی جانب لپکا۔ تب تک اس نے گن اچک لی۔ ابھی اس کا رخ میری جانب کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بے اختیار ٹانگ چلا دی، جو گن کی نال پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کا رخ بدل گیا۔ میری دوسری ٹانگ اس کے پیٹ پر پڑی جو زوردار ثابت ہوئی، جس نے اسے دھکیل کر دیوار سے ٹکرایا اور۔۔۔ گن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے اور تو کچھ نہ سوچا اس نے سنبھلنے ہی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ٹانگ آگے کر کے اڑنگا ڈال دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے پھرتی سے گن اٹھا کر اسے نال سے پکڑا اور لٹو کی طرح گھمادی۔

گن کا ٹھوس کنداز میں بوس اشرف کے سر کے عقبی حصے پر پڑا اور آواز نکالے بغیر وہ ڈھیر ہو گیا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرے نزدیک وہ بھی ظالموں کے ٹولے میں شامل تھا اور کسی رعایت کا مستحق نہ تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے بے سدھ وجود کو ٹانگوں سے پکڑا کر گھسیٹا اور بیڈ کے نیچے سر کا دیا۔ پھر اس کے نیچے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا۔ زمین پر پڑا اس کا سیل فون بھی اچک لیا۔ وہ ایک سستا والا سیٹ تھا جو گرنے سے کھل گیا تھا اور اس کی بیٹری باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے اصلی حالت میں لا کر آن کر دیا اور گن اٹھالی۔

انسان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ عملی میدان میں آنے کے بعد ہی ہوتا ہے جبکہ میدان عمل چھپی ہوئی صلاحیتوں کو از خود ہی جلا بخشنے ہیں۔ اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے رویں رویں میں بجلی بھرنی تھی، میں شاید درست وقت پر درست فیصلہ کر رہا تھا۔ میں اب گن سمیت، اول خیر کے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اسے میری مدد کی اور مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے وقت دیکھا، رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر جھری بنائی اور باہر جھانکا۔ سرد ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ جدھر اول خیر کو رکھا گیا تھا وہ مقام یہاں سے سامنے کی طرف چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ کسی حواری کی ناموجودگی کے آثار دیکھ کر میں گن سنبھالے باہر آ گیا اور تیزی کے ساتھ چھپتا چھپاتا ہوا اول خیر والے قید خانے کی عقبی دیوار سے جا چکا۔ چند ثانیوں میں گن لینے کے بعد میں دھیرے دھیرے گروپش کا جائزہ لیتا ہوا داخلی دروازے کی طرف سرکنے لگا۔ دوسری جانب دیکھنے پر مجھے مین گیٹ کے قریب چند سس حواری نظر آئے۔

اس طرف جانے کی مجھے بھی سختی سے ممانعت تھی۔ کمرے کے دروازے پر آ کر میں نے چابی لگائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم روشنی میں مجھے فرش کے وسط میں اول۔۔۔ مڑا تڑپا نظر آیا۔ شاید وہ گنگل خان وغیرہ کا کوئی خطرناک دشمن تھا اسی لیے اس کے ہاتھ پاؤں سخت قسم کے جکڑ بندوں میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ بے چارہ اس حالت میں ہی شاید سو یا پڑا تھا۔

ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو گیا۔ پھر مجھے پہچان کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”کا کے تو؟ خیریت ہے۔۔۔ اس وقت اور یہ گن؟“

”اول خیر! تیاری پکڑ میں تیرے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں پر مجھے دھوکا مت دینا۔ یہ صرف میرا نہیں ان کئی مظلوم اور معصوم قیدیوں کی آزادی کا سوال ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟“ میرے لب و لہجے میں عجب قسم کا جوش سرایت کر آیا تھا۔

”او خیر کا کے! میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ تو واقعی بہادر نوجوان ہے۔“ وہ تو صوفی لہجے میں بولا۔ ”ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ کر اول خیر کو احسان باش پائے گا احسان فراموش نہیں۔“

میں نے گن زمین پر رکھی اور جلدی جلدی اس کے جکڑ بند کھولنے لگا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے ایک انگڑائی لی اور سب سے پہلے گن پر قبضہ جما لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ بولا۔

”کا کا! تو ادھر ہی ٹھہر۔۔۔ میں چار کولنا کرتا ہوں۔“

”ٹھہرو۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ورنہ میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ ابھی وقت دھاری مٹھی میں ہے۔ دو چار کو مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ لوگ بہت خطرناک اور منظم حالت میں ہیں۔“

”کیا چاہتا ہے تو بول؟“ اول خیر بولا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اس سلسلے میں سرمد بابا کو فون کر چکا ہوں یعنی ان کے ذریعے انہیں یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر چکا ہوں۔

وہ سن کر بولا۔ ”کا کے! تیرے سے زیادہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ خطرناک ہی نہیں بااثر بھی ہیں۔ قانون کو خریدنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پولیس کا یہاں چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کوئی کالی بھیڑ نہیں پہلے سے خبردار کر دے گی۔“ وہ رک رک کر کچھ سوچ کر بولا۔ ”سیل فون تیرے پاس ہے اس وقت؟“

اوارہ گرد

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”ادھر لا۔ ابھی لوہے کو لوہے سے کاٹتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اسے تمھادیا۔

سیل فون لے کر اس نے فوراً ایک نمبر ملا لیا۔ رابطہ ہوتے ہی دبے دبے جوش سے وہ دوسری طرف کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر درمیان میں مجھ سے مخاطب ہو کر اس علاقے کا محل وقوع پوچھا جو میں نے اسے بتا دیا۔ اس کے بعد مزید تھوڑی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تم اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہے تھے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ کسی بھی وقت آمدنی طوفان کی طرح یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

مجھے تھوڑی تشویش سی ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”اس طرح جنگ کی صورت سے معصوم قیدی زد میں آسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا، اول خیر۔“

”او خیر۔۔۔ کا کا۔“ وہ مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”تو فکر نہ کرو۔۔۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو سب سمجھا دیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے، وہ آتے ہی ہلا بول دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ آؤ ہم تب تک اپنی کارروائی کرتے ہیں۔“ اس نے مجھے بھی شامل کر لیا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ میرا خیال تھا وہ ابھی جا کر گنگل خان سے بھڑ جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ باہر آتے ہی اس نے سب سے پہلے مجھ سے قیدیوں کے کمروں کا پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

”ان سب کو پہلے ایک جگہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ آؤ۔“ وہ بولا۔

ہر طرف صبح کا ذب کی ملگجی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ مسلح حواری۔۔۔ ہر طرف پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم دونوں اس وقت دیوار کے عقبی حصے کے ساتھ چپکے کھڑے تھے، ہمارے سامنے احاطے کی بلند وبالا دیوار تھی۔ یہی راستہ۔۔۔ گلی کی صورت میں تینوں ہال کمروں کی عقبی دیوار تک لے جاتا تھا۔

دفعاً ہمیں شور کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں بری طرح ٹھنک گئے۔ ”کا کا۔۔۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے شاید۔“ اول خیر نے ہولے سے سرگوشی کی۔ میں بولا۔ ”کیا تمہارے ساتھیوں نے ہلا تو نہیں بول دیا؟“

”نہیں، انہیں پہنچنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔“ وہ رکا۔ پھر بولا۔ ”تم ایک کام کرو۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے،

بڑے قیدیوں کو جا کر ہوشیار اور محتاط کر دو اور خبردار بھی کہ کوئی بھی اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلے۔ یہ خوش خبری بھی انہیں جا کر دے دو۔ ان کی آزادی کچھ لمحوں کے فاصلے پر ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چھپتا چھپاتا، دیوار کی آڑ لیتا ہوا، سب سے پہلے لڑکیوں کے ہال کمرے کی کھڑکی کی جانب پیش قدمی کی۔ ایک مقام پر میں نے دیوار کی آڑ سے مرکزی احاطے کی طرف دیکھا۔ یہاں مختصر سی عمارت میں میرا اشرف کا کمرہ تھا اور کچھ حواری وہاں جمع تھے۔ غلغلہ وہیں مچا ہوا تھا۔ میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ انہوں نے اشرف کو یقیناً بے ہوش یا مردہ حالت میں دیکھ لیا تھا، اور اب یقیناً میری تلاش کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ اب ان کے ہتھے چڑھنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی ہدایت پر تیزی سے عمل کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں ذرا دیر بعد غضب کارن پڑنے والا تھا۔ سر ہلایا بھی یقیناً میرا ایس ایم ایس پڑھنے کے بعد اپنی کسی کوشش میں مصروف ہو گئے ہوں گے جبکہ اول خیر کے ساتھی بھی یہاں بہ قول اس کے ایک بڑے جتنے کی صورت میں پہنچنے والے تھے۔ اول خیر اور اس کے ساتھی بھی مجھے گنگل خان اور اس کے حواریوں کے قبیل کے ہی لگتے تھے۔ گویا یہ جتنی گروپ یعنی کوئی پرانی گینگ وار تھی جو بہت پہلے اول خیر اور گنگل خان کے مابین چھڑی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے ونگ میں پہنچ کر میں نے سب کو خبردار کر دیا۔ وہ سب خوش بھی تھیں اور سرا سیمہ بھی کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہاں سے میں سیدھا لڑکوں کے ونگ میں پہنچا تو ٹھنک کر وہیں دبک گیا۔ کیونکہ دو تین مسلح حواری پہلے سے اندر موجود تھے اور ان سے درشت لہجے میں میرے بارے میں ہی پوچھ رہے تھے۔ میں ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ ہال سے نکل گئے تو، میں اندر کود پڑا۔ شوکت حسین اور اس کے ساتھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئے، میں نے یہاں بھی وہی کچھ دہرا دیا، ان کے سب کے چہرے آزادی کے جوش سے سرخ ہو گئے۔ شوکی کچھ پشیمان نظر آتا تھا، آج شاید اس کی میرے بارے میں غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ میں نے شوکی سے کہا۔ ”شوکی تم ایک کام نہ ٹاؤ ذرا جلدی۔“ وہ پورے جوش کے ساتھ تن گیا۔ میں بولا۔

”تم اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر کسی طرح بچو اور بچیوں کے پاس پہنچو۔ انہیں سنبھالنا ضروری ہے۔ کہیں بدحواسی میں وہ باہر کی طرف نہ دوڑ پڑیں۔“ وہ میری بات سمجھ گیا۔ وقت کم تھا، میں زیادہ بات نہ کر سکا اور پلٹ گیا۔

میرا رخ اول خیر کی طرف تھا لیکن اس نے مجھے کھلے میدان میں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ ٹھیک اس وقت برسٹ چلنے کی آواز ابھری۔ یکدم لڑکیوں کے ونگ کی طرف شور مچ گیا۔ کچھ دوڑتے قدموں اور زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ برسٹ چلنے کی آواز مجھے اس سمت سے سنائی دی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے میں... خیر کو چھوڑ کر آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس پر کسی مسلح شخص نے فائر کیا تھا... یا پھر یہ کارروائی اول خیر کی تھی۔ ابھی میں ٹھیک سے کچھ اندازہ نہیں قائم کر سکا تھا کہ دفعتاً مذکورہ سمت سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے ایک جگہ سے ابھر کر اس طرف دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اول خیر جس مختصر عمارت کے کمرے میں مقید تھا، اب اس کی چھت پر نظر آ رہا تھا جبکہ آٹھ دس مسلح افراد اس عمارت کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ دو تین افراد کو لہبا بھی لٹا چکا تھا، جو مجھے زمین بوس نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تھی، ایک جنگ کی ابتدا اب ہو چکی تھی۔ پتا نہیں اول خیر سے کیا غلطی ہو گئی تھی کہ وہ وقت سے پہلے ہی ان کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اس کے گرد مسلح اور خونی حواریوں کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر یہی صورت حال رہتی تو بہت جلد گنگل خان کے بھیڑیا صفت حواری اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ ابھی تو وہ چھت پر تھا تو کسی حد تک محفوظ تھا۔

اچانک میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی دود دیواروں کے درمیانی راستے پر کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ آگے بڑھا تو کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔ ہم دونوں گر پڑے۔ وہ کوئی مسلح شخص تھا، اور اس کے عقب میں دو اور بھی مسلح افراد تھے۔ یہ تینوں شاید اس راستے سے دوڑ کر عمارت کی چھت پر چڑھنا چاہتے تھے، تاکہ دوسری چھت سے اول خیر کو پہ آسانی گولیوں کی زد میں لیا جاسکے۔ مگر بد قسمتی سے میں ان کے نرغے میں آ گیا۔ لیکن گرتے ہی میں نے نہ صرف اپنے حواسوں کو قابو میں رکھا تھا بلکہ زمین پر پڑی گن کی طرف جھپٹا بھی تھا، جو مجھ سے ٹکرانے والے شخص کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی جب تک اس کے باقی دو ساتھی صورت حال کو سمجھتے میں نے گن سنبھالتے ہی ان کی طرف رخ کر دیا۔ ٹرگر دبانے سے پہلے میں یہ اطمینان کر چکا تھا کہ وہ برسٹ پر سیٹھی، زندگی میں پہلی بار میں نے گن کا پہلا برسٹ ان دو لوگوں پر برسایا تھا۔ میری گن وحشی دندنے کی طرح آتشیں انداز میں دھاڑی تھی، اور گولیوں کی پوری باڑھ نے دونوں کی ٹانگیں چھلنی کر کے رکھ دیں۔ وہ چیخیں مار کر

کمرے۔ میں نے لینے لینے تیسرے زمین بوس شخص کی طرف بہ سرعت کروٹ بدلی تو وہ تب تک کھڑا ہو چکا تھا، اور مجھ پر پل پڑنے کے لیے پرتول رہا تھا۔ دوسری بار ٹرگر پر میری انگلی نے جنبش کی اور ایک آتشیں قندمہ میری گن نے اٹکا۔ وہ چھلنی ہو کر مجھ سے محض چند انچ کے فاصلے پر دھپ سے گرا۔ اشرف سے میں نے جس طرح اس گن کو چلانے اور اس کا میکینزم سمجھا تھا، اب میرے کام آ رہا تھا۔

میں گن سنبھالے تیزی سے اس عمارت کی جنوبی دیوار کی سمت لپکا جس کی چھت پر اول خیر پٹانے چھوڑ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اب صرف اپنے دفاع کی پوزیشن میں تھا، حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے عمارت کے گرد کئی مسلح افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں جس دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، یہ لڑکیوں کے ہال کمرے کی دیوار تھی، جنگ شاید نل از وقت شروع ہو چکی تھی، میرا اس وقت رواں رواں فرط جوش سے سننا رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتا لہو... کسی لاوے کی طرح اچھل رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے ان تینوں حواریوں کی پیش قدمی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ہال کمرے کی چھت پر چڑھنے سے پہلے میں نے فاضل میگزین بھی حواریوں کے بے سدھ وجود سے حاصل کر لیے تھے۔

چھت پر آتے ہی میں نے پوزیشن بنائی۔ چھت کے گرد تین فٹ کی چار دیواری تھی۔ بالکل سامنے مجھے مختصر سی عمارت کے کمرے کی چھت نظر آ رہی تھی، جہاں اول خیر اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا۔ اچانک میں نے دیکھا۔ چند افراد سیزمی کے ذریعے چھت کی جانب بڑھ رہے تھے، جس سے میں چھت پر پہنچا تھا۔ جبکہ اول خیر بے خبر تھا کہ اس کے عقب میں موت رینکتی ہوئی اس تک پہنچنے والی تھی۔

میں نے وہیں سے ان کا نشانہ لیا۔ اور ٹرگر دبا دیا۔ گولیوں کی مہیب تڑتڑاہٹ ابھری۔ پتا نہیں میرا نشانہ ٹھیک بھی لگا تھا یا نہیں، البتہ دیوار سے ٹکی کھڑی لکڑی کی سیزمی ضرور ہل گئی تھی۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ سیزمی پر موجود افراد کا توازن بگڑ گیا اور پھر وہ سیزمی سمیت نیچے آ رہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اول خیر کو اندازہ ہو گیا کہ ساتھ والی چھت پر اس کا ہمدرد یعنی میں موجود تھا۔ مگر اس فائر کے ساتھ ہی مجھ پر بھی دھندا دھن گولیاں برسائی جانے لگیں۔ میں نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ... خود کو نہ صرف نیچے جھکا لیا بلکہ تابڑ توڑ فائرنگ سے گھبرا کر میں نے خود کو چھت کے فرش پر گرا لیا۔ شاخیں شاخیں کی سنسناتی آوازوں سے میرا دماغ جھنجھٹا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹ

آوارہ گرد گئیں۔ جس دیوار کو تھوڑی دیر پہلے میں مور چابنائے ہوئے تھا وہ دیوار ہی اڑ گئی تھی، اور لینے لینے بھی مجھے دوسری چھت اور اس پر پوزیشن سنبھالنے بیٹھا اول خیر بھی صاف نظر آ گیا۔ غالباً اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور ہاتھ کا کوئی مخصوص اشارہ بھی مجھے کر رہا تھا۔ مجھے یہی سمجھ میں آ سکا تھا کہ وہ مجھے یا تو مزید فائرنگ سے روکنا چاہتا تھا یا پھر فوراً چھت سے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا، تاہم میں نے اس کے اشارے کی پروا کیے بغیر تھوڑا سا آگے سرک کر نیچے کا منظر دیکھا۔ نصف سے زائد مسلح افراد میری سمت دوڑ رہے تھے۔ وہ نیچے میرے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے پرتول رہے تھے۔ مجھے دوبہ دو فائرنگ کا مقابلہ کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ بے چارہ اول خیر میری اس حرکت سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور مجھے پلٹنے کا اشارہ کیے جا رہا تھا۔

میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہ چھت جتنی محفوظ تھی، اتنی کمزور بھی... یہاں رہتے ہوئے میں خود کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے دل میں اور تو کچھ نہیں سما یا، البتہ تیزی کے ساتھ جھکے ہوئے انداز میں اس طرف آ گیا، جہاں سے میں اوپر پہنچا تھا۔ یعنی یہاں وہی عارضی سیزمی تکی ہوئی تھی۔ میں نے تھوڑا سا ابھار کر نیچے جھانکا، سردست مجھے کوئی نظر نہ آیا تو میں نے جلدی سے سیزمی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے نیچے گرا دیا تاکہ کوئی اوپر نہ آسکے۔

دفعتاً گولیوں کی گھن گرج ابھری۔ میں سینے کے بل دبک گیا۔ سر گھما کر دوسری جانب دیکھا، اول خیر جو ابی فائرنگ کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ پیچھے کو پلٹا۔ میں قدرے محفوظ تھا مگر اول خیر خطرے میں گھرا ہوا تھا، نیچے موجود مسلح افراد اس پر گولیاں داغ رہے تھے۔

اچانک ایک اور سمت سے مجھے مختصر مختصر وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ بالکل مختلف یعنی تیسری سمت تھی۔ میں نے ذرا سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا جہاں مرکزی گیٹ تھا۔ وہاں افراد تفری کا منظر نظر آیا اور ابھی اس سلسلے میں اندازے ہی قائم کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے بڑا سا مرکزی لوہے کا گیٹ ٹوٹ کر گرا۔ ایک بڑا ٹرک اندر داخل ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے دو تین بغیر ہڈ والی جیپیں تھیں۔ ان میں مسلح لوگ سوار تھے اور بڑی بے رحمی سے گولیاں برساتے ہوئے ارد گرد موجود افراد کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ذہن میں پہلا ابھرنے والا میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اول خیر کے ساتھی تھے، گویا جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

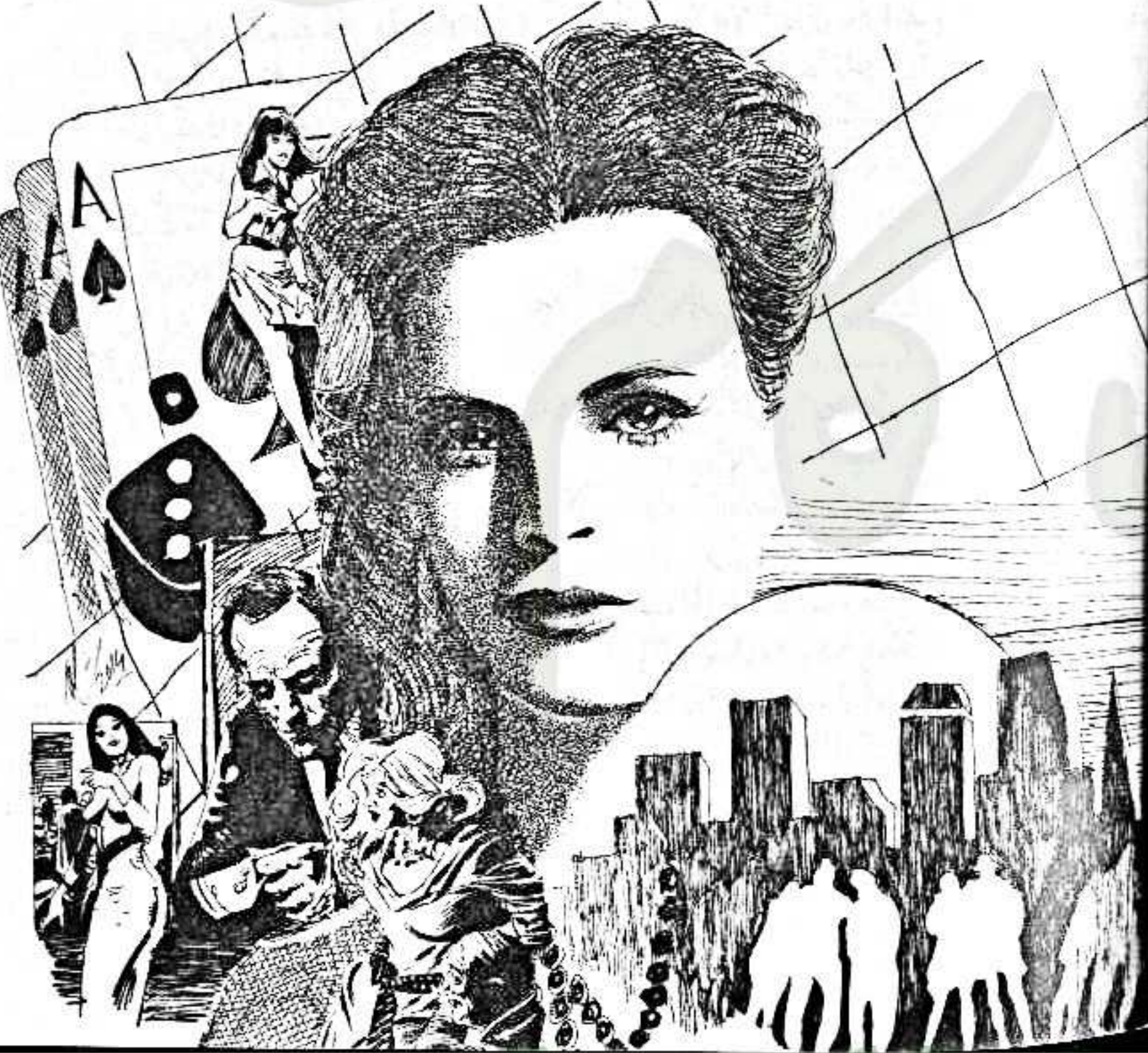
WWW.PAKSOCIETY.COM

## موقع شناس

دیانت داری سے دوستی نبھانے کی ریت بھی بدل چکی ہے... بعض اوقات جنہیں ہم اپنے مخلص اور محبت کرنے والے دوست سمجھتے ہیں... وہ دراصل مفادات کے نقاب میں چھپے موقع پرست... فریب کار ہوتے ہیں... مغرب کی گہما گہمیوں میں گم کر دینے والے لوازمات سے بھرپور کہانی... ہر چہرے کے پیچھے ایک نیا چہرہ، نئی کہانی تھی۔

### چاکر دتی اور ہوشیاری سے کھلی گئی بازی کا چونکا دیئے والا اختتام

وہ چونتیس پینتیس سالہ دراز قامت دہلی پتلی عورت تھی۔ اس نے اپنی ہم عمر دو خواتین کو بار کے آخر میں بیٹھے ہوئے تازہ لیا تھا جو دیکھنے میں دولت مند لگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ماریٹنی کا گلاس اٹھایا اور ٹپلتے ہوئے ان کے برابر جاتی تھی۔ ”کیا آپ خواتین کو دوستوں کی تلاش ہے؟“ وہ دونوں خواتین میری اور سلویا میں جنہوں نے اس ٹائٹ کلب کے فینسی ہونے کے باوجود بے موقع دیدہ زیب لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔



”چھوٹے استاد! وہ حرام کا پلا گنگل خان اپنی کار میں فرار ہو گیا۔“ جیب میں سوار چار سٹریٹ افراد میں سے ایک نے اسے بتایا تو میرا دماغ گنگل خان کے فرار پر سن ہو کر رہ گیا۔ ”کس طرف گیا ہے وہ؟“ اول خیر نے پوچھا۔ ”جکو اور جزہ اس کے تعاقب میں گئے ہوئے ہیں۔“ ایک دوسرے ساتھی نے بتایا۔ ”بانا پورہ والی روڈ پر گیا ہے وہ۔“ ”سب اتر وجہ سے جلدی۔“ معا اول خیر نے حکم صادر کیا۔ وہ سب فوراً حکم کی تکمیل میں پھٹلا گئے مار کے نیچے اترے۔ ”چل کا کا! سوار ہو جا۔“ اول خیر نے جیب کا اسٹیرنگ سنبھال لیا اور میں نے اس کے برابر والی سیٹ۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم اطفال گھر کے ٹوٹے ہوئے مرکزی گیٹ سے نکلے تو اچانک پولیس سائرن کی تیز آواز ہماری سماعتوں سے گمراہی۔ سامنے سے پولیس کی دو تین موٹائل گاڑیاں ہمارے راستے کے عین سامنے سے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نے دیکھا۔ اول خیر کے چہرے پر کھلی بار پریشانی اور تشویش کے آثار نمودار ہوئے اور میں سوچنے لگا۔ اول خیر بھی گنگل خان گروپ کی طرح یقیناً جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے پکڑے جانے کا مطلب تھا ہمیں ایک مجرم کے ساتھی کے طور پر گردانا جاتا۔ مجھے اب اپنی پریشانی لگ گئی۔ ”لے کا کے! سنبھل، سیٹ پر مضبوطی کے ساتھ کیل ہو جا۔ ورنہ لمبے رولے (پریشانی) میں پڑ جائیں گے۔“ اول خیر نے کہا اور پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اسٹیرنگ کا ٹا اور جیب دائیں جانب ایک خشک نالے میں اتر گئی۔ عقب سے پولیس نے ہم پر فائر کھول دیا۔ ”کا کے! نیچے جھک جا اول خیر چلا یا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سماعت میں دھماکے کی آواز ابھری۔ کوئی بھنگی ہوئی گولی جیب کے کسی ٹائر کو برسٹ کر گئی تھی۔ جیب اس وقت خشک نالے کی ڈھلان اتر رہی تھی کہ ٹائر برسٹ ہونے کی صورت میں الٹ گئی۔ اول خیر کا تو پتہ پتا نہ چلا البتہ میں جیب سے اچھل کر خشک نالے کی دلدلی زمین پر جا پڑا۔ میرے ارد گرد آنا فانا پولیس کی نفری جمع ہو چکی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

مجھے یہ سب کچھ کسی تاریخی فلم کا منظر ہی لگتا تھا جس میں ایک بادشاہ کی شکست کو کچھ لمحے کی دیر تھی اور دشمن اس کے قلعے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ یہ ”اطفال گھر“ جو بھی لاوارث، یا والدین اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے معصوم بچوں کی محفوظ پناہ گاہ ہوا کرتا تھا، کبھی اس طرح خونی جنگ کا منظر بھی پیش کر سکتا تھا، اس کا میں نے سوچنا تو درکنار کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس وقت یہ سوچ کر میرا دل دکھ سے بھرنے لگا کہ شاید اب اس اطفال گھر کا وجود ہی نہیں، اس کی کہانی بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والی تھی۔ نہ جانے اب کون ان معصوم بچوں کا پالنے ہارے گا؟ یہ بچے اب کہاں جائیں گے۔ جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم اور لاوارث کہلاتے تھے۔ میری طرف بڑھنے والے حواریوں کو اب اس نئی صورت حال کے باعث اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ سب تتر بتر ہو گئے تھے میں نے بچوں پر پاؤں ٹکا کر خود کو واپس زمین پر اتارا اور اس عمارت کی طرف پیش قدمی کی جہاں اول خیر بھی اس طرح کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے نیچے اتر چکا تھا۔ میں اول خیر سے ملنے کو بے چین تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ گنگل خان مرنے نہ پائے۔ کیونکہ مجھے اس سے عابدہ اور شکیلہ سمیت ان پانچوں بد نصیب لڑکیوں کا پتا چلانا تھا جنہیں وہ خبیث نہ جانے کہاں غائب کر چکا تھا۔ ”او... خیر... کا کا! بڑا پالا مارا ہے تو نے پر ذرا آہستہ... ابھی کچا ہے تو... پکا نہیں ہے۔ پکا پھل تجھے میں بناؤں گا۔“ مجھ سے ملتے ہی وہ اپنی بولی میں نہ جانے کیا کہتا چلا گیا۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ساتھیوں سے کہو گنگل خان کو جان سے نہ ماریں۔“ وہ درمیان میں بول پڑا۔ ”وہ جانتے ہیں اپنا کام تو فکر نہ کر۔ بس اب نکلنے کی تیاری کر۔ آ... میرے ساتھ... ذرا گنگل خان سے دودو ہاتھ کر لیتے ہیں۔“ ہم دونوں گنگل خان کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ اول خیر کے جتنی گروپ نے یہاں آ کر تہلکہ مچا دیا تھا۔ گنگل خان کے حواری اب اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے۔ شوکت حسین میری ہدایت پر پورا پورا عمل کر رہا تھا۔ اس نے سارے چھوٹی بڑی عمر کے قیدیوں کو اپنے اپنے کمروں تک محدود اور محفوظ کر رکھا تھا۔ اول خیر کے ساتھیوں کی ایک جیب تیزی سے ان کے قریب آئی۔

ڈولی نے اپنی ماریٹی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ ”کیا تم نے اس پر کوشش مرد کو دیکھا جو وہاں بیٹھا ہوا ہے؟“

”کدھر؟“ میری نے پوچھا۔

”وہ جو بوتھ میں تنہا بیٹھا ہے۔“

”اوکے، ہاں۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔“

”وہ سپر ہاٹ ہے اور دولت مند بھی۔“ ڈولی نے بتایا۔

میری نے ایک بار پھر اس شخص پر نگاہ ڈالی، بولی۔ ”تو پھر وہ تنہا کیوں ہے؟“

”وہ کسی حد تک شرمیلا ہے۔ میں ایک مرتبہ اس کے ساتھ باہر گئی تھی۔ اسے اپنے ہمراہ ریٹ ریج لے جانے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم اس کا مطلب سمجھتی ہو۔“

”ہوں!“

”کیا تم ہوریزینٹل ہی ڈانس سے واقف نہیں ہو؟“ ڈولی نے پوچھا۔

بارٹینڈر نے جوان کی گفتگو سن رہا تھا، میری کو بولنے ترجمان اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نوجوان کے ساتھ شب بسر کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اوہ!“ میری نے بات کو بخوبی سمجھتے ہوئے کہا۔

ڈولی اسے قدرے آزاد خیال لگی تھی۔

”لیکن وہ اس کے لیے رضامند نہیں ہوا۔“ ڈولی نے کہا۔

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے حقیقی محبت کی تلاش ہے۔ اس نے کسی احقانہ بات کہی تھی؟ اس لیے حیرانی بات نہیں کہ وہ تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ سو میں نے عمدہ ڈنر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور بس پلٹ آئی۔“

”ہوں۔“ میری نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”لیکن ہم میں اب بھی دوستی ہے۔“ ڈولی نے بتایا۔

”سو اب تم اس سے ملنا چاہو گی؟“

”اوہ، میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میں...“

”... دیکھو، تم یہاں کسی مرد سے ملنے کے ارادے سے آئی ہو۔ درست؟ اور یہ ایک عمدہ شخص ہے... بالکل تمہاری ٹائپ کا۔ تم کیا کہتی ہو؟ مجھے رشتے جوڑنے بڑا مزہ آتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سلویا کی طرف دیکھا۔

”اور پھر میں تمہارا بھی کسی نہ کسی کے ساتھ ملاپ کرانے کی، سلویا۔“

سلویا کے ہونٹوں پر نروس زدہ مسکراہٹ ابھرنے لگی۔

”مجھے یقین ہے کہ میرا شو ہر مجھے یاد کر رہا ہے اس لیے“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میری نے جواب دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بھانپ لیا کہ اس دراز قامت عورت کی نگاہیں اس کے سینے پر مرکوز تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس کے گریبان کے کنارے سے ابھرے ہوئے بھرپور سینے کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی یا چار ہزار ڈالر مالیت کے موتیوں کے ہار کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ہائے، میں ڈولی اور میں ہوں۔“ دراز قامت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میں میری گولڈمین ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کا ڈائمنڈ بریسلٹ کمرے کی روشنی میں جگمگانے لگا۔ یہ ایک حیرت انگیز بریسلٹ تھا اور میری اس کی نمائش پر خوب اترا تھی۔

”اور میں سلویا پارٹوف ہوں۔“

سلویا نے جو جیولری پہنی ہوئی تھی، وہ بھی خاصی متاثر کن تھی۔

”مجھے یقین نہیں کہ میں نے تم دونوں کو اس سے پہلے کبھی یہاں دیکھا۔“ ڈولی نے بے تکلفی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔“ میری نے جواب دیا۔

”اور میرا بھی۔“ سلویا نے بتایا۔

ڈولی آگے کی جانب جھک گئی اور قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔ ”یہ مرد سا بھی کا انتخاب کرنے کے لحاظ سے ایک بہترین جگہ ہے۔“

”واقعی؟ میں کسی عمدہ جنٹلمین سے ملاقات کرنے کی امید رکھتی ہوں۔“ میری نے بار کے ہال میں طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”ویل، یقین کرو... یہ بہت آسان ہے۔ میں ہمیشہ یہی کرتی ہوں۔“ ڈولی نے بتایا۔

تب میری کی نگاہ ڈولی کی انگلی میں موجود شادی کی انگوٹھی پر چلی گئی۔ ”لیکن تم تو شادی شدہ ہو؟“

ڈولی نے شانے اچکا دیے۔ ”کسی حد تک۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”صرف ویک اینڈز پر۔“

”اب میں سمجھی... تمہاری اوپن میرج ٹائپ کی شادیوں میں سے ایک ہے۔“ میری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر سلویا لالچاسی گئی۔

صوت سے شناس

برڈز کو تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

”ڈولی کا لب و لہجہ قدرے درشت ٹائپ کا ہے۔“ پیٹرین نے کہا۔

”ہاں، میں نے یہ بات نوٹ کر لی ہے۔“

”پلیز، مجھے جوائن کر لیں۔“ اس نے میری کو اپنے بوتھ کی ایک نشست پیش کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے... صرف ایک منٹ۔“ میری یہ کہہ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ اس کی پشت عین اس بارشش کی جانب تھی جس کی دوسری جانب اس کی سیکلی جنیفر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ ان کے مابین جو بھی گفتگو ہوگی وہ اس کا ایک ایک لفظ صاف سن لے گی۔

”میں چند ہفتے قبل اٹلانٹا سے یہاں منتقل ہوا ہوں۔ میں نے ٹکسٹو پارک میں ایک قدیم پیارا سا گھر خریدا ہے۔“ پیٹرین نے بتایا۔

میری کو علم تھا اس علاقے میں مکانوں کی قیمت پچاس لاکھ سے لے کر ایک کروڑ ڈالر تک کی ہے۔

پیٹرین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”صاف بات یہ ہے کہ وہ مکان میرے لیے بہت بڑا ہے۔ لیکن وہ علاقہ بس میرے دل کو بھا گیا تھا۔ میں اس مکان کی تزئین و آرائش کر رہا ہوں۔ اس وقت میں ہوٹل اومنی میں قیام پذیر ہوں۔“

”وہ تو ایک عمدہ ہوٹل ہے۔“

”ہاں، لیکن میں اس گھر میں جانے کے لیے بے تاب ہوں اور مجھ سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔“

”صرف تم ہو، فیملی نہیں ہے؟“ میری نے سوال کیا۔

”نہیں۔ میں اب بھی مس رائٹ کی تلاش میں ہوں۔“

”پھر تو تم بے حد صابر ہو۔“

”تم نے یہ بات کیوں کہی؟ اس لیے کہ میری عمر زیادہ ہے؟“ پیٹرین نے کہا۔

”نہیں، آئی ایم سوری۔ میں قدرے درشت ہو گئی تھی۔ پلیز، مجھے معاف کر دو۔“ میری نے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”نو پراہم۔ درحقیقت یہ بات مجھے بہت سننے کو ملتی ہے لیکن بہت سی عورتیں جن سے میری ملاقات ہوئی ہے وہ صرف میرے امارت کی بنا پر میری طرف راغب ہوئی تھیں۔ لہذا مجھے اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“

جاری ہوں۔“ اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

”اوکے۔“ میری نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں۔“

”اب تم سے کل کلب میں ملاقات ہوگی۔“ سلویا نے کہا۔

”اوکے، ہائے۔“

سلویا کے جانے کے بعد ڈولی بولی۔ ”میری تم اس سے ملنا چاہتی ہو یا نہیں؟“

”میرا خیال تو ہے۔“

”تو پھر آؤ چلیں۔“ ڈولی نے بار اسٹول پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام پیٹرین ہے۔“

میری ڈولی کے پیچھے پیچھے پیٹرین کے کیمین کی جانب چل پڑی۔ اس دوران وہ ہر میز پر موجود لوگوں کے چہروں کا سرسری جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہ چیک کرنا چاہ رہی تھی کہ کوئی اس کی اس حرکت کو دیکھ تو نہیں رہا؟ یہاں کوئی اس کا شناسا تو موجود نہیں ہے؟

... تب اس کی نگاہ جنیفر پر پڑی۔ وہ پیٹرین کے کیمین کے برابر کے بوتھ میں ایک اور عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میری کی قریبی سہیلیوں میں سے ایک تھی اور بطور کپے باز عورت مشہور تھی۔ لیکن میری کو امید تھی کہ وہ آج کی رات اپنے کام سے کام رکھے گی اور اس پر توجہ نہیں دے گی۔

ڈولی نے پیٹرین کے بوتھ میں داخل ہوتے ہوئے اسے بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو، پیٹرین! آج کی شب کیسی گزر رہی ہے؟“

وہ مسکرا دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، ڈولی۔“

میری نے یہ بات نوٹ کی کہ نزدیک سے وہ کہیں زیادہ بیٹنڈم دکھائی دے رہا تھا۔

”ویل، میں تم سے اپنی نئی دوست کا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔ یہ میری...“

”گولڈمین۔“ میری نے نام کھل کرتے ہوئے کہا۔

پیٹرین اپنے بوتھ سے کھسک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی قامت چھ فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کا کوشش جسم اس کی قامت کو اور بڑھا رہا تھا۔

”اور یہ۔“ ڈولی نے بتایا۔ ”پیٹرین ہے... لیڈیز“

یہ سن کر پیٹرین قدرے شرما سا گیا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی میری۔“

”تو پھر، اوکے۔“ ڈولی نے کہا۔ ”میں تم دونوں کو“



# کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عنبر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوائیں۔

**المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)**  
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)  
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان  
**0300-6526061**  
**0301-6690383**  
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

ساتھ ہے۔" میری نے بتایا۔  
☆☆☆  
میری، پیٹرین کے ہمراہ اپنے گھر کے ایک گوشے میں چڑے کے کاؤچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کی نظریں آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر مرکوز تھیں۔ چارلس مشروب کی بوتل اور دو گلاس لے آیا۔  
متعدد گلاس پینے کے بعد پیٹرین میری کے نزدیک آگیا۔۔۔۔۔ اس نے پیش رفت شروع کی تو میری قدرے پھلنے لگی۔ لیکن جب اس نے پیٹرین کو حد سے آگے بڑھتے دیکھا تو دور ہٹ گئی۔  
"نہیں، نہیں۔" میری نے کہا۔ "ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔ یاد رہے کہ تم نے خود کو مس رائٹ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔"  
"میرا خیال ہے وہ مجھے مل گئی ہے۔" وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔  
میری نے اسے روک دیا۔ "دیر ہو چکی ہے۔ اب بستر پر جانے کا وقت ہے۔"  
"یہ سن کر پیٹرین کا چہرہ جگمگا اٹھا۔  
"میں سچ کر دوں۔ اب سونے کا وقت ہے۔"  
"آہ کم آن بے بی۔"  
"میں چارلس سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ تمہیں گاڑی میں تمہارے ہونٹ چھوڑ آئے۔"  
پیٹرین نے رخصت ہونے سے قبل میری کو اگلے دن لٹچ پر چلنے کے لیے رضامند کر لیا۔  
☆☆☆  
میری نے لٹچ کے لیے شہر کے وسط میں واقع ایک امتیازی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔  
"آپ کی ایک بار پھر یہاں آمد ہمارے لیے باعث افتخار ہے، مسز گولڈمین۔" ہیڈ ویٹر نے کہا۔  
میری نے اپنے لیے شیف سلاد اور پیٹرین نے ران کے گوشت کے پارچے کا آرڈر دیا۔  
"مجھے اس شہر سے عشق ہے۔" پیٹرین نے کہا۔  
"تو تم کچھ عرصے اس شہر میں مقیم رہنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میری نے پوچھا۔  
"یقیناً۔"  
"گڈ!"  
"اور میں تمہارے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کی خواہش بھی رکھتا ہوں۔"

کہ تم قدرے ضدی ٹائپ کی لگتی ہو۔"  
"صرف اپنی ماں کی حد تک۔"  
"تو پھر تم نے بالآخر اس معاملے میں ہار کیوں مان لی اور طلاق کیوں لے لی؟"  
"میری ماں مر گئی تھی۔"  
"اوہ، آئی ایم سوری۔ کیا تم دونوں نے اپنے اختلافات طے کر لیے تھے؟" پیٹرین نے پوچھا۔  
"حقیقت میں تو نہیں۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ ہمارے مابین کھرا ایک ایسی چیز تھی جو ہم دونوں کو پسند تھی۔ اس بات کا مکمل احساس مجھے اس کے مرنے کے بعد ہوا۔ لیکن وہ ہمارے درمیان باہمی لطف اندوز ہونے کا بہترین وقت ہوا کرتا تھا۔" میری نے بتایا۔  
پیٹرین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
"میں عام طور پر اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتی... خاص طور پر پہلی..."  
"ڈیٹ پر؟"  
"نہیں، میرا مطلب ہے..."  
"اوکے، اوکے۔ لیکن یہ حقیقت میں ڈیٹ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ آؤ یہاں سے باہر چلتے ہیں۔"  
"کہاں جائیں گے؟"  
"اوہ... اچھا... رہنے دو۔ یوں لگے گا جیسے میں کوشش کر رہا ہوں کہ تم رات میرے ساتھ گزارو۔"  
"کیا؟ تمہارے ہونٹ کے کمرے میں؟ نہیں۔ میرا ایسا قطعی کوئی خیال نہیں ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔ تم میری رفاقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اس لیے میرے گھر چلتے ہیں۔ میرے یہاں ایک بڑا آتش دان ہے۔ ہم کاؤچ پر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے اور دائن کا لطف بھی اٹھا لیں گے۔"  
اس نے مسکراتے ہوئے میری کا ہاتھ تھام لیا۔  
"زبردست رہے گا۔"  
میری نے اپنا سیل فون نکال لیا۔  
"چارلس؟ میں گھر جانے کے لیے تیار ہوں اور میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے... شکر یہ۔"  
"جب تک ہم باہر پہنچیں گے چارلس لیوزین کے آجائے گا۔" میری نے کہا۔  
"چارلس تمہارا شو فر ہے؟"  
"شو فر اور بلٹر دونوں ہیں۔ وہ برسوں سے میرے

"میرا قیاس ہے کہ تم طلاق یافتہ ہو۔"  
"ہاں، دو سال ہوئے مجھے طلاق ہوئی تھی۔" میری نے اقرار کیا۔ "لیکن کس بات نے تمہیں یہ خیال دلایا کہ میں طلاق یافتہ ہوں؟ کیا میں تمہاری طرح نہیں ہو سکتی جو اب بھی مسٹرائٹ کی تلاش میں ہو؟"  
اس بات پر پیٹرین نے تہمت لگایا۔ "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟ ذرا اپنے آپ کو تو دیکھو۔ تم اتنی حسین ہو کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کسی شخص کے ہاتھوں اپنا دل جیتنے کے لیے اتنا انتظار کرنا پڑتا۔"  
"شکر یہ۔"  
"امید ہے کہ اس شخص نے تم سے تمہاری دولت کی خاطر شادی نہیں کی ہوگی۔"  
"نہیں۔ اس کے پاس اپنی دولت تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا۔ وہ بعد میں ایک بہت بڑا بے وقوف نکلا۔"  
"تب تو تم خوش قسمت ہو۔"  
"خوش قسمت؟"  
"وہ تمہاری آدمی دولت ہتھیاسکتا تھا۔"  
"ہاں، اس لحاظ سے تو میں واقعی خوش قسمت رہی لیکن میں نے سات سال بڑی اذیت میں گزارے اس لیے میں خود کو خوش قسمت محسوس نہیں کرتی۔"  
"تمہاری شادی کتنے سال قائم رہی؟"  
"ساڑھے سات سال۔"  
"وہ ہنس پڑا۔" تم اتنے لمبے عرصے تک اس بڑی شادی کے بندھن میں کیوں جکڑی رہیں؟"  
"اپنی ماں کی وجہ سے۔ مجھے اس کے الفاظ اب بھی من و عن یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا۔" میں تمہیں اس سے شادی کرنے سے منع کرتی ہوں۔ پھر شادی کی تقریب کے وقت وہ مجھے بھیج کر ایک جانب لے گئی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک سال کے اندر ہی طلاق ہو جائے گی۔ مجھے ماں کی بات کو غلط ثابت کرنا تھا۔"  
"بے شک۔ میں تمہاری بات بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ لیکن تم اتنے برسوں تک اس کے ساتھ کیوں چپکی رہیں؟ کیا شادی ایک سال تک قائم رہنے سے تمہاری ماں کی بات غلط ثابت نہیں ہو گئی تھی؟"  
"ہاں، غلط ثابت ہو جاتی۔ اگر وہ مجھے مسلسل یہ کہنا بند کر دیتی کہ میں اسے طلاق نہ دے کر اپنی حماقت کا ثبوت دے رہی ہوں۔"  
"وہ یہ سن کر مسکرا دیا۔" مجھے اس بات پر معاف کر دینا

کھانے کے دوران میں وہ خوب باتیں بھی کرتے رہے۔ جب انہیں کھانے کا بل پیش کیا گیا تو ہیڈ میٹران کے پاس آیا اور ان سے کھانے اور سروس کی کوائٹی کے بارے میں تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

”میری، ہو سکتا ہے کہ میں اصل بات نہ کہہ پارہا ہوں۔“ پیٹرین نے میری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ ہم مل کر کوئی انتہائی ایٹل قسم کا جشن منا سکتے ہیں۔“

میری گرم جوشی سے مسکرا دی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“

پیٹرین نے اس کا ہاتھ تھام کر اس پر بوسہ دے دیا۔

”تم ایک بات جانتے ہو؟“

”کیا؟“

”آؤ جشن مناتے ہیں۔“

”اوہ، گریٹ!“

”آؤ چلیں۔“

پیٹرین نے میز پر دو سوڈا کے دو نوٹ یوں اچھال دیے جیسے وہ ردی کاغذ کے ٹکڑے ہوں۔

میری نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ ریٹورنٹ سے باہر آگئے۔ میری اسے پیدل ایک فریمی جیولری اسٹور میں لے گئی۔

جب وہ جیولری اسٹور میں داخل ہوئے تو پیٹرین نے کہا۔ ”تو تم منگنی کی انگلی کے لیے تیار ہو گئی ہو؟“

”نہیں، احمق!“

پیٹرین کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”ابھی نہیں۔ شاید چند ہفتوں بعد ہم منگنی کر لیں۔“

میری نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

اس دوران ایک سلیز مین نے اپنی آنکھیں اور کات ان دونوں پر مرکوز کر لیے تھے۔

”مجھے جیولری سے عشق ہے۔“ میری نے کہا۔ ”اوہ! اس انگلی کو تو دیکھو۔“

یہ سن کر سلیز مین آگے بڑھ آیا۔ اس نے گلاس کیبنٹ میں سے وہ انگلی نکال کر میری کے سامنے رکھ دی۔ ”یہ آپ کے کلیکشن میں ایک پیارا اضافہ ہوگا سز گولڈ مین۔“

”اس کی کیا قیمت ہے، جارج؟“

پیٹرین کو یہ دیکھ کر کسی قسم کا اچھا نہیں ہوا کہ میری اور جیولری سلیز مین ایک دوسرے کو ناموں سے جانتے تھے۔

میری پیٹرین کی جانب گھوم گئی۔ ”کیا تم اسے میرے لیے خریدنا پسند کرو گے، پیٹرین؟“

پیٹرین نے تھوک نگتے ہوئے حای بھری۔ ”ہاں؟ کیوں نہیں۔“

میری نے اپنی آواز دہمی کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے چند ہفتوں میں مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھا اور میں نے ہاں کہہ دی تو یہ میری انجمن منٹ رنگ ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مجھے ابھی چاہیے۔“

”نو پرابلم۔“ پیٹرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جارج اسے خاتون کے لیے پیک کر دو۔“

جارج نے خوشی خوشی انگلی پیک کر دی۔

”ہیچس سو، ٹھیک ہے؟“ پیٹرین نے امریکن ایکسپریس کارڈ جارج کو تھماتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر، ہیچس ہزار۔“

”اوہ۔“ پیٹرین کے منہ سے آہ نکل گئی۔ ساتھ ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

”کیا یہ ٹھیک نہیں ہے، پیٹرین؟“ میری نے پوچھا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں گویا ہوئی۔ ”اگر کوئی پرابلم ہے تو میں... ادائیگی کر سکتی ہوں۔“

پیٹرین نے کھنکھارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”نو پرابلم۔“

”اسے حسب معمول آپ کے گھر پر ڈیلیور کر دیا جائے سز گولڈ مین؟“ جارج نے پوچھا۔

”ہاں، تمہیں یو۔“ میری نے کہا۔ پھر پیٹرین کی طرف گھوم گئی۔ ”میں ایک بیش قیمت برانڈ نیو جیولری پہن کر باہر نکلتا نہیں چاہتی... یہ لیٹروں کو خود دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں اسے ڈنر کے موقع پر پہنوں گی۔“

میری نے تصور کر لیا تھا کہ پیٹرین کی جانب سے ڈنر کی پیشکش متوقع ہے۔

پیٹرین نے اپنے ڈرائیور کو طلب کر لیا جو چند منٹ بعد ہی اس کی کرائے کی لیوزین لے کر جیولری اسٹور کے باہر آ گیا۔

میری نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کچھ دیر سنانے کے بعد ڈنر کے لیے تروتازہ ہو جائے۔

☆☆☆  
شام پانچ بجے پیٹرین کی لیوزین میری کے مینشن کے سامنے آ کے رک گئی۔

پیٹرین درجن بھر گلاب ہاتھوں میں لیے سیزھیان چڑھ کر اوپر پہنچا اور دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجادی۔ ایک انتہائی دلکش عورت نے دروازہ کھولا جو یقینی طور پر ملازمہ نہیں تھی۔ وہ میری سے بے حد مشابہ لگ رہی تھی۔

”تم یقیناً میری کی بہن ہو۔“

”تم کون ہو؟“

”میرا نام پیٹرین ہے۔ میری کا اور میرا آج ڈنر کا پلان ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم غلط پتے پر آ گئے ہو۔“

”نہیں، میں آج صبح میری کے ساتھ یہاں آیا تھا اور گزشتہ شب بھی۔“ پیٹرین نے بتایا۔

”میری کون؟“

”میری گولڈ مین۔“

وہ ایک لمحے کے لیے اسے حیرت سے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”یہ ناممکن ہے... اس لیے کہ میری گولڈ مین میں ہوں۔“

یہ سن کر وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ ”کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے اس عورت کے عقب میں دروازے سے اندر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر آواز لگائی۔

”میری؟“

”سر! اس گھر میں میری صرف میں ہوں۔“

”میری کے شو فر چارکس سے بات کرا میں... وہ آپ کو بتا دے گا۔“ پیٹرین نے کہا۔

”اوکے۔ اب تم یہاں سے روانہ ہوتے ہو یا میں پولیس کو فون کروں؟“ اس عورت نے کہا۔

”اوکے، سب ٹھیک ہے۔“ اندر سے ایک جانی پہچانی آواز نے کہا۔

”میری؟“ پیٹرین نے پکارا۔

اسنے میں اس کی میری دروازے میں کھڑی میری کے پاس آ گئی۔

”یہاں یہ کیا ہو رہا ہے، میری؟“ پیٹرین نے پوچھا۔

”اصلی میری گولڈ مین میں نہیں ہوں۔ یہ ہے۔“

میری نے اس عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر تم کون ہو؟“ پیٹرین نے جاننا چاہا۔

”میرا نام جینس ہے۔ تم مجھے شاید میرے گھر سے بھروسے بالوں کی وجہ سے پہچان لو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی سنہری بالوں کی وگ سر پر سے اتار لی۔

ٹیگور کا ذاتی ملازم ایک صبح کام پر نہ آیا جب دو گھنٹے گزر گئے تو ٹیگور سوچنے لگا کہ ملازم کو کیا سزا دی جائے۔ جب پانچ گھنٹوں کے بعد بھی وہ نہ آیا تو ٹیگور نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے آج ملازمت سے برطرف کر دے گا۔ کامل چھ گھنٹے تاخیر سے ملازم آیا اور آتے ہی چپ چاپ کام شروع کر دیا ٹیگور اس کی بے نیازی سے بہت مشتعل ہوا۔ مگر وہ بدستور خاموشی سے کام میں مصروف رہا۔ آخر وہ برس بڑا۔

”تم صبح سے اب تک کہاں تھے، یہ تمہارے آنے کا وقت ہے؟“

ملازم خاموشی سے کام میں لگا رہا۔ پھر دو تین منٹ کے وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔

”بابو جی آج صبح میری ننھی سی بیٹا مرگئی اس کی جہیز و تکفین کرتے دیر ہو گئی۔“

(مرسلہ: عبدالکریم خالد ضلع جھنگ)

”میں نہیں پہچانتا کہ تم کون ہو۔“ پیٹرین نے کہا۔

”لیکن مجھے میری انگلی واپس چاہیے۔“

”تم واقعی مجھے نہیں پہچانتے؟ یہ ایک سال قبل لٹل راک کی بات ہے۔ میں نے اپنی مالکن سے ایک لباس اور چند جیولری مستعار لیے تھے اور ایک ٹائٹ کلب چلی گئی تھی۔ جب آپ کوئی ملازمہ ہوتی ہیں تو مالدار مردوں سے ڈیٹ لیتا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کسی شخص نے یہ سوچا کہ میں بھی دولت مند ہوں تو وہ مجھے موقع دے سکتا ہے پھر تب ہی وہ میری شخصیت کی حقیقت سے آشنا ہو پائے گا۔“

پیٹرین کو جینس کی یاد آنے لگی تھی لیکن اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

”اور تم نے مجھے ایک موقع دیا تھا لیکن اس رات جب تم مجھے گھر لے گئے تو تم نے مجھے کوئی خواب آور چہرہ کھلا دی اور میری ادھار لی ہوئی جیولری چرا کر چھپت ہو گئے۔ اگلے روز صبح ایک اسٹٹ بروکر نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ وہ کسی متوقع خریدار کو وہ مکان دکھانے کے لیے آیا تھا۔ اور وہ مکان بھی تمہارا نہیں تھا۔“

”وہ میں نہیں تھا۔“ پیٹرین نے کہا۔ ”تم مجھے کسی اور کے ساتھ ملا کر گھسیڑ رہی ہو۔“

”اوہ، تب تو یہ بھی عجب اتفاق ہے کیونکہ اس شخص کا نام بھی پیٹرین تھا۔“ جینس نے کہا۔

”جیسی اصلی میری گولڈ مین بول اٹھی۔“ لہذا مسٹر

جاسوسی ڈائجسٹ 61 مئی 2014ء





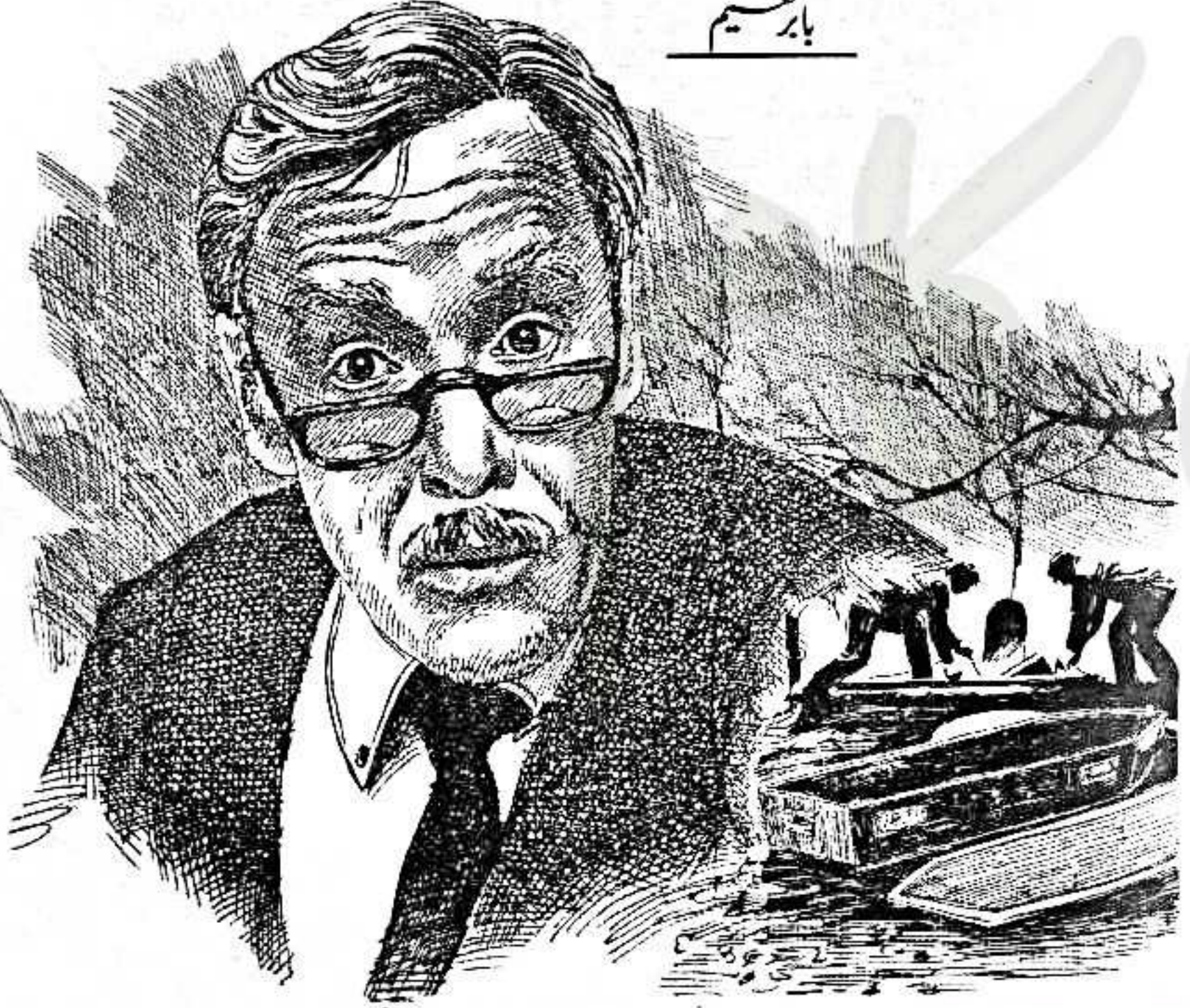
وہ قبر کے پاس کھڑا تھا اور ایک چھوٹی نوٹ بک میں تیزی سے کچھ نوٹس لکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نوٹ بک بند کر کے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور میری جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری بدحواسی میرے اعصاب کو جھنجھلا رہی ہے۔ تمہیں کیا پرابلم ہے، بڑے کے؟“

”نہیں سر۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے اپنا چھوٹا تو لیا واپس اپنی جیب میں رکھ لیا اور ساکت کھڑا رہا۔ مجھے یہ بات ناگوار گزری تھی کہ اس نے مجھے ”بڑے کا“ کہا تھا جبکہ میری عمر پچیس برس سے زیادہ تھی۔ میرا خیال ہے اس بوڑھے کی عمر کے مقابلے میں، میں ایک لڑکا ہی تھا۔

**اس گورکن کی مشکل جسے ایک ناگوار فریضہ انجام دینا تھا**

انسان... اللہ کی تخلیق ہے... اور اس تخلیق کو ایک دن اپنے مالک کی جانب لوٹ جانا ہے... زندگی کی یہ ایک اٹل اور تلخ حقیقت ہے... سانسوں کی ڈور منقطع ہونے کے بعد انہیں اپنے آخری مرقد تک پہنچانا اس کی ذمہ داری تھی۔

**گورکن**  
بابر نسیم



میں نے اپنی جیب سے چھوٹا تو لیا نکالا اور اپنی پیشانی سے پسینا پونچھنے لگا۔ یہ آخر خزاں کا موسم تھا اور موسم بھی ٹھنڈا تھا لیکن شدید ہیجانی کیفیت کی بنا پر مجھے پسینے آ رہے تھے۔

میں اس بوڑھے شخص سے کئی فنٹ کے فاصلے پر کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کسی بالائی ریاست کے دور پرے سے کا پروفیسر تھا اور غالباً اس کا تعلق وہاں کے فنیسی اسکولز میں سے کسی ایک سے تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا کوٹ اور سیاہ چمک دار جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں پر ایک بڑا سا چشمہ پہن رکھا تھا جو اس کی ناک پر بڑکا ہوا تھا اور اس کے سر کے بال گھنے اور چاندی رنگ کے تھے۔

اپنی کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بارے میں قطعی طور پر یقین ہو کہ تم میا می منتقل ہونا چاہتے ہو؟ میں نے سنا ہے کہ یہاں اٹلانٹا کے مقابلے میں موسم خاصا گرم اور مرطوب ہوتا ہے۔“

”مجھے مرطوب آب و ہوا کی پروا نہیں ہے، میڈم۔“ میں جانتی ہوں۔ ”میری نے کہا۔“ تم بس مہلت پیرا کمانا چاہتے ہو۔“

”ہاں، یہ ایک زبردست موقع ہے۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ میرا ساٹل پر اپنا ایک بار ہو۔ میرے بھائی نے اس سلسلے میں ایک ڈیل تیار کر رکھی ہے۔“ ”مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ ڈیل عمدہ ثابت ہوگی۔“

البتہ مجھے یہاں پر تمہاری بے حد کی محسوس ہوگی۔“ ”میں بھی آپ کو بے حد مس کروں گا، میڈم۔“ ”اوہ نہیں، تم مس نہیں کرو گے، چارلس۔“ میری نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم مجھے اپنا متبادل تلاش کرنے کے لیے دو ہفتے کی مہلت تو دے رہے ہو؟“

”اوہ، یقیناً میڈم! میں آپ کو کسی قسم کا پابند نہیں کرنا چاہتا۔“ ”مگڈ، تھینکس۔ بائی داوے، مجھے افسوس ہے کہ میں نے کل یہاں اطراف میں ہونے والی تمام ہیجان انگیز مس کردی۔“ میری نے کہا۔

”اوہ، آپ کا مطلب ہے جینس اور اس پینٹ کر میٹر کے مابین ہونے والا زبردست فیصلہ کن معرکہ؟“ ”ہاں، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔“ میری نے بتایا۔ ”ہم نے خوب اس سے بدلہ لیا۔“ وہ مسکرائے اور پھر اپنی کافی کے کپ سے ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔ ”واقعی، مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس معرکہ میں مس کیا۔ میڈم۔“ چارلس کافی پاٹ کو واپس اس کی جیب رکھنے کے لیے پلٹ گیا۔ ”لیکن میں نے اپنے کام سے اپنے دن کی چھٹی کو خوب انجوائے کیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھرائی۔ اس کی پیشانی کی جانب تھی۔

”واقعی؟“ میری نے پوچھا۔ ”جی میڈم، خاص طور پر گزشتہ شب تو میں خوب لطف اندوز ہوا۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر نمودار عیارانہ مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

وہ تینوں کار سے نیچے اتر آئے اور شیور لیٹ کے پیچھے جا کھڑے ہو گئے۔ انہیں وہ پولیس افسراب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف آنکھوں کو چندھیا دینے والی فلیش لائٹ تھی جس کی روشنی پر نگاہیں جمانا مشکل ہو رہی تھیں۔ ”اوکے!“ پولیس افسر نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔“

وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس افسر کی بات کا کیا مطلب تھا۔ ”میں اس سے قبل کہ شوٹنگ شروع کر دوں، تین تک گنتی گنوں گا۔“

ان تینوں کے پاس رد عمل ظاہر کرنے کا قطعی وقت نہیں تھا۔ پولیس افسر نے کہا۔ ”تین“ اور فائرنگ شروع کر دی۔

جینس کے جسم نے جھکائی لی اور اس کا وجود اس برسائی نالے میں گر گیا جو سڑک کے کنارے سانسے سانسے چل رہا تھا۔ اس نے پہلے پیٹرین اور پھر ڈولی کی چٹینیں سنیں۔ پھر ان دونوں کے بے جان جسم سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔

جینس نے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں نالے کی گیلی مٹی میں پھسلنے لگے۔ پھر اس پولیس افسر کی فلیش لائٹ کے چلتے نے اسے اپنی زد میں لے لیا۔ جینس کو احساس ہو گیا کہ اب اس کا کھیل بھی ختم ہونے والا ہے۔

”تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتیں۔“ اس آواز نے کہا۔

تب اچانک جینس نے اس شخص کی آواز پہچان لی۔ وہ کوئی پولیس افسر ہرگز نہیں تھا جو ان کی شیور لیٹ کا تعاقب کرتا ہوا ان کے پیچھے یہاں آ گیا تھا۔ وہ تو... اس سے قبل کہ جینس اپنے خیال کو عمل کرتی، پستول کی نال سے ایک شعلہ سا پکا اور گولی جینس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی۔

☆☆☆

”پلیز کیا مجھے کافی کا ایک اور کپ مل سکتا ہے، چارلس؟“ میری نے کہا۔

”جی میڈم۔“ چارلس نے تیزی سے کافی پاٹ اٹھایا اور ناشتے کی میز پر بیٹھی ہوئی میری کے کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے بولا۔ ”بیوٹی فل مارنگ، میڈم۔“ ”ہاں، بے شک یہ ایک سہانی صبح ہے۔“ میری نے



## تنگ آمد

سریم کے حنان

انسان کا کوئی فعل انفرادی نہیں رہتا... عملی طور پر وقوع پذیر ہونے کے بعد وہ اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے... ہمارے ارد گرد پھیلے کچھ ایسے ہی لوگوں کا احاطہ کرتی روداد جو پھر شریف آدمی کی زندگی کو بہ آسانی کٹھن بنانے کا ہنر رکھتے تھے... غیر قانونی سرگرمیوں سے دامن بچا کر چلنا کس قدر دشوار تر ہوتا جا رہا ہے... شریف اور سادہ لوح لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ!

ابچھے اوپرے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے... وہ بھی اپنے لیے کسی نجات دہندہ کا منتظر تھا

میں ایک شریف آدمی ہوں۔ اتنا ہی شریف جتنا اس ملک میں کوئی بیوی بچوں والا ملازم پیشہ شخص ہو سکتا ہے۔ گھر میں بیوی باس ہوتی ہے اور دفتر میں تو باس ہوتا ہی ہے۔ مجھے دونوں جگہ صرف سنا اور حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ محلے والوں سے بھی نہایت شریفانہ اور انکسارانہ سلام دعا ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر زندگی کے تیس سال ایک ہی گھر اور ایک ہی محلے میں گزارے مگر بچپن کی چھوٹی موٹی لڑائیوں... جن میں ہمیشہ مجھے ہی مار پڑتی تھی، بچوں

یاد دلایا کہ میں تازہ لاشوں کو زمین میں دفنانے کا عادی ہوں جو کہ وزنی ہوتی ہیں اور اس شخص کو مرے ہوئے عشرے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اور اب اس کی ہڈی باقی رہ گئی ہوں گی۔

یہ خیال آتے ہی میرا بدن لرز گیا۔ وہ بوڑھا پروفیسر تابوت کے برابر میں جھک گیا فوراً ہی تابوت کا ڈھکن اٹھانے لگا۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ کیا کرنے جا رہا ہے، میں تیزی سے دور ہٹ گیا اور چہرہ دوسری طرف گھما دیا۔

”تم تو ہر وقت لاشوں کو دیکھنے کے عادی گورکن۔“ اس بوڑھے نے کہا۔

”لیکن میں نے ایسے کسی کو کبھی نہیں دیکھا جسے مرے ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہو۔“ میں نے ایک پھر اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے کہا۔

”مجھے مشکل پیش آرہی ہے۔ ڈھکن اٹھانے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“ بوڑھے نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی مدد کی درخواست نظر انداز کر دی۔ ”کیا آپ یہ کام عام طور پر اپنے آفس میں نہیں کیا کرتے سر؟ اس تابوت کو یہاں قبرستان میں کھولنا کچھ مناسب لگ رہا۔“

”تمہیں اپنی رقم نہیں چاہیے کیا، لڑکے؟ اب ہر سے کام لو اور یہاں آ جاؤ۔“

میں نے اپنا چھوٹا تولیا اپنی جیب میں ڈھونڈا اور تابوت کے پاس چلا گیا۔ ہم دونوں کو تابوت کے ڈھکن کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے متعدد بار کوشش پڑی تب کہیں جا کر وہ ڈھکن ڈھیلا پڑا۔

ہم نے ڈھکن کو تابوت سے اٹھا کر نیچے ایک طرف فرش پر رکھ دیا۔ میں نے فوراً ہی اپنا چہرہ دوسری طرف لیا۔ میں تابوت کے اندر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

”جیسا کہ میں نے اندازہ لگا یا تھا۔“ بوڑھے نے کہا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ نے جواب دینے کے ارادے سے بوڑھے کی جانب دیکھا لیکن اس کی تمام تر توجہ تابوت پر مرکوز تھی۔ تب میں نے تابوت میں جھانکا کہ وہ بوڑھا پروفیسر کس بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

میرے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ تابوت خالی تھا!

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے پہلے کبھی کسی تابوت کو قبر سے کھود کر باہر نکالنے کا اتفاق نہیں ہوا؟“ وہ اب مجھ سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”نہیں سر۔“ میں نے اعتراف کیا۔ میں نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے نظریں زمین پر مرکوز کر دیں۔ ”میں قبریں کھودتا ہوں تاکہ مرنے والوں کو زمین میں سکون سے مدفون کر دوں۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں انہیں زمین سے کھود کر باہر نکالنے کے کاروبار سے وابستہ ہوں گا۔ یہ انتہائی غیر فطری لگتا ہے سر۔“ میرا جی جاہا کہ میں اپنا چھوٹا تولیا نکال کر ایک بار پھر اپنی پیشانی صاف کر لوں۔

”غیر فطری، ایس؟“ اس بوڑھے نے قبر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سو میں یقین کر لوں کہ تم ایک تو ہم پرست ہو؟“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ میں بس مردوں کی عزت کرتا ہوں اور ان کی بے حرمتی نہیں چاہتا، سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اوکے، اس معاملے کو اس طرح دیکھو، لڑکے۔ یہ شخص چھ فٹ نیچے دفن ہے۔۔۔ اس کی موت قدرے پراسرار ہے۔ اس کی موت کی وجہ کہیں درج نہیں ہے اور یہ میرا کام ہے کہ یہ معلوم کروں وہ کس طرح مرا ہے۔ لہذا میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے کو اس انداز سے دیکھو جیسے اس شخص کی زندگی کو عزت بخش رہے ہو۔ یہ اس کا حق ہے کہ اس کی پراسرار موت کی چھان بین کی جائے۔ کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرتے؟“

”لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس سے مرنے والے کی روح کو قہر آرا سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔“ اس بوڑھے نے جو صورت حال بیان کی تھی، اس سے مجھے قدرے تقویت مل گئی تھی۔

”میرے پاس مدفون کو قبر سے نکالنے کی کارروائی کا عدالتی حکم نامہ موجود ہے۔“ اس نے اپنے کوٹ کے بریسٹ پاکٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تم قبر کھودو، میں لاش کا معائنہ کروں گا۔ اس طرح یہ کام ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ بوڑھا پیچھے ہٹ گیا اور ایک قریبی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا اشارہ سمجھتے ہی میں نے اپنا ہیلچہ اٹھایا اور قبر کھودنا شروع کر دی۔

جو کئی میرا ہیلچہ تابوت سے نکرایا، بوڑھا میری مدد کو آ گیا۔ اس نے تابوت کو کھینچ کر اوپر لانے اور قبر سے باہر رکھنے میں میری مدد کی۔

تابوت حیرت انگیز طور پر ہلکا تھا۔ تب میں نے خود کو







”ان لوگوں کا حساب کتاب سے کیا تعلق؟“ رفیعہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”ہوتا ہے، دفتر کے معاملات ہوتے ہیں... اس کا حساب کتاب تو رکھنا پڑتا ہے۔“

”تو آپ نے کیا کہا؟“ وہ فکر سے بولی۔ ”پہلے ہی آپ دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں۔“

”کیا کہتا... انکار کر نہیں سکتا تھا اس لیے مجبوراً ماننا پڑا۔ اب کل سے جاؤں گا۔“

رفیعہ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ بس چند دن کا کام ہے اور پھر میں نہیں جاؤں گا۔ اسے کیا پتا تھا کہ یہ مصیبت نامعلوم مدت کے لیے میرے گلے پڑ چکی تھی۔ اگلے دن دفتر سے آکر میں نے بس منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کر ایک کپ چائے پی۔ میری چھوٹی بیٹی صوفیہ مجھ سے بہت مانوس ہے۔ شام سے ہی اس کی نظریں دروازے پر لگ جاتی ہیں کہ ابھی پاپا آئیں گے اور ہر دستک یا کال بیل پر وہ پاپا کہتی ہے۔ جب میں آتا ہوں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے میری جان نہیں چھوڑتی۔ خود مجھے بھی اس سے بہت پیار ہے۔ گھر میں آتے ہی سب سے پہلے اسے تلاش کرتا ہوں۔ لیکن اس روز وہ رفیعہ کی گود میں چھلتی رہ گئی اور میں گھر سے نکل گیا۔ پارٹی دفتر پہنچا تو وہاں ندیم موجود تھا۔ اس نے تمام لوگوں سے میرا تعارف کرایا حالانکہ میں سب کو اور سب مجھے جانتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھے پارٹی میں شمولیت پر باقاعدہ مبارکباد دی اور مثنائی منگوا کر سب کا منہ میٹھا کیا۔

میں ایک گھنٹا وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ آیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں روز وہاں جاتا اور پھر میری باقاعدہ ڈیوٹی لگ گئی۔ آٹھ سے دس بجے تک میں وہاں بیٹھتا تھا۔ اس دوران میں لوگ آتے، ان کے مسئلے مسائل اور شکایتیں سننا اور اگر ضروری ہوتا تو انہیں تحریر کر لیتا تھا۔ پھر یہ آگے بھج دیتا اور وہاں سے ان پر کارروائی ہوتی۔ لیکن بات یہاں تک ہوتی تب بھی ٹھیک تھا۔ مجھے اپنا وقت دینا پڑ رہا تھا۔ یہ جان کی قربانی سے بہتر تھا۔ لیکن ایک دن میں وہاں پہنچا تو ندیم اور ایک اجنبی لڑکا باہر ہی مل گئے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ”شریف بھائی، آج میرے ساتھ چلو... ایک بندے کی ضرورت ہے۔“

میں فکر مند ہو گیا کیونکہ میں اب اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ کس طرح کے کام کرتا تھا۔ ”یار، آفس دیکھنا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں نے شکیل بھائی سے کہہ دیا

ہے۔“ اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر بانک پر اسے پیچھے بٹھالیا۔ دوسرا لڑکا اپنی بانک پر تھا۔ میں نے کہا کہ ڈیوٹی سواری پر پابندی ہے تو وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اس کی فکر مت کریں۔ ہمیں کوئی نہیں روکے گا۔“

واقعی ایسا ہی ہوا۔ ہم کئی جگہوں پر قانون نافذ کرنے والے حکموں کے اہلکاروں کے سامنے سے گزرے اور کسی نے رکنے کا اشارہ تک نہیں کیا۔ مزے کی بات تھی کہ کئی جگہوں پر عام لوگوں کو ڈبل سواری پر روکا ہوا تھا۔ ہم ایک تجارتی علاقے میں ایک بڑے شاپنگ سینٹر کے سامنے رکنے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ”آپ یہاں بالکس کے پاس رکیں ہم ابھی آتے ہیں۔“

مجھے ان کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی تھی کیونکہ وہ دونوں سب سے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی کو دنیا سے رخصت کرنے آئے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور میرے کان فائرنگ کی آواز پر مرکوز تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ اندر سے برآمد ہوئے اور نارمل انداز میں چلے ہوئے آئے تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی مارا ماری نہیں ہوئی۔ ندیم اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ”اچھا ہوا بڈھا شرافت سے مان گیا ورنہ آج اسے پکا کر جانا تھا۔“

ندیم نے پیراشوٹ کی ہلکی سی جیکٹ پہنی ہوئی تھی جیسی کہ اکثر بانک پر سفر کرنے والے پہنتے ہیں کہ ان کے کپڑے ٹریفک کے دھویں سے خراب نہ ہوں۔ جاتے وقت جیکٹ جسم سے چپکی ہوئی تھی لیکن اب وہ جیبوں والی جگہ سے پھولی ہوئی ہو رہی تھی۔ میں نے جب ندیم کی کمر پکڑی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ گویا وہ یہاں کسی دکان والے سے رقم وصول کرنے آئے تھے اور اگر وہ انکار کرتا تو ان کا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ دکان والے نے رقم دے کر اپنی جان بچالی اور مجھے بھی کسی مصیبت میں پڑنے سے محفوظ رکھا۔ مگر ندیم نے مجھے ہمتا خوری کی ایک واردات میں ملوث کر لیا تھا۔ واپسی پر اس نے پارٹی دفتر کے بجائے مجھے گھر پر چھوڑ دیا۔ ”شریف بھائی! آج آپ سے زیادہ ہی کام لے لیا ہے، آپ آرام کریں۔“

میں فکر مند تھا اس لیے جلدی جان چھوٹنے پر زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تو اس دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ آج ندیم مجھے بتا لینے کے لیے ساتھ لے گیا

تھا۔ کل وہ مجھے کسی کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی ساتھ لے جا کر ملوث کر سکتا تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ پکڑا جاتا تو میرا کیا انجام ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اگلے دن مجھے بخار ہو گیا۔ میں نے معمول کی دوا میں لیں مگر فائدہ نہیں ہوا۔ اگلے دن دفتر میں کام کر رہا تھا کہ چکر آ گیا۔ چند لمحوں کے لیے بے ہوش ہو گیا۔ میرے ساتھی فکر مند ہو گئے اور اصرار کر کے سچ میں مجھے دفتر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے گئے۔ اس نے چیک اپ کیا اور ٹائیفائیڈ کا شبہ ظاہر کیا۔ اس نے ٹیسٹ لکھ کر دیا تو اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ ٹائیفائیڈ کا حملہ شدید تھا۔ اس نے ایک ہفتے مکمل ہیڈ ریسٹ اور کھانے پینے میں احتیاط کے ساتھ دوا کا کورس دیا۔ دفتر سے تو مجھے چھٹی مل گئی تھی، مگر میں سوچ رہا تھا کہ اس عذاب سے جان چھوٹنے کی یا نہیں۔ میں نے دفتر کے نمبر پر ندیم کو کال کر کے بتایا کہ میں بیمار ہوں اس لیے دس بارہ دن دفتر نہیں آسکوں گا۔ اس نے کمال فرخ دلی سے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں دفتر سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا اور میری جان کس عذاب میں پھنسنے والی تھی۔ ہفتے کے دن کی وجہ سے مجھے اتوار سے اگلے اتوار تک چھٹی مل گئی اور یوں نو دن کے مسلسل آرام نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا۔ رفیعہ نے میری خوراک اور دوا کا پورا خیال رکھا۔ بچے خوش تھے کہ میں پہلی بار اتنے دن گھر پر رہا تھا اور میں خود ان کے ساتھ خوش رہا بلکہ ان دنوں میں نے صحیح معنوں میں جانا کہ میرا گھر میرے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ امی، رفیعہ اور بچے ان کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صرف میں ہی نہیں، میرا گھر بھی خطرے میں تھا۔ جس طرح میں اپنے گھر والوں کے بغیر کچھ نہیں تھا، اسی طرح میرے گھر والے میرے بغیر ادھورے تھے۔ ان کی خوشیاں، آزادی اور زندگی کی ضرورتیں اور آسائشیں اللہ نے میرے دم سے دی ہوئی تھیں۔ اگر میں نہ رہتا تو وہ بہت کی چیزوں سے محروم رہ جاتے اور میں انہیں اور خاص طور سے اپنے بچوں کو کسی قسم کی کوئی محرومی دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کے ساتھ زندہ اور آزاد رہنا چاہتا تھا۔ پھر والے دن میں دفتر گیا اور وہاں سے واپس آ کر پارٹی دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ رفیعہ نے دبے لفظوں میں کہا۔

”چھوڑیں... اگر انہوں نے بلایا تو دیکھا جائے گا۔“

رفیعہ تو سمجھ رہی تھی کہ یہ عام سا جبر ہے۔ صرف میں ہی

تنگ آمد نہیں علاقے کے اور لوگ بھی جو دل سے پارٹی کے ساتھ نہیں تھے زبردستی وہاں کی ذمے داریوں میں شامل کر لیے گئے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ سیاسی دفتر کی چہل پہل اور عام لوگوں کی وابستگی دکھائی جائے۔ بہت سے اپنی خوشی سے وہاں جاتے تھے مگر ان میں اکثریت قارغ لوگوں کی تھی جو وہاں مفت کی جائے اور پان کے چکر میں بیٹھے رہتے تھے۔ کچھ میری طرح بھی تھے جو کسی وجہ سے پھنس گئے تھے اور اب پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے بلکہ میں زیادہ برا پھنسا تھا۔ اگر میں نہ جاتا تو امکان تھا کہ شکیل پھر مجھے خطرہ قرار دے دیتا۔ ویسے وہ بہت احترام سے ملتا تھا مگر مجھے ذرا شبہ نہیں تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ایک منٹ میں عزت احترام اتار کر ہاتھ میں بھی دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدشہ نہیں تھا، آئے دن میں پارٹی دفتر میں دیکھتا تھا جہاں جتنی کرا ایسے ہی کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے وہاں شریف اور عزت دار لوگوں کو بے عزت اور ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔

خاندانی جھگڑے ہوں، لیکن دین کا معاملہ ہو یا اتفاقہ جھگڑے ہوں، جب وہ دفتر لائے جاتے تو یہ دیکھا جاتا کہ کون سا فریق پارٹی کے قریب ہے۔ اسی کے مطابق فیصلہ ہوتا اور دوسرے کو جسمانی یا مالی سزا ملتی تھی۔ غریب گھر والوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کسی نکلے اور ناکارہ کو تھما دیں کیونکہ وہ پارٹی کا کیمبر ہوتا تھا۔ شوہر کو مجبور کیا جاتا کہ وہ طلاق پر آمادہ ہو کر طلاق دے کیونکہ بیوی کا کوئی بھائی بند یا آشنا پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر میں نے اپنی ذمے داریوں سے ذرا بھی گریز کیا تو میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ برا ہو سکتا ہے اس لیے میں رفیعہ کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں میری کرسی پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک صاحب تھے جو دل و جان سے پارٹی پر فدا تھے کیونکہ ان کے بہت سے کام پارٹی کے توسط سے ہوتے تھے اور انہوں نے پکوزا فروشی کی دکان سے صرف چند سال میں شاندار مکان اور نمکو کی بہت بڑی دکان بنالی تھی۔ میں وہیں دفتر میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ندیم آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھنکا پھر اس نے مجھے نظروں سے اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”شریف بھائی! آپ سچ بہت شریف آدمی ہو۔ میں اس سیٹ پر لایا تھا کہ آپ اپنا بھلا کر لو گے پر آپ نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے جواب



ایک آدمی بچے سے۔ "بیٹا ذرا یہ رومال سوگھو۔"  
 بچہ "مجھے پتا ہے اسے سوگھ کر میں بے ہوش ہو جاؤں  
 گا اور آپ مجھے بوری میں بند کر کے لے جائیں گے۔"  
 آدمی "یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"  
 بچہ "میرے ابو نے مجھے بتایا تھا۔"  
 آدمی "تمہارے ابو کون ہیں؟"  
 بچہ "یہ تو مجھے پتا نہیں کیونکہ وہ مجھے کہیں سے  
 بوری میں بند کر کے لائے تھے۔"  
 ☆☆  
 گاڑی کا مالک۔ "یہ تازہ پتھر کیسے ہوا؟"  
 ڈرائیور۔ "جناب ایک شیشی پر چڑھ گیا تھا۔"  
 مالک۔ "کیا تم نے شیشی دیکھی نہیں تھی؟"  
 ڈرائیور۔ "نہیں، وہ شیشی اس آدمی کی جیب میں  
 تھی جو گاڑی کے نیچے آیا تھا۔"

انتخاب، سید اکبر شاہ، مانسہرہ

ہوتا۔ "کھیل نے فخر سے کہا۔ وہ دونوں بالکل سکون سے  
 بات کر رہے تھے جیسے معمول کا تبادلہ خیال کر رہے ہوں۔  
 ان کے مقابلے میں میری حالت ہرگز رتے لمبے خراب ہوتی  
 جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی وہاں پولیس نہ آجائے  
 اور ہمیں پکڑ لے۔ ندیم نے مجھے دیکھا اور بولا۔  
 "یار! اسے گھر چھوڑنا ہوگا۔"  
 "میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" کھیل نے غصے سے کہا۔  
 "اب اسے مزید گواہ بنا لیا ہے۔"  
 "اس بار یہ گواہ نہیں، ہمارے ساتھ شریک ہے۔"  
 ندیم نے ہنس کر کہا۔ "ہم پکڑے گئے تو یہ بھی پکڑا جائے گا۔"  
 "اور کہیں یہ پکڑا گیا تو سب سے پہلے ہمارے  
 بارے میں پھوٹ دے گا۔"  
 "ویسے نہیں پکڑا جائے گا۔" ندیم نے اطمینان سے  
 کہا۔ "ہمارے ساتھ ہی پکڑا جائے گا۔"  
 "خدا کے لیے تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"  
 میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "میری جان پر بنی ہے  
 اور تم یہاں کھڑے ہو۔ صرف کچھ دیر پہلے تین بندوں کو قتل  
 کیا ہے۔"

شاید ندیم اصرار کر رہا تھا کہ وہ کاروائی کو روکے  
 کیونکہ وہ کہیں اور مڑ جاتا تو کھیل سے غلطی ہو سکتی تھی۔ اسے  
 اور اس کے ساتھ مجھے کار کو روکنا تھا۔ کھیل نے ایک تنگ  
 جگہ دیکھ کر اچانک بانک روک دی۔ خود اس نے ہیلسٹ  
 لگا یا ہوا تھا۔ جبکہ ندیم نے بھی ہیلسٹ پمکن لیا تھا۔ ان کے  
 چہرے چمپے ہوئے تھے اور میرا چہرہ عیاں تھا۔ کھیل نے  
 بانک اس طرح روکی کہ سفید کار کسی صورت نہیں گزر سکتی  
 تھی۔ دوسری رو سے گاڑیاں اتنے تواتر سے گزر رہی تھیں  
 کہ سفید گاڑی کے لیے خلا ہی نہیں بچا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو  
 اس کی رفتار برقرار رہی اور مجھے لگا کہ وہ آکر بانک کو ٹکرا  
 دے گی۔ میں بے اختیار دوسری طرف اتر گیا۔ اگرچہ ٹکری  
 صورت میں میں پھر قح نہیں سکتا تھا۔ مگر نزدیک آکر کار کی  
 رفتارست ہوئی اور پھر اس نے پورا ایک لگا دیا۔ کھیل نے  
 پستول نکالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بانک سنبالو، اب تم  
 چلاؤ گے۔ جیسے ہی میں پیچھے ہٹوں چلا دینا۔"  
 پستول سنبالتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے  
 اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ اسی  
 کیفیت میں میں نے فائرنگ کا شور سنا۔ کھیل گاڑی میں  
 بیٹھے افراد پر فائرنگ کر رہا تھا اور ندیم اس کی مدد کے لیے  
 پیچھے موجود تھا مگر اس نے فائرنگ نہیں کی۔ کھیل نے شاید  
 اپنے پستول کا پورا امیگزین خالی کر دیا تھا اور پھر وہ بھاگتا ہوا  
 آکر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے چلا کر میرے کان میں  
 کہا۔ "چلو نکلو یہاں سے۔"  
 میں نے بے ساختہ ایکسٹریٹر گھمایا۔ بانک تیزی سے  
 آگے بڑھی اور ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے چلی۔ اس  
 کے بعد بھی راستے میں ہم کئی بار حادثات کا شکار ہونے سے  
 صرف اس لیے بچ گئے کہ آج کے دن ہم میں سے کسی کی قضا  
 نہیں آئی تھی۔ ایک جگہ ندیم نے پاس آکر رکنے کے لیے کہا  
 اور یہاں بھی مجھے مشکل سے کچھ میں آیا اور کئی بار کہنے پر میں  
 نے بانک روکی۔ کھیل فوراً اتر گیا اور اس نے غصے سے کہا۔  
 "مرتے مرتے بچے... اسے ہی لانا تھا کیا؟" اس نے  
 ندیم سے پوچھا۔ ندیم نے آرام سے کہا۔  
 "تو اور کسے لاتا؟"  
 "کتی بار مرتے مرتے بچے۔"  
 "یار مرے تو نہیں نا۔" ندیم نے اسے ٹھنڈا کیا۔ "یہ  
 بتا کام ٹھیک سے ہونا؟"  
 "بالکل۔ تین تینوں کو لڑکا دیا۔ سب کو چار چار  
 گولیاں ماری ہیں۔ کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں  
 ہوا۔"

چور تھا۔ میرا تو یہ حال تھا کہ پولیس تو دور رہی، میں نے اپنی  
 بیوی تک کو نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے تھے اس  
 لیے مجھے زیادہ سے زیادہ پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔  
 پھر وہ دن بھی آگیا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ چھٹی کا دن  
 تھا۔ میں ذرا دیر تک سوتا ہوں۔ رفیقہ نے مجھے جگا دیا۔ وہ ٹکری  
 مندلگ رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔ "ندیم کسی کے ساتھ  
 آیا ہے۔"  
 میں اٹھ کر باہر آیا تو ندیم کے ساتھ کھیل موجود تھا۔  
 ندیم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شریف بھائی! ان  
 فٹ تیار ہو کر آ جاؤ۔ ٹائم نہیں ہے۔"  
 "خیریت... میں نے تو منہ بھی نہیں دھویا۔"  
 "بس منہ دھو کر آ جاؤ۔" ندیم بولا۔ "آدمی کھیلے  
 میں واپس آ جائیں گے۔"  
 میں نے اندر آکر منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلے۔  
 آج سے پہلے ندیم مجھے کبھی اتنی امیر جیسی میں لینے نہیں آیا تھا  
 اور نہ ہی اس نے آج تک اس طرح بات کی تھی۔ میرے  
 اندر ہول اٹھنے لگے اور میں مرے ہوئے قدموں سے باہر  
 آیا۔ مجھے کھیل نے اپنے پیچھے بٹھایا اور بولا۔ "ضرورت  
 پڑنے پر بانک چلانا ہوگی۔"  
 "چلا لوں گا۔" میں نے مردہ لہجے میں کہا۔ "خیریت  
 آج اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟"  
 "یار چپ کر کے چلو۔" کھیل نے خطرناک لہجے  
 میں کہا۔ "زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"  
 دونوں علاقے سے نکلے اور ایک مصروف کاروباری  
 مرکز پہنچے۔ میں نے دیکھا راستے میں ندیم ہینڈ فری کان سے  
 لگائے گا سے موبائل پر بات کر رہا تھا بلکہ گرم رہا تھا اور سن  
 زیادہ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے پلٹے سر سے ہو رہا تھا۔  
 شاید اسی لیے مجھے ندیم کے بجائے کھیل نے ساتھ بٹھایا تھا  
 کہ میں گفتگو نہ سن سکوں۔ وہ آواز دبا کر بول رہا تھا۔ کچھ  
 دیر بعد ہم ایک چوراہے پر رکنے۔ وہ بے فکری سے مین روڈ  
 پر رکنے ہوئے تھے اور انہیں قطعی فکری نہیں تھی کہ کوئی ڈبل  
 سواری پر روک سکتا ہے۔ یہاں ٹریفک خاصا زیادہ تھا۔  
 ندیم بدستور موبائل پر لگا ہوا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر کھیل کو  
 اشارہ کیا۔ اس نے بانک موڑی اور آگے روانہ ہو گیا۔ کچھ  
 دیر بعد ندیم بھی ایک سفید کار کے پیچھے آیا۔ اب کھیل اپنے  
 ہینڈ فری پر اس سے مخاطب تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "یہ  
 جگہ ٹھیک نہیں ہے، یہاں رش ہے... ٹھیک ہے، میں روکنا  
 ہوں۔"

چھوڑ کر جاتا تھا اور اگر کوئی ساتھ نہ ہو تو امکان ہوتا ہے کہ  
 کوئی چلتی بانک لے کر نو دو گیارہ ہو جائے گا۔ ایک بار اس  
 نے ایک ہوٹل پر کرکیر پھینکا۔ یہ خوشنما بچوں کی گیند جیسی چیز  
 تھی، وہ بانک سے اترتا تو اس کے ہاتھ میں دیکھ کر میں گیند  
 ہی سمجھا لیکن جب اس نے پھینکا اور خوف ناک دھماکا ہوا  
 تب میں سمجھا کہ اس نے دتی بم پھینک دیا ہے۔ کچھ دیر بعد  
 ایک اور ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے  
 کہا۔  
 "شریف بھائی! آپ کانپ رہے ہو... وہ بس  
 پٹانہ تھا، اس سے نقصان نہیں ہوتا ہے۔ بم ہوتا تو میں اتنے  
 آرام سے پھینکتا؟"  
 میں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ بس دھماکا ہوا تھا اور دھواں  
 پھیل گیا تھا۔ کچھ شیشے ٹوٹے تھے اور لوگ افراتفری میں  
 ہوٹل سے بھاگ نکلے تھے۔ ندیم نے بتایا کہ یہ مخالف سیاسی  
 پارٹی کا اڈا تھا۔ کرکیر پھینک کر ایک طرح سے ان لوگوں کو  
 وارننگ دی گئی ہے کہ اس علاقے میں نہ آیا کریں۔ میں نے  
 تھوک نکل کر پوچھا۔ "اگر وہ نہ مانے تو؟"  
 "تو اگلی بار اصل بم پھینک سکتے ہیں۔ چار پانچ  
 بندے مریں گے تو خود سمجھ میں آ جائے گا۔" ندیم نے بے  
 پرواہی سے کہا۔ میرا دم خشک ہو گیا۔ ایک کرکیر کے دھماکے  
 نے میرے اعصاب اس طرح منتشر کر دیے تھے کہ مجھ سے  
 چائے کی پیالی بھی نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔ سچ سچ کا بم دھماکا  
 شاید میری جان لے لیتا۔ میں نے استعجاب سے  
 "تب پلیز مجھے مت لے کر جانا۔"  
 "آپ فکر نہ کریں، ایسے کاموں کے لیے ایکسپٹ  
 بندہ ساتھ ہونا چاہیے جو دتی بم استعمال کرنا جانتا ہو۔"  
 میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر میری جان چھوٹی نظر  
 نہیں آرہی تھی۔ اتنے عرصے میں میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ ندیم  
 اور کھیل کو مجھ سے خطرہ ہے اور وہ اس قسم کے لوگ تھے جو  
 اپنی ذات پر ذرا سا خطرہ بھی برداشت نہیں کرتے ہیں بلکہ  
 میں حیران تھا کہ کون سی بات انہیں اب تک روکے ہوئے  
 تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے گھر کا واحد مرد اور کھیل تھا۔  
 اگر میں نہ ہوتا تو میرے بیوی بچے اور ماں بے سہارا ہو  
 جاتے۔ اس لیے انہوں نے میرا پتا صاف کرنے کے  
 بجائے یہ حکمت عملی اپنائی تھی کہ مجھے اپنے کاموں میں شامل  
 کر رہے تھے۔ میں رفتہ رفتہ ان کے ساتھ دیکھا جانے لگا تھا  
 اور اگر اب میں پولیس کے پاس جاتا یا ٹارگٹ کلنگ کے  
 بارے میں کسی کو بتاتا تو میں خود بھی پھنستا۔ یہ ان کے دل کا



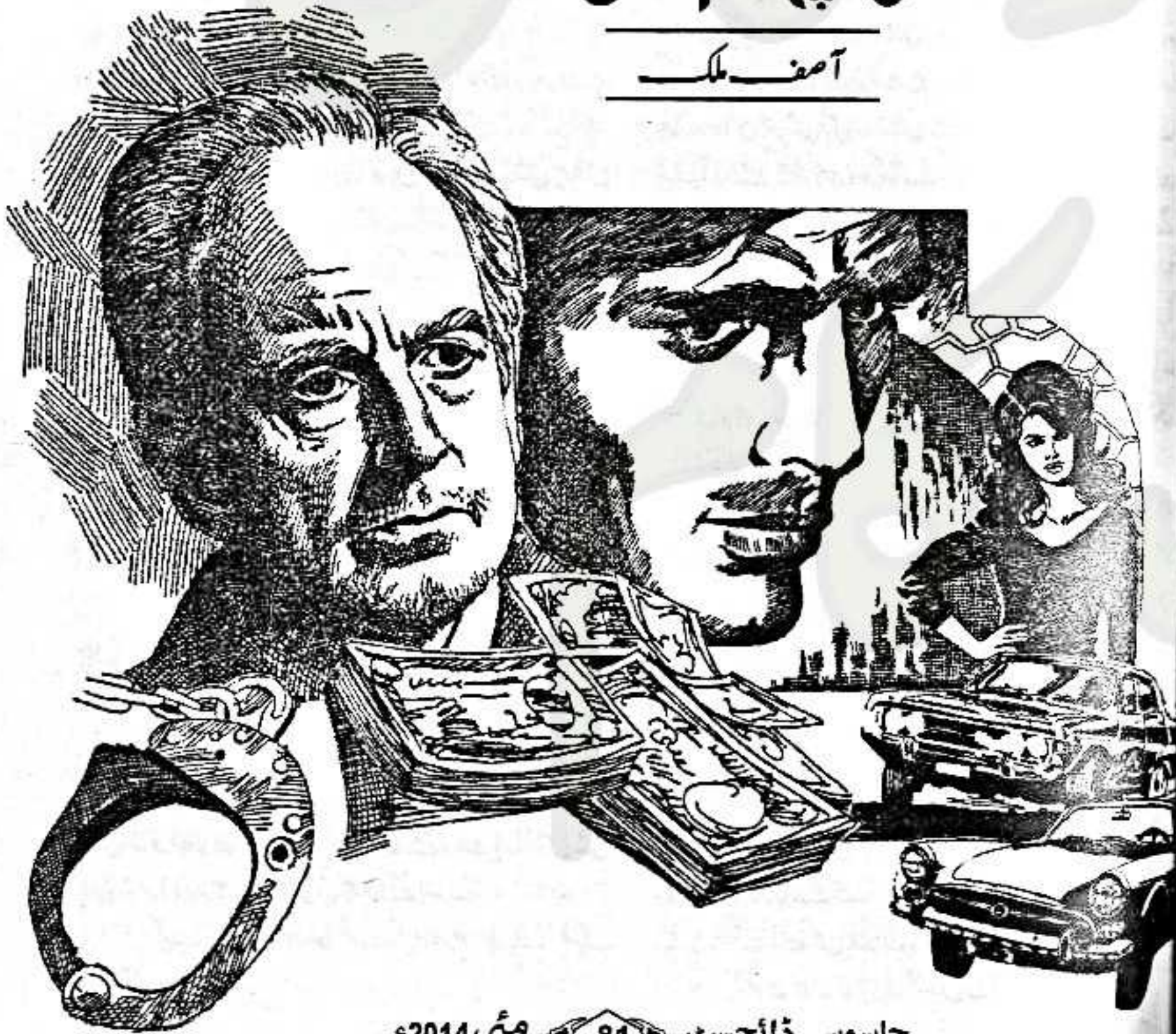
رین اوٹس اس سڑک پر سفر کر رہا تھا جس کے دونوں طرف تاحندگاہ برف ہی برف تھی۔ اس کا رخ ڈیڑھ گھنٹے سے این آر بورڈ کی طرف تھا۔ انتہائی شمال میں مشی گن ریاست اس وقت برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ شدید برف باری کے بعد جاہ جابرف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ویرانوں میں فٹ بھر کے حساب سے برف جمع ہو گئی تھی۔ این آر بورڈ ڈیڑھ گھنٹے سے چالیس کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔ رین شہر میں داخل نہیں ہوا بلکہ باہر ہی ایک بار اور ریسٹوران کے

### لاچ و طمع میں ایک بعد ایک گرفتار ہو جانے والوں کا المیہ

دولت کی دیوی کب مہربان ہو جاتی ہے... کیسے اور کب روٹھ جاتی ہے... پتا نہیں چلتا... احساس اس وقت ہوتا ہے... جب انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... محنت اور کوشش سے اپنے لیے ہر راستہ، ہر کاوٹ کو آسانیوں میں بدلنے کا عزم رکھنے والے نوجوان کی عجیب و غریب داستان... ہر قدم اسے امتحان سے ہمکنار کر رہا تھا۔

## لالچ کہانی

آصف ملک



رفیقہ سچ چھٹی ہوئی تھی اس لیے وہ چلی گئی۔ میں نے وی دیکھا رہا، مختلف چھٹی گھماتا رہا۔ گیارہ بج گئے لیکن چھٹی سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔ جیسے جیسے تاخیر ہو رہی تھی میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ان دونوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں نے کیا کیا تھا اور وہ کچھ لمحے بھی یہاں نازل ہونے والے تھے۔ میں نے وی دیکھا تھا کہ اچانک کال نیل بنی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دوبارہ نیل بنی تو میں لرزتے قدموں سے دروازے تک گیا۔ ہمارے ہاں اس وقت کوئی نہیں آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی موت کے فرشتے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور دل کڑا کر کے باہر جھانکا تو اپنے ایک پڑوسی موجود پا کر میرا کراہا ہوا سانس بحال ہوا۔ وہ بولے۔ ”اس وقت زحمت پر معذرت... وہ دراصل ہمارا دودھ والا آگے کے ہاں دودھ دے گیا ہوگا، ہم گئے ہوئے تھے۔“

”ایک منٹ رکھیں، بیگم تو سو گئی ہیں۔ میں فریج میں دیکھتا ہوں۔ دودھ کتنا ہوگا؟“

”دو گلو ہوگا۔“ انہوں نے کہا۔ میں نے فریج میں دیکھا تو اس میں ایک دو گلو والی تھیلی رکھی تھی۔ میں نے لے جا کر ان کو دی اور واپس آیا تو نی وی پر خبر کی پٹی چل رہی تھی کہ ایک سیاسی پارٹی کے دفتر پر حملہ، دو افراد ہلاک ایک زخمی ہوا ہے۔ میں بے تالی سے تفصیلی خبر کا انتظار کر لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تفصیلی خبر آئی اس کے مطابق ایک سیاسی پارٹی کے دفتر پر چند افراد نے حملہ کیا اور وہاں بیٹے لوگوں پر فائرنگ کی دفتر کے گارڈز کی جوانی فائرنگ سے دونوں حملہ آور ہلاک ہو گئے اور ایک گارڈ زخمی ہوا تھا پولیس نے تفتیش شروع کر دی ہے۔ وہاں موجود عینی شاہد کا کہنا ہے کہ دونوں حملہ آور بانک پر آئے تھے انہوں نے اترتے ہی وہاں بیٹھے لوگوں پر فائرنگ کی کہیں ان کے پستول جام ہو گئے۔ صرف ایک حملہ بڑی مشکل سے ایک فائر کر سکا جس سے ایک گارڈ زخمی اور پھر گارڈز کی جوانی فائرنگ سے وہ دونوں موقع پر جا ہو گئے۔ خبر میں ان کے نام نہیں آئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ندیم اور شکیل تھے۔ ان کے پستول جام نہیں ہوئے تھے بلکہ میں نے میگزین میں جہاں گولیاں ہوتی ہیں تھوڑی تھوڑی ایٹمی ڈال دی تھی۔ اس سے گولیاں پھینک رہ گئیں۔ میں بہت بزدل آدمی ہوں لیکن ان دونوں مجھے مجبور کر دیا تھا کہ یہ قدم اٹھا ہی لوں...

میرے ہاتھ کانپے اور نہ کوئی گڑبڑ ہوئی۔ حالانکہ یہ ذرا مشکل کام تھا۔ جیسے ہی میں نے کام مکمل کر کے وہ چیز واپس دراز میں رکھی، اسی لمحے ندیم اور شکیل تیار ہو کر باہر آ گئے۔ انہوں نے لباس بدل لیے تھے۔ ندیم نے ایک میگزین اٹھایا اور اسے اپنے پستول میں فٹ کیا جبکہ دوسرا شکیل نے اپنے پستول میں لگایا اور ایک ایک اضافی میگزین انہوں نے جیبوں میں رکھ لیے۔ ندیم نے مجھ سے کہا۔ ”شریف بھائی! دفتر بند کر کے چلے جانا۔ ہمارا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ مجھے کیا ضرورت ہے انتظار کرنے کی۔ میری بلا سے تم لوگ کبھی واپس نہ آؤ۔ لیکن میں نے منہ سے کہا۔ ”خیریت... آج کہاں کی تیاری ہے؟“

”ایک خاص کام ہے۔“ شکیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”حریف پارٹی والے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر پھیلا رہے ہیں، ذرا ان کے ہاتھ پاؤں سیٹھے جا رہے ہیں۔“

میں سن چکا تھا کہ ان کے کیا عزائم ہیں اور اب شکیل نے اپنے منہ سے تصدیق کر دی تھی۔ ان کے جاتے ہی میں نے دفتر بند کیا اور گھر چلا گیا۔ میں نے یہ کام کر تو دیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے پسینے آنا شروع ہو گئے تھے کہ اگر انہوں نے چیک کر لیا تو فوراً جان جائیں گے کہ یہ میرا کام ہے اور اس کے بعد میری خیر نہیں ہوگی۔ حریف پارٹی والے مارے جائیں یا نہ مارے جائیں، میری بچت نہیں ہوگی۔ وہ مجھے گھر میں قتل کر کے جائیں گے۔ جیسے جیسے میں اپنی حرکت کے ممکنہ نتائج پر غور کر رہا تھا، میری حالت خراب ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اپنے ڈیڑھ وارنٹ پر خود دستخط کر دیے ہیں۔ بچے سو گئے تھے، میں آ کر کھانا کھاتے ہی نی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ ان کا جو ارادہ تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ بہت بار اباری ہوگی۔ اس صورت میں نی وی پر لازمی خبر آئے گی۔ کچھ دیر بعد رفیقہ نے لاؤنج میں جھانکا۔

”خیریت... آج اس وقت نی وی لگا کر بیٹھے ہیں؟“

میں عام طور سے نو بجے تک بیڈروم میں آ جاتا تھا کیونکہ رفیقہ کا کہنا تھا یہ وقت اس کا ہوتا ہے۔ وہ سارے دن کے دکھ سکھ بیان کرتی تھی اور ہم میاں بیوی اپنی باتیں کرتے تھے۔ مگر اس دن میں دس بجے نی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بہانہ کیا۔ ”بس آج ذرا موڈ ہو رہا ہے۔ تم تھکی ہوئی ہو، جا کر سو جاؤ۔“









# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ فائدہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم وائی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پولیس آفیسر نے اندر جھانکا۔ ”مسٹراؤس۔“

”ہاں، میں ہی ہوں۔“ رین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

بچھنے سے قاصر تھا کہ یہ یہاں کیوں آئی ہے۔ کیا ان دنوں سے کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟ وہ اندر آگئی اور اس کی طرف بڑھایا۔ اس کا بڑھا ہوا پیٹ بتا رہا تھا کہ وہ امید سے بھرپور تھا۔

”سرا! میں جولی این ہوں... ہومی سائڈ ڈیٹیلنگ“

”بیٹھو، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”تمہارے شوروم سے کوئی کار چوری ہوئی ہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”یہ تمہاری ایک کار کا نمبر ہے۔“ جولی نے کہا۔

آگے کیا، اس پر کرسٹر کا نمبر لکھا ہوا تھا۔

رین نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا مگر اس اداکاری کی اور اپنے رجسٹر میں چیک کیا پھر یو۔۔۔ ”ہاں“

ایک کار کا نمبر ہے جو ری کنڈیشن ہو رہی ہے اور اس ورکشاپ میں موجود ہے۔“

”اس نمبر کی کار ایک معاملے میں ملوث پائی گئی ہے۔“

رین کا دل دہل گیا مگر اس نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔ ”کیسی واردات؟“

”تمہیں یقین ہے کہ اس نمبر کی کار تمہارا ورکشاپ میں ہے؟“ جولی نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

”بالکل... میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور جولی کو لے کر ورکشاپ میں آیا جہاں کرسٹر کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کار اور اس کے کاغذات دیکھ کر جولی نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ رین نے پوچھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کس سلسلے میں ہو؟“

جولی نے سوچا اور مسکرائی۔ ”میں ایک بار پھر تمہارا شکر گزار ہوں۔“

جولی کے جانے کے بعد رین اپنے کمرے میں وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں سے کسے رابطہ کرے۔ وہ تک یقیناً لیونیٹا میں کہیں تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن فون نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ فون کی کھنٹی اس نے ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو۔“

”مسٹراؤس۔“ دوسری طرف سے گیپ کی آواز آئی۔

”میرے خدا! تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟ ابھی اسی لمحے اس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون نے جم سے کہا۔ ”تم اس کی نگرانی کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”تم کیا کرو گے؟“

”ایک تو میں کال کر کے اسے بتاؤں گا کہ ہم نے کام کر لیا ہے، دوسرے گاڑی کی نمبر پلیٹ پھر بدلتی ہے۔“

گیپ باہر نکل آیا۔ اس کا رخ ایک بار کی طرف تھا۔ وہ وہاں سے رین کو کال کر سکتا تھا۔ پولیس آفیسر اور دیگر دو افراد کے قتل نے اسے پریشان کر دیا تھا مگر اب اسے ایک چانس اور مل رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔

☆☆☆

رین منہ بنائے بیٹھا تھا۔ جن لائسنس کی رقم پھنسی تھی، ان کے سیریل نمبرز والا کاغذ اس سے کہیں کم ہو گیا تھا اور دوسری طرف سے مسلسل فون پر فون آرہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو آخری فون آیا تھا، اس میں اسے واضح دھمکی دی گئی تھی کہ بات اب قانون تک جائے گی۔ سیریل نمبر پھر سے نکلوانا مسئلہ نہیں تھا مگر دوسری پارٹی نے وعدہ خلافی کی تھی اور اب تک اسے ایڈوائس کی رقم بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس معاملے میں تیزی دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیریل نمبرز کے بغیر وہ گاڑیاں آگے فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ نیل کے عزائم واضح تھے۔ وہ اسے صرف ایک ملازم کے طور پر استعمال کر رہا تھا جبکہ اس نے محنت مالکوں والی کی تھی اور دن رات کوشش کر کے لائف آٹوز کو اس مقام پر لایا تھا جہاں یہ نفع بخش ادارہ بن گیا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ نیل اسے سرے سے الگ نہ کر دے۔

اس لیے رین نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بیٹ سے محبت کرتا ہے اور اس کی خاطر تادان کی رقم ادا کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جب رین نے اسے بتایا کہ اغوا کرنے والوں نے ایک ملین ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے اور نہ دینے کی صورت میں بیٹ کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے تو نیل ایک ملین ڈالرز دینے پر راضی ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آج شام تک رقم کا بندوبست کر لے گا۔ ولیم پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا تھا مگر نیل نے مشورہ مسترد کر دیا۔ رین خوش تھا۔ اس نے زیر لب کہا۔

”سب جائیں جہنم میں... کل تک مجھے کسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں اپنا آٹوز خود کھول لوں گا۔ یہاں کے گاہک میرے پاس آئیں گے۔“

اسی لمحے اس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون

ڈالرز بھی جاتے اور اسے کچھ نہ ملتا۔ یہ سوچتا بھی بے وقوفی تھی کہ ایک بار ایک ملین ڈالرز کی رقم ہاتھ آجانے کے بعد گیپ اور جم اسے ایک ڈالر... بھی واپس کریں۔ دوسری طرف نیل کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے اور کسی صورت اس سے نہیں ہٹے گا۔ رین کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات دیکھ کر ولیم مخصوص انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ روز اول سے رین سے نفرت کرتا تھا۔ نیل کو اس کے خلاف وہی بھڑکا تا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ کہیں بیٹی کی محبت میں آکر نیل دولت میں سے کچھ حصہ اس کے نام نہ کر دے۔ اس صورت میں ولیم کو کم ملتا اور وہ کسی صورت اپنے حصے میں کسی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس نے... شہوم کی نگرانی اپنے ذمے لی تھی تاکہ ہمہ وقت رین پر نظر رکھے اور اس کی خبریں نیل تک پہنچاتا رہے۔ نیل نے اس کی طرف دیکھ کر حکمانہ انداز میں کہا۔

”جیسے ہی ان کی کال آئے، تم مجھے بتاؤ گے کہ رقم لے کر کہاں جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے پاپا۔“ رین نے کہا اور اپنا کوٹ اور ہیٹ پہن کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ولیم نے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے یہ درمیان میں اپنا حصہ بھی رکھ رہا ہے۔“

”اسی لیے میں خود رقم لے کر جا رہا ہوں۔“ نیل نے سر ہلایا۔ ”پھر مجھے بیٹ کی فکر بھی ہے۔ میں اس کی سلامتی اس شخص پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

ولیم سوچ رہا تھا کہ اگر انہوں نے والے بیٹ کو قتل کر دیں تو اس کے راستے کا واحد کاٹا بھی ہٹ جائے گا۔ پھر نیل کی ساری دولت اسے ہی ملے گی۔

☆☆☆

گیپ شام سے ذرا پہلے ڈیٹرائٹ اتر پورٹ کی پارکنگ میں داخل ہوا اور اس حصے میں آیا جہاں باہر جانے والے مسافروں نے اپنی گاڑیاں کھڑی کی تھیں۔ ان پر جی پرف کی موٹی تہ بتا رہی تھی کہ وہ ہفتوں سے وہاں کھڑی تھیں۔ گیپ پارکنگ میں گھوم پھر کر دیکھنے لگا۔ اسے ایک بیوک مناسب لگی کیونکہ اس پر برف کی اتنی موٹی تہ تھی کہ اس کی نمبر پلیٹ بھی چھپ گئی تھی۔ وہ اتر کر نیچے آیا۔ اس نے عقبی نمبر پلیٹ سے برف صاف کی اور پھر اسکو ڈرائیور سے اسے کھولنے لگا۔ اسے کھول کر اس نے آگے والی نمبر پلیٹ کھولی۔ یہ کام اس نے چند منٹ میں کر لیا۔ خالی جگہ اس نے

بھی وہ وہاں موجود تھا۔ صبح نیل راضی تھا کہ وہ ایک ملین ڈالرز اس کے حوالے کرے گا اور وہ جا کر انہوں کاروں سے بیٹ کو واپس لے آئے گا۔ رین نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ سب خوش اسلوبی سے کر لے گا۔ مگر اب نیل نے اچانک پلٹا کھایا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ تاوان کی رقم خود لے کر جائے گا۔ رین کی بات پر اس نے غرا کر کہا۔

”یہ میری رقم ہے اور بیٹ میری بیٹی ہے۔ میں دونوں کی سلامتی کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔“

”پاپا! ان سے میری بات ہوئی ہے اور اگر میرے علاوہ کوئی گیا تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔“

”کیسے بگڑ سکتی ہے؟“ ولیم نے کہا۔ وہ سکون سے ایک طرف بیٹھا تھا مگر رین کو دو سو فیصد یقین تھا کہ نیل کو یہ پتی اسی نے پڑھائی ہوگی۔ اب وہ خود رقم لے کر جانا چاہتا تھا۔ ”انہیں رقم چاہیے... چاہے وہ کوئی بھی لے جا کر دے۔“

”نہیں، انہوں نے واضح کہا ہے کہ میرے سوا کوئی نہ آئے ورنہ ڈیل نہیں ہوگی اور ڈیل نہیں ہوئی تو بیٹ نہیں آئے گی۔“

”بکواس۔“ نیل نے منہ بنا یا۔ ”انہیں رقم سے مطلب ہونا چاہیے اور میں اس معاملے میں تم جیسے ناکارہ آدمی پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں؟ دوسری صورت یہ ہے کہ میں پولیس کو رپورٹ کر دوں، وہ خود ان سے نمٹ لے گی۔“

رین کا دل چاہ رہا تھا کہ سردیوار پر دے مارے۔ اس نے سارا پلان بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ اس نے گیپ اور جم کو تلاش کیا، ان سے رابطہ کیا اور ان سے کام لیا۔ وہ بیٹ کو انہوں کے لے گئے۔ پلان کے مطابق اسے تاوان کی رقم لے کر جانی تھی۔ مگر وہ راستے میں ہی اصل رقم سے صرف چالیس ہزار ڈالرز نکال کر لے جاتا اور ان کو دے کر بیٹ کو لے آتا۔ اسے بیٹ سے محبت تھی اور وہ اس کے بیٹے کی ماں بھی تھی اس لیے وہ اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ کام بھی اس نے دل پر پتھر رکھ کر کیا تھا۔ اس کے پاس ساڑھے نو لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم بچتی اور وہ اس سے اپنا کام کر سکتا تھا۔ مگر اب سب اس کی پلاننگ کے برخلاف ہو رہا تھا۔ پہلے ہی تین افراد بلاوجہ مارے گئے اور پھر گیپ نے بدلتی سے پانچ لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کر دیا تھا۔ مگر یہ بھی قیمت تھا کہ اسے نصف رقم بچ رہی تھی۔

اب نیل مصر تھا کہ وہ خود تاوان کی رقم لے جا کر دے گا۔ اس صورت میں رین کے ہاتھ سے بانی کے پانچ لاکھ

نے انکشاف کیا کہ پرسوں رات انہیں دو آدمیوں نے ہاتھ لگائے تھے۔ ان میں سے جو ذرا موٹی تھی، وہ گیپ کے ساتھ تھی اور اس نے اسے ناٹی مین کا لقب دیا تھا۔ دوسری جو دہلی اور قدر لہی تھی، اس نے ناٹی مین کے ساتھی کو آکس مین قرار دیا تھا۔ کام کی بات یہ تھی کہ ان کے پاس سلور مزدا تھی۔ رات بھر ان کے ساتھ رہی تھیں اور انہوں نے انہیں چھوڑ ڈال دیے تھے۔

”ان کے نقوش کیسے تھے؟“ جولی نے پوچھا تو سوچ میں پڑ گئیں۔

”ناٹی مین چالاک نقوش والا تھا۔“ موٹی نے کہا۔

”جیسے بہت ہوشیار آدمی ہوتے ہیں۔“

”ہوشیار... بالکل وہ ہوشیار ہی ہوگا۔“ جولی نے تعریفی انداز میں کہا۔

”دوسرا بالکل خاموش اور اپنے کام سے کام لےنے والا تھا۔“ لمبی لڑکی نے کہا۔ ”مجھے اس سے خوف محسوس ہوا تھا جیسے وہ اندر سے خوفناک آدمی ہوں۔“

”وہ یقیناً خوفناک ہوگا۔“ جولی نے پھر تعریفی انداز میں کہا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے ملک شیک کے دو گالری پے اور ان سے خاصی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھی تو خاصی مطمئن تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ریڈیو پر آفس میں میری سے بات کی اور اس نے انکشاف کیا کہ سلور مزدا کار جس کا نمبر وہی تھا وہ پہلے ٹولڈو گئی تھی اور پھر پلٹ کر واپس این آر پورٹ ہوئی ہوئی ڈیٹرائٹ کے علاقے لیوونٹا سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلے روز سے لیوونٹا کے علاقے میں سلور مزدا کی تلاش شروع کرے گی۔ وہ گھر گیا تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ جان نے اس کے لیے ڈز تیار کر رکھا تھا۔ وہ ڈز کر کے سونے کے لیے لیٹے تو جان نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

”دو مہینے باقی ہیں۔“

جولی مسکرانے لگی۔ اس وقت وہ عورت بن گئی تھی۔

”ہاں، دو مہینے باقی رہ گئے ہیں۔“

☆☆☆

”پاپا! یہ بہت خطرناک ہوگا بیٹ کے لیے۔“

نے کہا۔ وہ اس وقت نیل کے گھر میں تھا۔ پتھروں اور اس سے بنا یہ عالی شان مینشن ڈیٹرائٹ کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ ولیم کی رہائش ایک ہائی رائز اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی لیکن وہ اکثر بھائی کے ساتھ ہی پایا جاتا تھا۔ اس نے

پولیس آفیسر یہاں سے ہو کر گئی ہے۔ اس کے پاس تمہاری گاڑی کا نمبر ہے... وہ نمبر جس کی پلیٹ میں نے تمہیں دی تھی۔“

”مسٹر اوٹس! صورت حال بدل گئی ہے۔ اس معاملے میں تین لاشیں بھی ملوث ہو گئی ہیں اور اب اسی ادا نیگی پر کام نہیں ہوگا۔“

”تین لاشیں۔“ وہ دہل گیا۔ ”تم نے کیا کیا ہے؟“

”تم نے کیا سمجھا ہے، یہ سب اتنا آسان ہوتا ہے۔ اس میں ایک کوپ بھی شامل ہے۔ اب صرف چالیس ہزار ڈالرز سے کام نہیں چلے گا۔“

”دیکھو، ہمارے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔“

”اسے بھول جاؤ... اب ہمیں پانچ لاکھ ڈالرز چاہئیں۔“

”پانچ لاکھ ڈالرز۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”ہاں اور کل رات تک چاہئیں دوسری صورت میں تمہاری بیوی کی لاش ملے گی، ان نمبر پلیٹوں کے ساتھ جن پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ تم سوچ سکتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ پانچ لاکھ ڈالرز کل رات دس بجے تک تیار رکھنا، میں کال کروں گا۔“

”میری بات سنو۔“ رین چلایا مگر گیپ فون بند کر چکا تھا۔ رین کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دلدل میں پھنس گیا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں اترتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

جولی ہائی وے کے ساتھ مختلف موٹیل اور بارز میں سلور رنگ کی مزدا کے بارے میں پوچھ پچھ کر رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی اور وہ تھک رہی تھی مگر وہ یہ کام کر کے جانا چاہتی تھی۔ ایک رات میں تین افراد کا قتل جن میں ایک پولیس آفیسر بھی شامل تھا، معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دوپہر میں کچھ دیر کے لیے آفس گئی تھی اور وہاں جان کے ساتھ بچ گیا تھا۔ وہ جان سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ صرف اس کے پاس رہنے کی خاطر وہ پولیس کی جاب کر رہی تھی اور اس حالت میں بھی اس نے چھٹی نہیں لی تھی لیکن ایک مہینے بعد اسے لازمی چھٹی لینا پڑتی۔ یہ ساتواں موٹیل اور بار تھا جہاں وہ لوگوں سے سلور مزدا کے بارے میں پوچھ پچھ کر رہی تھی۔ بالآخر اسے کامیابی مل گئی۔ یہ دو کال کر لیں۔ عورت ہونے کے ناتے وہ فوراً اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ انہوں نے





WWW.PAKSOCIETY.COM



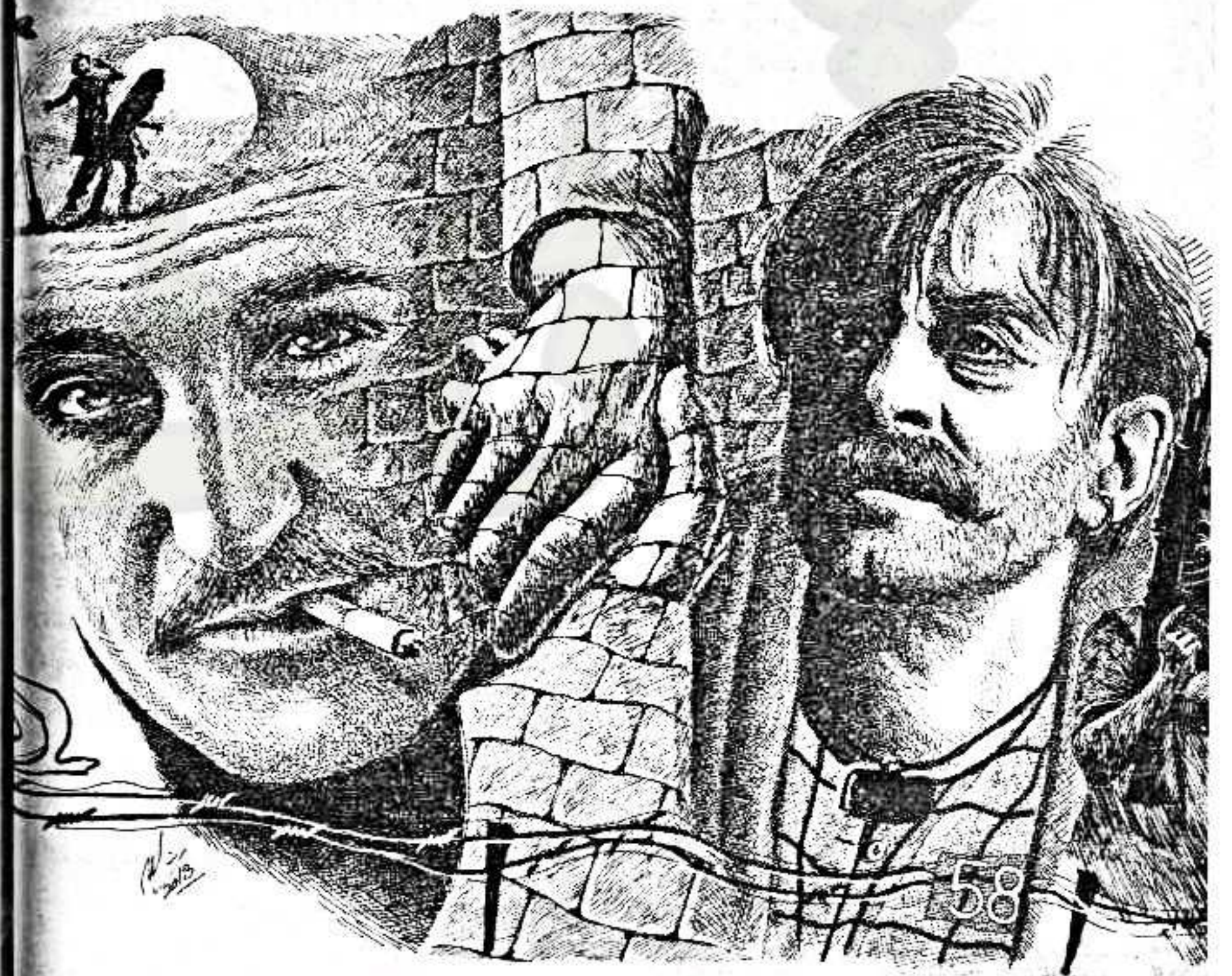
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتہ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب پار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جوا ری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جوا ری... انسانی جذبوں کے رد عمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر تپتی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیٹی بھی اور جگ بیٹی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

# جوا ری

احمد اقبال

گیارہویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان







ہے ان کی؟“  
 ”بیوی کی حیثیت ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔“ وہ  
 لا جواب ہو کے اب غصے میں آنے لگا تھا۔  
 ”سچ کہا تو نے... حیثیت وہ جو شوہر سے دے...  
 چاہے پاؤں کی جوتی بنا کے رکھے یا سر پر چڑھا کے جو روکا  
 غلام بن جائے... مگر دوستی کا تو ایک ہی معیار ہے سارے  
 جہان میں... دوستی کی بنیاد ہوتی ہے بے غرض خلوص کے  
 رشتے پر...“  
 وہ نظر چرا کے بولا۔ ”تجھے شک کیوں ہے میری دوستی پر؟“  
 ”پہلے ہی یہ خوش نہیں مجھے... وقت کے ساتھ دور ہوگی۔“  
 ”اسی دوستی کی وجہ سے اب تو ایک فیملی ممبر ہے۔“  
 ”بکواس... میں اس لیے یہاں ہوں کہ میں ایک  
 چشم دید گواہ ہوں۔ دشمنی کے کھیل کا ایک ممبر... شطرنج کے  
 وزیر کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اسے آخر تک بچا  
 کے رکھا جاتا ہے۔ ایک قیدی ہوں میں بھی تیرا اور تیری اس  
 فیملی کا... سازشی... مکار... بے ضمیر اور خود غرض لوگوں کا  
 ایک ٹولہ جو خون کے رشتوں کی آڑ لیتا ہے... ورنہ اس  
 رشتے کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔“  
 ”تو اس وقت ہوش میں نہیں ہے۔ تجھے اندازہ نہیں  
 کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔“ انور بگڑ گیا۔  
 ”ہوش اب آیا ہے مجھے انور جب میں اپنی آزادی  
 اور زندگی سب کچھ گروی رکھ چکا ہوں۔ تو کیا خون کے  
 رشتوں کی اور محبت کی بات کرتا ہے۔ پہلے اکبر نے کیا کیا تھا  
 تیرے ساتھ... اور اب اکبر کا قتل...“  
 وہ مشتعل ہو کے کھڑا ہو گیا۔ ”تو سمجھتا ہے میں نے  
 مارا اسے؟“  
 میں گھوم کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔  
 ”نہیں... میں نے یہ نہیں کہا۔ لیکن اسے انہی میں سے کسی  
 نے مارا جو اس کے ساتھ خون کے رشتے کے دعوے دار  
 تھے... یہ کھلی حقیقت ہے۔ کسی کے نہ ماننے سے سچ بھی  
 جھوٹ نہیں بن سکتا۔ اگر اس کی موت کو طبعی قرار دے دیا گیا  
 ہے تو میں بھی خاموش ہوں۔ لیکن ہر چشم دید گواہ کی زندگی  
 داؤ پر لگ جاتی ہے۔ میری بھی لگ چکی ہے۔ کیا ایک  
 دوست مجھے بچالے گا؟“  
 ”آج تک میں ہی تجھے بچاتا رہا ہوں...  
 فرید الدین سے تجھے ملک سلیم اختر بنانے والا میرے سوا  
 کون تھا۔ میں یقین دلاتا ہوں تجھے کہ میرے ہوتے کوئی تیرا  
 بال بیکا نہیں کر سکے گا... تو بہت فیشن میں ہے اس وقت۔“

ہوں۔ ورنہ پیر صاحب کے معاملات سے مجھے کیا؟“  
 انور نے گہری سانس لی۔ ”اوکے... تو جا... میں  
 چہرے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا۔ تیرے وعدے پر مجھے  
 پورا اعتبار ہے۔ بس ایک دو دن میری خاطر رک جا۔ کچھ  
 معاملات ایسے ہیں کہ مجھے تیرا مشورہ اور تیری مدد کی  
 ضرورت ہوگی۔ یہاں اور کون ہے جس پر میں بھروسہ  
 کروں... کون تھا تیرے سوا دوست میرا... تیرے بغیر  
 میں بہت اکیلا اور بے سہارا محسوس کروں گا۔“  
 میرے لیے انور کی جذباتی اپیل کو مسترد کرنا مشکل  
 ہو گیا۔ ”چل ٹھیک ہے، میں اس وقت تک جانے کی بات  
 نہیں کروں گا جب تک تو خود مجھے اس کی اجازت نہیں دے  
 گا۔ ابھی تجھے ضرورت ہے میری تو میں ہوں یہاں...  
 تیرے ساتھ۔“  
 وہ میرے گلے لگ گیا۔ ”مجھے معلوم تھا تو اتنا خود غرض  
 اور کہینہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے مشکل وقت میں تنہا چھوڑ جائے۔“  
 اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا  
 کہ میں کوئی جذباتی غلطی تو نہیں کر رہا ہوں۔ یہ زمین  
 جاگداد، نام و نسب، انا پرستی اور خاندانی عداوتوں کا کبھی ختم  
 نہ ہونے والا سلسلہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں بننا تھا،  
 خواہ اس میں انور کی دوستی کا حوالہ ہو۔ یہ سراسر بجرمانہ، غیر  
 انسانی اور غیر اخلاقی جنگ تھی۔ مجھے اس میں ایک فریق بننے  
 کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں انور دوستی کے نام پر میرا جذباتی  
 استحصال تو نہیں کر رہا؟ ایسا نہ ہو کہ میں کچھ قدم رکھوں  
 اور دلدل میں اتر جاؤں؟ ابھی امید زندہ ہے، دل میں  
 نورین کے آتش عشق کا شعلہ فروزاں ہے۔ وہ میری آرزو کا  
 حاصل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو میں اس دلدل کا اسیر ہو جاؤں۔  
 میرے لیے ممکن نہ رہے کہ میں اپنی جستجو کا سفر جاری رکھ  
 سکوں اور فاصلہ بڑھتا جائے۔ وقت گزرتا جائے اور اس کی  
 صورت کا نقش بھی دھندلا جائے۔ جیسے بہت پرانی ہو جانے  
 والی تصویریں شناخت سے محروم ہو جاتی ہیں۔  
 معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پیر تھا جب میں جاگا۔  
 یا میں نے محسوس کیا کہ میں جاگا ہوں اور میں نے پھر اسے  
 دیکھا۔ وہ تاریکی کا ایک حصہ تھی لیکن میری نظر اسے یوں  
 دیکھ سکتی تھی جیسے اس کا وجود روشن ہے۔ کسی اسپاٹ لائٹ  
 میں بس وہی نظر آ رہی ہے اور مجھے جگانے والی اس کی آرزو  
 نہیں تھی۔ اس کی خوشبو نے مجھے جگا دیا تھا۔ یوں جیسے رات  
 میں میرا نام لیا ہو اور میں جاگا تو ذہنی طور پر پوری طرح  
 مستعد تھا... مجھ پر نیند کا کوئی اثر نہ تھا۔

جواہر  
 وہ کھلے دروازے سے اندر آ کے چند قدم کے فاصلے  
 پر رک گئی تھی۔ اس کے پیچھے دروازے کا خلا ایک نیم روشن  
 مستطیل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ”نورین! یہ تم ہو؟“ آواز  
 میرے حلق سے پھنس کر نکلی۔  
 ”ہاں... پھر آتا پڑا مجھے۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔  
 میں ایک دم اٹھنے لگا۔ ”وہاں کیوں کھڑی ہو...  
 میرے قریب آؤ۔“  
 وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں خاور! میرے  
 قریب مت آؤ۔“  
 ”تم میرے پاس آئی ہو... تو پھر یہ دوزی کیوں؟“  
 میں اور آگے بڑھا۔  
 وہ مزید پیچھے ہوئی۔ ”تم جتنا آگے آؤ گے، میں اتنا  
 پیچھے ہٹوں گی۔ اس دروازے سے نکل گئی تو پھر تمہیں نظر نہیں  
 آؤں گی۔“  
 میں رک گیا۔ ”یہ سب کیا ہے نورین؟ کیا تم صرف  
 میرا خیال ہو؟“  
 ”عالم تمام حلقہ زدام خیال ہے۔ یہ شعر تم پڑھتے  
 تھے۔ تم نے بتایا تھا کہ غالب کا ہے ورنہ مجھے کہاں معلوم  
 تھا۔ نہ مجھے شاعری کبھی سمجھ آئی نہ میں نے پڑھی۔ لیکن  
 تمہاری ہر بات مجھے یاد ہے۔ جو تم کہتے تھے میں سمجھ لیتی  
 تھی۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مجھے یاد ہے۔ جیسے  
 میرے دماغ میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح محفوظ ہو گیا۔ میں یہ  
 بھی بتا سکتی ہوں کہ کس دن تم نے مجھ سے کیا کہا تھا اور  
 کیوں... خود مجھے حیرانی ہوتی ہے کیونکہ کسی اور کی کوئی بات  
 مجھے ایسے یاد نہیں رہتی۔“  
 ”میں نے تمہیں دیکھا تھا... پیر صاحب کی درگاہ  
 پر... اس وقت تم نے خود کو نورین تسلیم کرنے سے بھی انکار  
 کر دیا تھا۔“  
 ”ہاں، میں نے کہا تھا کہ میں فاطمہ ہوں۔“  
 ”ایسا کیوں کہا تھا تم نے نورین... کیوں جھوٹ بولا  
 تھا مجھ سے؟“  
 ”وہ جھوٹ نہیں تھا... اس وقت میں فاطمہ تھی۔“  
 ”مگر میں نے معلوم کر لیا تھا۔ تمہارا سراغ لگا لیا تھا۔  
 تم مجھے چھوڑ کے کیوں چلی گئی تھیں؟“  
 ”تمہیں چھوڑ کے فاطمہ گئی تھی، وہ مجبور تھی۔ اگر میں  
 نورین ہوتی تو کیا تمہیں چھوڑ کے جاتی؟“  
 ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے... اب تم کیا  
 ہو... فاطمہ یا نورین؟“







”ایسا میں نے روحوں کے بارے میں سنا ہے۔ نیک ارواح کے ساتھ خوشبو آتی ہے لیکن وہ زندہ لوگ نہیں ہوتے۔ تم کہتے ہو نورین زندہ ہے... پھر وہ روح بن کے کیسے آتی ہے؟“

”یہ سب مجھے نہیں معلوم... لیکن خوشبو اس کی ہوتی ہے۔ کسی دن تمہیں بھی یقین آجائے گا جب تم اس سے ملو گی۔ میں جب پہلی بار اس سے ملا تھا تو وہاں اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا تھا کہ میں صرف اس کی آواز سن سکتا تھا۔ لیکن آواز سننے سے پہلے میں نے اس خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ اور میں ڈر گیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک پرانی آسیب زدہ حویلی تھی۔ مشہور تھا کہ اس جگہ پر آسیب ہے۔ نورین وہاں چھپی ہوئی تھی۔ میں جیل سے فرار ہو کے وہاں چھپا تھا۔ نورین کی خوشبو نے میرے حواس کو حائل کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں ہمیشہ مجھے وہی خوشبو اس کے وجود سے پھوٹی محسوس ہوئی۔ کئی ہفتے اور اب کئی ماہ بعد جب اس کا وہ عروسی جوڑا بھی نہیں ہے اور وہ بازار سے خریدے ہوئے عام کپڑے پہنتی ہے، میں جانتا ہوں کہ اس کے پاس نہ کوئی عطر تھا نہ پرفیوم... اور ایسی کوئی چیز میرے ساتھ اس نے بھی نہیں لی تھی... اب دو ہی باتیں ہیں یا تو میرے دماغ میں وہ خوشبو بس گئی تھی۔“

”کیا ایسا ہوتا ہے؟“

”دیکھو، میں اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق یہ بات کہہ رہا ہوں۔ تمام حواس کا تعلق دماغ سے ہے۔ دیکھنا... سننا... گرم ٹھنڈا... سختی نرمی... ذائقہ... بھوک پیاس... سب دماغ محسوس کرتا ہے۔ خوشبو کو دماغ پہچانتا ہے۔ بتاتا ہے کہ خوشبو یا بدبو کس چیز کی ہے تو نورین کی خوشبو میرے دماغ میں ہے۔“

”اور دماغ اس لیے محسوس کرتا ہے کہ وہ نورین ہیں سے یوں پھوٹی ہے جیسے گلاب یا چنبیلی میں سے۔“

”ہاں... مگر وہ سب سے الگ ہے۔ وہ نورین کی خوشبو ہے۔“

”انسانوں کے جسم سے یو آتی ہے یہ تو سنا ہے... یو پینے کی ہوتی ہے مگر کسی خوشبودار انسان کے بارے میں نہیں سنا۔“

”مجھے پتا تھا تم نہیں مانو گی۔ مگر جو میرے لیے حقیقت ہے اسے میں کیسے جھٹلا دوں؟“

”کیا کبھی کسی اور نے بھی یہ کہا؟“

”آج صبح تم نے کہا تھا اور نورین نے کہا تھا۔ کل رات جب وہ آئی تھی تو اپنی خوشبو ساتھ لائی تھی اور میرے کمرے

میں وہی خوشبو تھی۔“

”وہ تمہارے خواب میں آئے تب بھی اس کی خوشبو کمرے میں بھر جاتی ہے... جو دوسرے محسوس کر سکتے ہیں؟“

”اگر ایسا ہے تو میں کیسے کہوں کہ نہیں ہے۔ اور گزشتہ رات میں وہ آئی تو میں سوتے سے اٹھا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اور وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور جب میں نے اس کو چھونا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھے منع بھی کیا تھا مگر میں دیوانگی میں اور آگے لپکا تو دردازے سے نکل گیا۔ میرا سر لگا تھا دردازے پر... اور آواز پر گارڈ آیا تھا۔ ظاہر ہے چوٹ اتنی سخت تھی کہ میں کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے تمہارے سوا کسی کو بھی سمجھانے یا قائل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور تم بھی مانو نہ مانو... لیکن یہ میرا احساس کا تجربہ تھا۔ میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ میں انور کو بتا دیا ہے کہ مجھے جانا ہے۔“

”تم کیسے جا سکتے ہو... تم چشم دید گواہ ہو؟“

”انور نے اجازت دے دی ہے مجھے... میں وعدہ کیا تھا کہ میں گواہی کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ میں رابطہ رکھوں گا۔“

”انور کہاں یقین کرنے والا ہے۔ اس نے ٹال دیا تمہیں۔ ورنہ تم ہی بتاؤ... تم کدھر جاؤ گے؟ مشرق میں مغرب میں... شمال کی طرف یا جنوب کی طرف... کہاں سے رابطہ رکھو گے اور کیسے... پیشی والے دن کہاں سے آگے اور کیسے؟“

”ریشم! مجھے جانا ہے اور میں جاؤں گا۔ انور اجازت دے نہ دے... میں نکل جاؤں گا کسی بھی دن۔“

”کسی بھی دن؟“ اس نے میرے الفاظ کو زیر لہجہ دہرایا۔

”ہاں، کسی بھی دن... کسی بھی وقت... اگر کسی میرا راستہ روکا تو پھر مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“

”سنو... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں اٹھائی اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو انور قریب آچکا تھا۔ انور نے کچھ فاصلے پر رگھی کرسی اٹھائی اور ہمارے پاس آ کے گیا۔ تین دن میں انور اتنا بدل گیا تھا کہ اس کی صورت کے خوف آتا تھا۔ بیک وقت اسے بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی عام آدمی کی زندگی کے روزمرہ مسائل جیسا نہ تھا۔ حویلی کے حاکم اور اب اس جدی













# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم ڈائٹی، نارل کوالٹی، کمپریٹ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اندھرا کر کے بھی میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ کیا جو کچھ چودھری صاحب نے کہا اور میں نے کہا... اس کا پتہ ریشم کو چلے گا؟ کان تو دیواروں کے بھی ہوتے ہیں اور یہاں سب کی آنکھیں خفیہ کیمرے میں اور سب کے کان خفیہ مائکس... کیا اب اسکی کوئی صورت ہے کہ میں ایسے جذباتی اہال سے ہونے والے نقصان کی تلافی کر سکوں؟

انور نے کہا تھا کہ صبح بات کریں گے مگر کیا اب وہ بات کرے گا؟ اور بات کرے گا تو کیا بات کرے گا... یہ ایسے اندیشے تھے جو صبح ہی دور ہو سکتے تھے۔ رات کے آخری پہر بڑی کوشش کے بعد میں سونے کے قابل ہو گیا اور اس کا نتیجہ حسب توقع یہ نکلا کہ صبح بہت دیر تک سوتا رہا۔ مجھے چودھری صاحب کے کمرے میں کچھ پہچل نظر آئی۔ انور دو بار باہر آیا اور پھر اندر چلا گیا۔ دو تین ملازم آتے جاتے دکھائی دیے۔ میں خود جا کے خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انور نکلا اور سخن کر اس کر کے سیدھا میری طرف آ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ صوفے پر گر گیا۔ اس کا چہرہ پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”ناشٹا کیا تو نے؟“  
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی اٹھا ہوں... غسل کر لوں پہلے۔“  
”چل نہا کے آ... میں نے بھی ناشٹا نہیں کیا ہے ابھی تک۔“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”کیا ہوا... تو بہت اپ سیٹ ہے؟“

”یہ پوچھ کر کیا نہیں ہوا... ابا جی کی طبیعت بگڑ گئی ہے... ڈاکٹر جلالی کچھ بتاتے ہیں... کہتا ہے دعا کرو۔“  
”تو باپوں مت ہو... وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“  
”یار تسلی کے ان الفاظ کا کیا فائدہ؟ کیا میں جانتا نہیں کہ اب وہ ٹھیک نہیں ہو سکتے... مجھے تو یہ احساس ہوتا ہے کبھی کبھی کہ میں اور ڈاکٹر جلالی اور ہم سب کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ صرف ان کی اذیت کے عذاب کے طویل اور طویل کر رہے ہیں لیکن میں کوشش ترک بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے یورپ میں دیکھا ہے۔ لواحقین اور ڈاکٹر مشفق ہوں تو قانون اجازت دیتا ہے کہ مریض کو سکون سے مرنے دیا جائے۔ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے بس اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔“

ایک خادمہ ٹرے اٹھا کے لائی اور ناشٹا ہمارے

”پاگل ہو گیا ہے تو۔“ وہ مجھے میرے کمرے کی طرف کھینچ کر لے گیا۔  
”رہنے دے انور... کون پاگل ہے... کس کو پاگل بنایا جا رہا ہے، میں سب جانتا ہوں۔ مجھے بتا کہ تیری اس بات کا میں کیا مطلب لوں؟ تو اب ریشم سے شادی نہیں کرے گا؟ تو اب تک اسے بے وقوف بنا رہا تھا اور چودھری صاحب کو بھی... مجھے بھی۔“  
”یار ہم صبح بات کریں گے۔“

”اس وقت بات کرنے میں کیا ہے۔ یہ ڈیل گیم میرے ساتھ ہی نہیں، یہاں سب ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ تو بھی... شاید بھی... چودھری صاحب بھی... اپنا بیٹ کا یہ ڈراما بھی ڈیل گیم ہے۔ اس کا مقصد مجھے کہیں جانے نہ دینا ہے... لیکن انور... اب تو مجھے زنجیریں پہنا کے ڈال دے تہ خانے میں تو مجھے تعجب نہیں ہو گا۔ مجھے صرف اسی طرح روکا جاسکتا ہے اور کسی طریقے سے نہیں۔“

انور مجھے دروازے پر چھوڑ کے چلا گیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ میرا کھراچ اتنا کڑوا تھا کہ اس کی سختی نہ چودھری سے برداشت ہوئی تھی اور نہ انور سے قبول کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے ایک گلاس پانی حلق میں اٹھایا اور بیڈ پر گر گیا۔ آہستہ آہستہ میرا بلڈ پریشر کم ہونے لگا۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ خود پر کنٹرول منوا کے میں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ معاملات بڑے سیاسی مصلحت کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور دونوں فریق اپنے اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سمجھوتے کو عملی شکل دے رہے تھے کہ اچانک ہونے والے ایک سوال نے میری عقل کا فیوز اڑا دیا اور میں جذبات کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ چودھری کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ریشم سے شادی کی بات اتنا بڑا دھماکا کرے گی... لیکن دھماکا ہو گیا تھا۔ اس کا نقصان میرے سوا کسی کا نہیں ہوا تھا۔ چودھری کی اور انور کی پوزیشن محفوظ تھی۔ ریشم ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ شاید مجھے بھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا کہ انور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کسی اور کی بات بھی کیسے کی جاسکتی ہے۔

انور کیا کرنا چاہتا تھا، کیا کر چکا تھا اور کیا کرے گا ریشم کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں رہی تھی اور وہ خاموشی سے نکل جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ خدا کا ہزار شکر ہے کہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ راز فاش نہیں کیا۔

درمیان رکھ کے چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ باپ کی بیماری کے علاوہ بھی انور کسی پریشانی کا شکار ہے۔ ”یار! اس کے علاوہ بھی ایک مسئلہ ہے۔“ میرا شک فوراً اس کی زبان پر آ گیا۔ ”سارے مسئلے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔“

”اور کیا ہے؟ کوئی تفتیش کا مسئلہ ہے؟“

”اس سے نمٹ لیں گے پیر صاحب... اور پولیس انہیں پکڑ کے ٹانگ دیتی ہے تو میری بلا سے... ریشم حویلی میں نہیں ہے۔“

میرا ہاتھ رک گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”میں نے کون سی فارسی بولی ہے... ریشم کہیں چلی گئی ہے۔“

”کہاں چلی گئی ہے... کہاں جا سکتی ہے وہ... ناشا جاری رکھ۔“

اس نے کافی کامگ اٹھالیا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا کچھ بھی کھانے کو... دماغ میرا بھی اسی سوال میں الجھا ہوا ہے کہ وہ کہاں گئی اور کیوں... مجھے شک ہے کہ وہ... اسے اپنے ساتھ لے گئی۔“

”یہ اتنی بڑی گالی کس کے لیے ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہی... سلونی اور کون... مجھ سے تو آج صبح ہی بات ہوئی تھی۔ اس نے ماں سے اور شاہینہ بھابی سے کل کہا تھا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔“

”شادی... اچانک؟“

”اچانک کیا... اس کا وہی پرانا یار... رکھیلا... بے غیرتی کی بھی حد ہوتی ہے کوئی... پہلے جب سلونی گئی تھی تو اسی کے ساتھ رہی تھی اور لاہور میں کیا کرتی تھی؟ جسم فروشی... یہی ٹیکسی والا رکھیلا... پہلے رکشا تھا اس کے پاس... یہ لے جاتا تھا سلونی کو ہوٹلوں میں ہر رات... اور یہ بعد میں خود پسپا ہو گئی تھی تو وہ لڑکیاں لاتا تھا اور یہ دوسرے گاہکوں کو پسپائی کرتی تھی اور اس پر دعوے کہ سلونی سے سچی محبت کرتا ہے... جرم زادہ۔“

”یہ سب چھوڑ... ریشم کی بات کر۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ ورغلا کے لے گئی ریشم کو اپنے ساتھ... اس کا تو پھر یہی وعدہ ہوگا... بھولی بھالی لڑکیوں سے پیشہ کرانا... پتا نہیں اس نے کیا سنہرے خواب دکھائے ریشم کو...“

”یار انور... وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں تھی کہ سلونی کے ورغلانے سے تجھے چھوڑ کے چلی جائے۔“

”اس قاحشہ نے ریشم کو ایکسپلاٹ کیا۔ اسے

میرے خلاف بھڑکایا... تو دیکھ کہ میں اسے پھر حویلی میں لایا اور غیرت سے زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ کس چیز کی کمی تھی اسے یہاں... اس کی ہر ضرورت پوری ہوتی تھی اور پیسا بھی بہت مل جاتا تھا۔ یہاں تنخواہ تو کسی بھی ملازمہ کی مقرر نہیں... ضرورت سب کی پوری ہو جاتی ہے۔ سلونی کو پہلے کی طرح ہاؤس کیپر کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ملازموں پر کنٹرول رکھتی تھی۔ آج کل تو مہمان خانہ بھی ویران پڑا رہتا ہے۔ اباجی کے زمانے میں اور اکبر کے دور میں بہت لوگ آتے تھے۔ سب عیاش اور شوقین مزاج... کچھ شکار کے بہانے کچھ تفریح کے لیے... ان سب کی ہر طرح خاطر مدارات سلونی کے ذمے تھی۔ ہر طرح کا مطلب ہے کوئی اسے پسند کرے تو مہمان کو انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب تو وہ کچھ نہیں تھا۔ کیا اس نے تجھ سے بات کی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے؟“

میں چونکا۔ ”نہیں۔“

”مجھ سے بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔ ماں جی کو بتایا... اور بھابی کو... اب ان دونوں نے سلونی کو حویلی میں مجبوراً قبول کر رکھا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کس تماش کی عورت ہے اور سب کی محبوبہ بنی ہوئی ہے۔ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے... باتیں اچھی کرتی تھی اور مردوں کا دل پہلانا جانتی تھی۔ صورت اتنی اچھی نہیں تھی مگر بڑی بھی نہیں تھی اور خود بہت نخرے کے ساتھ رہتی تھی۔ میری ماں اور بھابی تو ہیں خاندانی شریف زادیاں مگر اپنے گھر کے مردوں کی ساری عیاشی کو برداشت کرنا ان کی عادت ہے۔ ان کا بس چلتا تو سلونی کو ایک دن حویلی میں رہنے نہ دیتیں۔ اب اس نے اجازت مانگی کہ میں شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے تو انہوں نے کہا کہ جس کم جہاں پاک... کل کی جاتی آج ہی جاؤ... ماں نے اجازت دے دی تو اباجی اب کیا روک لیتے۔ اس نے صبح مجھ سے ذکر کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ چودھری صاحب نے بھی اسے اجازت دے دی ہے۔ ماں جی اور بھابی کو بھی بتا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اچانک شادی کا فیصلہ کر لیا تم نے تمہاری مرضی... میں روکنے والا کون... اس نے بتایا کہ ابھی رکھیلا آئے گا ٹیکسی لے کر تو میں چلی جاؤں گی... وہ کب گئی... میں نے نہیں دیکھا... میں اباجی کو دیکھ رہا تھا۔“

”کسی اور نے تو دیکھا ہوگا؟“

”ہاں گاؤں نے دیکھا تھا۔ ایک وین آئی تھی جس میں سلونی کا سامان رکھا گیا۔ جاتے وقت وہ کسی سے ملی گئی

نہیں۔ وین ڈرائیور وہی تھا رکھیلا... ہاں مجھے صبح اس نے بتایا تھا کہ وہ ملتان جائے گی اور وہاں سے کراچی۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی جھوٹ تھا۔“

”تو کیسے شک کر رہا ہے کہ وہ ریشم کو لے گئی؟ کسی نے دیکھا ریشم کو ساتھ جاتے؟“

”یہی تو عجیب بات ہے۔ ریشم کو کسی نے باہر جاتے نہیں دیکھا۔“

”پھر تجھے یہ خیال کیوں آیا کہ وہ سلونی کے ساتھ چلی گئی؟“

انور نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ریشم بدگمان اور ناراض تھی مجھ سے... اس کا رویہ بدل گیا تھا میرے ساتھ... خصوصاً جب سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور وہ اسپتال گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ شاہینہ نے اسے زہر دیا۔“

”یہ شک کی بات نہیں... حقیقت ہے... شاہینہ نے پہلے کہا کہ اس نے ابارش کی گولیاں کھائی تھیں... جو انور مجھ سے لے گیا تھا کیونکہ ریشم کو ان کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ یہ کتنا شرمناک جھوٹ تھا... تمہارا نہیں؟“

”ہاں، جھوٹ تھا۔“ انور نے تذبذب کے ساتھ بادل ناخواستہ اقرار کیا۔ ”لیکن اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔“

”شاہینہ نے سلونی کا نام لے کر کہا تھا کہ ریشم ہر رات تیرے ساتھ ہوتی ہے۔ تیرے کمرے میں... اور اس کا نتیجہ تو سامنے آتا ہی تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اسپتال میں ریشم کو سمجھانے کی اور... شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر برہم ہو گئی کہ ایسا بے سرو پا اور شرمناک جھوٹ کس نے بولا؟ کیا اس نے تجھ سے یہ نہیں کہا ہوگا... ضرور کہا ہوگا... مگر تو نے کچھ نہیں کیا۔“

”میں... کیا کرتا؟“

”تو نے بھابی سے پوچھا تھا؟“

”ہاں، پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کون بدنام کر رہا ہے مجھے... پھر کیا میں تجھے اس کے سامنے لے جاتا یا عدالت لگا کے ریشم کو وہاں پیش کرتا؟ ایسا فساد کھڑا کرتی وہ... اور انجام اس کا وہی ہوتا جو میں جانتا تھا... بھابی کی بات سچ تسلیم کی جاتی۔ تیری یا ریشم کی نہیں... چنانچہ میں اسے گول کر گیا۔“

”اور وہ گولیاں کیا تھیں جو تو لایا تھا اس سے؟“

”میں نے کہا تھا کہ... ریشم اپ سیٹ ہے... اسے

نہیں نہیں آرہی ہے۔ وہ خود بھی نیند کی گولیاں کھانے لگی ہے... اس نے وہی دی تھیں مجھے۔“

”بے وقوف آدمی... اس نے ریشم کو گندم کے کیڑے مارنے والی زہر کی گولیاں دے دی تھیں... جو گندم کے ذخیروں کو محفوظ رکھنے میں کام آتی ہیں۔“

وہ میرا منہ تنکنے لگا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو...؟“

”وہی جو سچ ہے... اور مجھے شک ہے کہ تو بھی یہ سب جانتا تھا مگر تو نے بڑی بھابی کو بچایا تھا... ورنہ پولیس کیس بن جاتا... اس کی عزت خاندان کی عزت تھی۔ اس پر ریشم کو قربان بھی کیا جاسکتا تھا۔“

وہ چلایا۔ ”خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔“

میں نے بیڈ کے نیچے سے فائل نکالی اور اسے تھما دی۔ ”یہ رپورٹ میں نے اسپتال سے لی تھی۔ اسے دبا دیا گیا تھا۔ میں نے اسے نکلوانے کے لیے دس ہزار دیے اور ایک قاحشہ کے ساتھ رات بسر کی۔ پھر اس نے ان رومی دستاویزات میں سے رپورٹ نکالی جن کو اگلے دن ضائع کر دیا جاتا۔“

بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے فائل کھولی اور اس میں لکھی ہوئی ڈاکٹری رپورٹ پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ ”اس سے تو کچھ بھی پتا نہیں چلتا... تو نے کیسے سمجھ لیا؟“

میں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اسے لے جا ڈاکٹر جلالی کے پاس... اسی نے مجھے بتایا تھا... مگر اسے اور کچھ پتا نہیں... نہ یہ کہ رپورٹ کس کی تھی اور یہ واردات کہاں ہوئی تھی... وہ تجھے بھی سمجھا دے گا۔“

انور کسی فانیج زدہ شخص کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ ”کاش یہ مجھے پہلے معلوم ہو جاتا۔“

میں اس کا مذاق اڑانے کے انداز میں گئی سے ہنسا۔ ”پہلے معلوم ہو جاتا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ بڑی بھابی کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ تو ڈرتا تھا اس سے... اور مصلحت کے تقاضے تیرے پاؤں کی زنجیر آج بھی ہیں۔“

”لیکن... ریشم آج مجھے کیوں چھوڑ گئی؟ یہ بات پرانی ہے۔“

”تو نے مان لیا کہ وہ چلی گئی ہے؟“

”ہاں وہ حویلی میں نہیں ہے تو پھر جا چکی ہے اور سلونی کے ساتھ... اب میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ ریشم نے ایسا کیوں کیا؟“

”ہاں، اس نے روزینہ کی وجہ سے ایسا کیا۔“





# کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عنبر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوالیں۔

**المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)**  
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)  
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان  
**0300-6526061**  
**0301-6690383**  
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

”جھوٹ... تو ملک سلیم اختر بھی نہیں ہے۔ اور میں بھی وہ نہیں کہ جو تھا... میں نے ریشم کو دھوکا دیا۔ میں بڑا سچے خان بننا ہوں مگر میں محبت میں ثابت قدمی سے اس کے ساتھ کھڑا نہ رہ سکا۔ میں روزینہ کو قبول کرنے سے انکار نہ کر سکا حالانکہ دل سے میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری شریک حیات ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں تیری بات سمجھ گیا۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں خاندانی زنجیروں کو توڑ نہیں سکا... بغاوت نہیں کر سکا... کچھ میری کمزوری... کچھ مجبوری... آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں وہاں ہی کیوں آیا اس دلدل میں گرنے کے لیے۔“

”چل چھوڑ انور... جو ہونا تھا ہو گیا۔ تو اپنی گلست کا اعتراف کرے نہ کرے... کیا فرق پڑتا ہے... آگے کا سوچ۔“

”ابھی میرا دماغ ماؤف ہے... میں کیا سوچوں؟“

”دیکھ انور! رونے اور بچھتانے سے بھی کیا ہوگا۔ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اب تو اپنے گھر کی فکر کر... اتنی بڑی جائداد کا اکیلا مالک ہے، اس کو سنبھال... تجھ پر ماں باپ کی ذمے داریاں ہیں اور ایک بیوہ بھابی کی... تیرے سوا کون ہے ان کا... مجھے نہیں لگتا کہ شاید ماں باپ کے گھر جا کے بیٹھے گی۔ ان کی بیٹی ہے... وہ سپورٹ کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔ شاید خود بھابی یہ پسند نہ کرے... اور اگر وہ چلی بھی جاتی ہے تو روزینہ آجائے گی۔“

انور نے آہ بھری۔ ”بڑے مسائل ہیں میرے سامنے۔“

میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں کیا کہوں گا اور کیا نہیں۔ ”یہ تجھے بھی اندازہ ہوگا کہ توجہ روزینہ کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گا تو حالات مختلف ہوں گے۔ ہزاروں، لاکھوں لوگ جب مل کے زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ان کے درمیان امید اور اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ کوئی بدگمانی نہیں ہوتی... جو تمہارے درمیان ہوگی۔ مانا تو بہت فراخ دل ہو گیا ہے اور مراد سے روزینہ کے تعلق کو اہمیت نہیں دیتا... لیکن روزینہ آئے گی تو اس کو دہرے جذباتی دباؤ کا سامنا ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ اتنی جلدی مراد کی موت کو نہیں بھلا سکتی... اسے تیری طرف سے بھی ڈر ہوگا کہ تو عام شوہروں کی طرح اس کی نوجوانی کی ایک جذباتی غلطی کو تمام عمر

عزت کے ساتھ شریک حیات کا مقام دے سکے اور تمام اسے خوش رکھے... لیکن اب یہ مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں ریشم نے کیا سوچا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے خود کو انور کی محبت میں غرق ہونے سے بچایا تھا کیونکہ محبت شفاف پاکیزہ اور پرسکون پانی کی جھیل نہیں رہتی تھی۔ یہ گٹر کے پانی سے بھری دلدل ثابت ہو رہی تھی۔ اس جذباتی کمزوری کے بحران سے خود کو نکالنے کے لیے بڑی قربانی اور ہمت کی ضرورت تھی... ریشم اس میں کامیاب رہی تھی۔

بس اسے اندازہ نہ تھا کہ بدبختی کیسے گھات میں ہے اور وہ عذاب کے ایک جہنم سے نکلے گی تو زیادہ سخت عذاب کے دوسرے جہنم میں پہنچا دی جائے گی۔ جہاں سے موت کے سوانحیات کا راستہ بھی نہ ہوگا۔ میرادل اس بد نصیب لڑکی کے لیے روتا تھا۔ اس نے مختصری زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ جوانی کے رنگین خوابوں کا سفر کہاں سے شروع ہو کے کہاں ختم ہو رہا تھا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچا دی گئی تھی۔ وہ اکبر کی ہوس کا شکار ہونے سے بچی تھی تو انور کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اور اب ایک بے ضمیر... عیار اور سفاک بھیر کے چنگل میں تھی۔ اس نے شاید اب بھی امید باندھ رکھی ہو کہ انور اسے چھڑانے آئے گا اور پھر اپنے ساتھ لے جائے گا... یا میں اس کا سراغ لگا کے کسی دن اچانک پھر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچ جاؤں گا۔

لیکن یہ سب خام خیالی ریشم کے کام نہ آئے گی۔ میں الف لیلیٰ کی کہانی کا تہزادہ نہیں تھا جو کیلا جا کے کالے دیو کی قید سے شہزادی کو چھڑاتا تھا۔

ایک دن اور رات میں امکانات کے صحرا میں خیالات کے گھوڑے دوڑاتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں۔ اگلی رات انور خود میرے پاس آ گیا۔ اس کا چہرہ ایک گلست خوردہ آدمی کی ذہنی کیفیت کا ترجمان تھا۔ وہ بھی شاید سو یا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد مٹی تھی اور وہ بیمار نظر آتا تھا۔

”تو سارا دن باہر نہیں نکلا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ہمیں ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تو ناراض اور پریشان تھا میری طرح۔“

”میں انور نہیں ہوں... ملک سلیم اختر ہوں۔“









ہونے لگا تھا۔ پہلا زلزلہ اکبر کی موت یا اس کے قتل سے آیا تھا جو سب سے شدید تھا۔ اس سے پہلے خاندان کی بنیادوں کو مراد کے قتل نے ہلا دیا تھا جس سے دونوں خاندانوں کی عزت آبرو کا فلک بوس مینار گر جاتا مگر دونوں بڑوں نے تمام غیر اخلاقی یا غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ گو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جھوٹی عزت کے اس مینار کی بنیادیں ہل جانے کے بعد خاندان کے نام و نسب پر غرور کا مستقبل خندوش ہو چکا تھا۔ تیسرے زلزلے کے اثرات کو سب سے زیادہ میں نے محسوس کیا تھا۔ ریشم کی ذات اس کا مرکز تھی۔ افسوسناک بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انور نے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ اس نے محبت کو مصلحت پر قربان کر دیا تھا اور ذرا بھی شرمسار نہ تھا۔ اتنا اس نے اپنی جان چھوٹ جانے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔

مجھے اب شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ میں کسی معقول وجہ کے بغیر اس دلدل میں اترتا جا رہا ہوں۔ میرا اس خاندان کے معاملات اور مسائل سے کیا لینا دینا اور میں کیوں خود کو آزمائش میں ڈالوں؟ میں صرف ریشم کی طرف سے اخلاقی ذمے داری پوری کرنے کا پابند تھا کیونکہ اس نے میری زندگی بچائی تھی اور زبان خلق کی پروا کیے بغیر مجھے اپنے گھر میں اعتماد کے ساتھ رکھا تھا۔ ایسی ہی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ ریشم کے مرحوم باپ نے بھی کیا تھا۔ کسی حد تک میں انور کے احسان کا مقروض بھی تھا جس نے مجھے مکمل پناہ، تحفظ اور ایک نئی شناخت دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آج میں محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنی زندگی کے اصل مسائل اور خطرات کی سچائی بتانا میری جذباتی غلطی تھی کیونکہ انور اب وہ پہلے والا انور نہیں تھا جس پر میں نے بھروسہ کیا تھا۔ جب ریشم کو انور نے محبت کی بنیاد پر اپنی زندگی میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں بہت مطمئن تھا اور وہی وقت تھا جب آسانی سے اپنی جستجو کے سفر کی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو سکتا تھا یہ احساس جرم ہمیشہ میرے لیے باعث آزار تھا کہ میں نے انور کو بھلا دیا۔ میں اسے بھولا نہیں تھا۔ ایک حادثے کے بعد اس سے دور ہو گیا تھا۔ اگر میں اس وقت نکل جاتا تو مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ بعد میں ریشم اور انور کی لوائسٹوری کا کیا اثر سبک انجام رہا۔ انور نے کیسے بے وفائی کی... ریشم کا دل توڑا اور اسے اپنی زندگی سے نکال کے روایتی انداز میں خاندانی بیوی بیاہ لایا۔

آج ریشم کو ایک جعلی بھری کی قید میں چھوڑ کے جانا

ناممکن تھا۔ اس حادثے کے بعد میرے فرار کا ارادہ حیران کن ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی حویلی کے اندر سب نے سازش کا جال پھیلا کے مجھے اسیر بنالیا تھا۔ انہوں نے دوستی کے نام پر تمام ذمے داریوں کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ شاید ایک جادوگر نے یا خوب صورت بلا تھی جس نے مجھے دام ہوس میں اسیر کیا تھا اور اب چودھری صاحب نے مجھے اپنا بنا کے اور پتر کا درجہ دے کر روک لیا تھا۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میں سارے بندھن توڑ کے نکل جاؤں۔

میرے پیروں کی واحد زنجیر ریشم تھی۔ میں اسے چھوڑ کے نہیں جاسکتا تھا اور اگر اسے انوار کے پیر صاحب کی قید میں نہ ڈالا جاتا تو وہ سلونی کے ساتھ نکل جاتی۔ پھر میں دیر نہ کرتا۔ اب پہلا مرحلہ اس کو محفوظ فراہم کرنے کا تھا۔ اس میں میرا پلان خاصا کامیاب جا رہا تھا۔ چودھری نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ریشم کو باعزت طور پر واپس لانے کے حق میں تو نہیں ہے مگر پیر صاحب کے آستانے پر یا گھر میں وہ بالکل محفوظ ہوگی اور آرام سے رہے گی۔ اس نے خود بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بیوی کے ذریعے روزینہ پر اور شاید پر دباؤ ڈالنے کے طریقے سے بھی اتفاق کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کو مجبور کر سکتی ہیں... اور اب یہ حکم اگر بیٹیوں کے سرال کی طرف سے ملے تو بیٹیوں کا باپ آسانی سے نال نہیں سکتا۔

اس سے اگلے مرحلے میں مجھے ریشم سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ میں انور کے ساتھ اس سے ملنے جاسکتا تھا اور انور کا راستہ سرال میں کون روکنے والا تھا۔ میں روایتی طریقے سے یہاں کی یا پیر صاحب کے گھر کی کسی ملازمہ کو استعمال کر سکتا تھا اور بالآخر ریشم کو نکال کر فرار ہونے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ پہلا مرحلہ میری کوشش اور خدا کی مدد سے آسان ہو چکا تھا۔ دوسرا مرحلہ مشکل تھا اور ذہانت، چالاکی، عیاری کے تمام حربوں سے آسان بنایا جاسکتا تھا۔ اصل مرحلہ تیسرا تھا جو خطرناک تھا اور جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے بہت محتاط ہونے کے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ فی الحال تو میں آنے والے دونوں میں پہلے مرحلے کی کامیابی دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر چودھری نے وہی کیا جو کہا تھا تو مجھے کل پرسوں میں یہ خوش خبری مل جائے گی کہ ریشم کو ان مریضوں سے نکال کے جن پر جن آتے تھے پیر صاحب کی رہائش گاہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق انور کے ذریعے بھی ممکن تھی اور میں اصرار کر سکتا تھا کہ مجھے اس سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ مجھے ایک اندرونی بے چینی تھی۔ یہ آرزو مجھے مغلوب کرتی تھی کہ کوئی معجزاتی اتفاق ہو اور میں انھوں تو

ریشم میرے سامنے ہو۔ وہ زار و قطار روٹی مجھ سے لپٹ جائے اور میں اسے تسلی دوں کہ چل بس کر... اتنی بہادر لڑکی روٹی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے کیونکہ تو بھی آگئی ہے۔ اکیلا تو میں جانی سکتا تھا مگر دنیا میں ہر شخص کی ہر خواہش کسی معجزے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ ریشم کے لیے میری کوشش ہر جواری جیسی تھی جو آخری کوڑی ہارنے تک کھیلتا ہے۔

خواب آرزو کی تعبیر شاید کے روپ میں میرے سامنے آئی۔ رات کو دیر تک اپنی ذہنی الجھنوں سے لڑنا اور پریشان کن خیالات کی یلغار میں بیٹھ کے کروٹیں بدلتے رہنا ایک معمول بن گیا تھا۔ ہر رات میں دیر سے سوتا تھا۔ نیند بھی اب پرسکون نہیں ہوتی تھی۔ اگر جسم سوتا تھا، تب بھی دماغ جاگتا رہتا تھا اور میں اندیشوں کو خواب کے روپ میں دیکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ میں صبح جاگتا تھا تو فریض اور تازہ دم نہیں ہوتا تھا۔ یا میں دیر تک سویا پڑا رہتا تھا۔ یہاں وقت اور ذمے داری کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

میں دوپہر سے کچھ پہلے جاگا تو کسل مندی سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا کچھ علاج کسل سے ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد حواس کو بیدار کرنے والی کیفین سے بھری کافی کے دو گ چڑھاتا تھا تو پھر دوپہر کے کھانے کی خواہش نہیں رہتی تھی۔ معمول کے مطابق میں نہادھو کے اور کپڑے بدل کے نکلتا تو خیال تھا کہ اب کسی ملازمہ سے کہوں گا کہ ناشالائے۔ پھر میں نے شاید کو دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے صوفے پر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی جو میں نے انور کی ذاتی لائبریری سے لی تھی۔ اپنی اسیری کے مختصر وقت میں مجھے اس لائبریری کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ اس ذخیرے میں سیکڑوں قابل قدر کتابیں تھیں۔ اب ان کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔

”تم پڑھتے ہو؟ فضول کتابیں؟“ وہ بولی۔

میں نے کتاب چھین کر بیڈ پر رکھ دی۔ ”کوئی کتاب فضول نہیں ہوتی۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ فضول ہوتا ہے۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

اس کے سکون میں فرق نہیں پڑا۔ ”میں... اگر یہ کہوں کہ صرف تمہیں دیکھنے... تم سے ملنے اور تم سے باتیں کرنے آئی ہوں؟“

”تو میں کہوں گا کہ پلیز گیٹ آؤٹ۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو کے خواتین کے ساتھ اس لہجے میں بات کرتے ہو۔“

”دیکھو، منہ مت کھلاؤ میرا... میں جانتا ہوں کہ تم خواتین کی کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہو۔“ میں نے اس کے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ لباس اور یہ میک اپ دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ تمہارا شوہر ابھی کچھ دن پہلے مارا گیا ہے؟“

”مرا ہے۔“ اس نے میری صبح کی۔ ”بہت دکھ ہوتا ہے تم جیسے سب تنگ نظر اور مردانگی کے زعم میں جہلامردوں کو... کہ ایک بیوہ نے اچھے کپڑے پہننا اور میک اپ کرنا نہیں چھوڑا۔ اسے تو بد حال، غلیظ نظر آنا چاہیے اور میلے کپڑوں میں رہنا چاہیے۔ لگتا ہے اسے تو کوئی تم ہی نہیں ہے شوہر کے مرنے کا... انہیں صدمہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہم سے اتنی محبت کا اظہار کرنے والی وقادار مشرقی بیوی بھی یہی کرے گی۔“

”اچھا فضول باتیں مت کرو... مجھے پتا ہے تم کتنی دکھی ہو۔“

”واقعی میں بالکل بھی دکھی نہیں ہوں... کون سا سکھ حاصل تھا مجھے جب وہ میرا سرتاج اور مجازی خدا تھا... کتنی عزت تھی میری۔“

”یہ سب میں سن چکا ہوں... تمہارے یہ رنگ ڈھنگ انور کو بھی پسند نہیں۔ اس سے ایک شک کو تقویت ملتی ہے۔“

”... کہ اکبر کو میں نے ہی قتل کیا؟ اگر میں تمہارے سامنے کہوں کہ ہاں... میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا تھا... اور بالکل آخری وقت میں... ورنہ میری ذلت، غلامی اور جسمانی استحصال کا دور لوٹ آتا؟“

میں اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ”شاید یہ صرف میرا شک نہیں... دوسرے بھی یہی محسوس کرتے ہوں گے۔“

”مگر ان کا شک انور پر زیادہ ہے... رات؟“

”میرا خیال ہے کہ اسے بلالوں۔ وہ بھی سن لے تمہاری گہرائشی...“

وہ ہنسی۔ ”کہاں سے بلالو گے... وہ گیا ہے اباحی کے لیے شہر سے کچھ دوا لیں اور سامان لیتے... ڈاکٹر جلالی کے ساتھ... اور چودھری صاحب سو رہے ہیں... اور انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے... بیٹھ جاؤ۔“

میں بیٹھ گیا۔ ”چودھری صاحب نے بھیجا ہے تمہیں... کیوں؟“

”صبح میرے والد تشریف لائے تھے۔ کافی دیر بیٹھے مگر تم سو رہے تھے۔ باتیں دونوں بھائیوں کے درمیان ہوئیں۔ میں بھی سن رہی تھی۔ مسئلہ تمہارا ہی تھا... تمہاری

بعض کیس بہت ہی انوکھی قسم کے ہوتے ہیں... سراغ رساں سوچتے رہ جاتے ہیں مگر الجھی ہوئی گریپس کھلنے کے بجائے مزید بگڑتی چلی جاتی ہیں... ایک ایسے ہی درپیش کیس کا ماجرا... پولیس اور سراغ رساں اس معرکے کو حل کرنے سے قاصر تھے کہ یہ قتل کاکیس ہے یا پھر...

انسانی ذہن کی قلابازیاں... احساسات اور گہرے مشاہدے کی بہترین مثال...

## اسلم قتل مقتول



آفسر فریک مارشل نے عقب میں ڈراؤنی دھمکی سنئی۔ اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ فریک کو ایک سیکنڈ کے لیے لگا جیسے زمین اس کے قدموں تلے مل گئی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹا۔ زیادہ سے زیادہ تیس فٹ کے فاصلے پر اسے ایک جسم نظر آیا۔ فریک نے یہ خوفناک منظر دیکھ کر خود کو بمشکل سنبھالا۔ اسے اکیڑی سے فارغ ہوئے صرف سات ماہ گزرے تھے۔ اس قسم کی اچانک اور دہشت ناک اموات دیکھنے کا وہ عادی نہیں ہوا تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 139 مئی 2014ء

”میں اتنی بڑی عورت نہیں ہوں سلیم... صرف ظاہر کے روپ پر مت جاؤ۔ شاید اتنی خوب صورت نہیں ہوں میں... لیکن تمہارے لیے میں کیا محسوس کرتی ہوں... کیسے جذبات رکھتی ہوں... اس کا اندازہ تم کر ہی نہیں سکتے... مجھے ایسے مت ٹھکراؤ۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو شاہینہ۔“  
”ہاں، تمہاری محبت نے پاگل کر دیا ہے مجھے... اگر تم نہ آتے میری زندگی میں تو شاید میں وہ سب نہ کرتی جو میں نے کیا۔ میں اکبر کے ساتھ پہلے جیسی زندگی گزارتی رہتی۔ لیکن اب مجھے دل نے مجبور کر دیا۔ میں نے کہا کہ شاہینہ... تو یہ بازی ہار جائے گی اگر جان کی بازی نہ لگائی۔“ آنسو مسلسل اس کے گالوں پر بہتے رہے۔ ”میرے جیسا جواری دیکھا ہے تم نے؟ میں نے تمہیں پانے کے لیے اپنے سہاگ کو داؤ پر لگا دیا۔“

”مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تمہارے لیے...“  
”کر سکتے ہو... سب کچھ کر سکتے ہو... تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو۔“  
”شادی؟“ میں صدے سے سن ہو گیا۔ ”تم سے...؟“

”سب ہو سکتا ہے اگر تم چاہو... میں سب کو منالوں گی... اور میری محبت کوئی گھائے کا سودا نہیں ہوگی سلیم... اتنی محبت کوئی عورت نہیں دے سکتی تمہیں... اور میرے ساتھ وہ سب بھی تمہارا ہوگا جو میرا ہے۔“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”شاہینہ! سب جانتے ہیں کہ میں نورین کو کتنا چاہتا ہوں، کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے میرے لیے۔“

”نورین... کہاں ہے نورین... صرف تمہارے دماغ میں... اور وہ ہوتی کوئی زندہ عورت تب بھی میں اسے تمہارے ساتھ قبول کرتی... جیسے روزینہ کے ساتھ رہیم کو قبول کر رہا تھا نور...“

اچانک میری نظروں کے سامنے جیسے سورج آ گیا۔ میرے حواس پر بجلی سی گری اور میرے اعصاب شل ہو گئے۔ میں نے بڑے چودھری کو دروازے میں کھڑا دیکھا... نہ جانے کب سے وہ وہاں موجود تھا... اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

ہر معاذ پر ایک نشے داؤ کی منتظر  
جواری کسی تدبیریں اگلے ماہ بڑھے

جاسوسی ڈائجسٹ 138 مئی 2014ء

رہیم کا... میں نے بھی اپنی رائے دی۔“  
”پھر کیا فیصلہ ہوا؟“ میں نے کہا۔  
”فیصلہ بھی پتا چل جائے گا تمہیں... ایک بات بتا دوں کہ چاچا جی اور بابا جی نے یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔“  
”اس لیے کہ رہیم کو یہاں سے نکلوانے والی تھی تم تھیں۔ تم نے ہی انہیں قائل کیا ہوگا کہ اسے حویلی میں نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میں یہی چاہتی تھی۔“  
”اس کی موجودگی سے تمہیں کیا خطرہ لاحق تھا؟“  
”وہ خطرہ تھی میری بہن کے مستقبل کے لیے... اور اس کے آنے سے پہلے یہ میری ذمے داری تھی کہ میں حالات اور معاملات کو ٹھیک کر لوں... اور یہ میری وجہ سے ہی ہوا کہ اسے درگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ ورنہ... اور بہت کچھ ہو سکتا تھا جو بہت بڑا ہوتا۔“

”یہ اچھا ہوا اس کے ساتھ؟“ میں نے برہمی سے کہا۔  
”وہ مجھے دیکھتی رہی۔“ تم بہت پیار کرتے ہو اس سے؟“  
”ہاں، ورنہ پریشان کیوں ہوتا؟“ میں نے کہا۔  
”لیکن اس سے شادی پر تیار نہیں تھے تم؟“  
”پیار کیا بہن سے نہیں ہوتا؟ ماں سے نہیں ہوتا...“

لیکن تمہارے دماغ میں تو پیار کا بس وہی مطلب ہے جو تم نے مجھ پر جنایا۔ اس حیوانی جذبے کے سوا تمہارے نزدیک پیار کا اور کوئی مفہوم نہیں۔“

اس نے اداس ہو کے ایک گہری سانس لی۔ ”بہت دکھ ہے مجھے اس بات کا... کہ تم نے مجھے نہیں سمجھا۔“  
”غلط نہیں ہے تمہاری... شاید کسی اور نے تمہیں نہ سمجھا ہوا ایسے جیسے میں نے سمجھا... سانپ سے ڈرتے سب ہیں مگر جس کو سانپ ڈس چکا ہو...“

”سلیم! میں محبت کرتی ہوں تم سے... یہ سچ ہے۔“  
”بکو اس بند کرو اپنی اور جاؤ... میں اب تمہارے کسی چکر میں آنے والا نہیں ہوں۔“

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی نفرت کرتے ہو تم مجھ سے... اتنا برا سمجھتے ہو مجھے... تمہاری قسم سلیم! میں نے آج تک کسی اور کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا لیکن تمہیں جیب پہلی بار دیکھا تھا، اسی وقت سے میں وہ نہیں رہی جو کہ تھی... ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا میں نے۔“

”خدا کے لیے شاہینہ... مجھے بخش دو۔“

”تم کس شعبے سے متعلق ہو؟“ فریک نے پوچھا۔  
 ”ہومی سائڈ۔“  
 ”لیکن یہ تو خودکشی کا کیس لگتا ہے۔“  
 ”فی الحال۔“ ورجل نے جواب دیا۔  
 فریک کو ورجل کی شخصیت متاثر کن لگی تھی۔ وہ بولا۔  
 ”دیکھو اگر تمہیں برائے نہ لگے تو ایک اپ آنے تک ساتھ رہو۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ اگرچہ یہ علاقہ میری حدود میں نہیں ہے... بہر حال میں جو تعاون بھی کر سکا، کروں گا۔“ ورجل نے پاسادینا کی آئی ڈی نکال کر شرٹ کی جیب کے ساتھ کلپ کر دی۔  
 بھیڑ میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک نوجوان کمرے کے ساتھ آگے آنے لگا۔ فریک نے اس کی پیش قدمی کوئی انفرور پسا کر دیا۔ ارد گرد کھڑے افراد ساکت ہو گئے... اسی اثنا میں ایک پٹرول کار جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔ سب سے پہلے کار سے ایک باوردی سارجنٹ برآمد ہوا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں صورت حال کا جائزہ لیا۔ پھر سر اٹھا کر بلند و بالا عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی نگاہ واپس نیچے آئی۔ سارجنٹ نے ہاتھ لہرا کر ورجل کو قریب سے بٹھے کا اشارہ کیا۔ معاً اس کی نظر ورجل کی شرٹ کے آئی ڈی کارڈ پر گئی اور وہ رک گیا۔ کچھ بولنے سے پہلے اس نے قریب ہو کر کارڈ پڑھا۔ ”یہ غالباً تمہارا کوٹ ہے؟“ اس نے فٹ پاتھ پر پڑی لاش کی جانب اشارہ کیا۔  
 ”ہاں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ ایبویٹنس پہنچنے والی ہے۔“  
 فائر ڈیپارٹمنٹ کے ہیرامیڈیکل یونٹ کے دو افراد اپنے ہاتھ میں لگ گئے۔ ایک کے بازو میں کبیل نما چادر لنگ رہی تھی۔ اس نے ورجل کا کوٹ اٹھا کر لاش پر چادر ڈال دی... کوٹ ورجل کو واپس کرتے ہوئے اس نے کہا۔  
 ”ممکن ہے یہ داغ دار ہو گیا ہو۔“  
 ورجل نے احتیاط سے کوٹ کا جائزہ لیا اور واپس پہن لیا۔ ”چلے گا... معمولی صفائی بعد میں ہو جائے گی۔“  
 فریک، سارجنٹ کو بریف کر رہا تھا۔ پھر اس نے ورجل کا تعارف کرایا۔ سارجنٹ تجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے اپنی اہمیت کا اظہار نہیں کیا۔  
 ”باب اپر۔“ اس نے ورجل سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم رضا کارانہ تعاون کے لیے آمادہ ہو۔“  
 ”مجھے خوشی ہوگی اگر میں لاس اینجلس کی ٹیم کے کسی کام آسکا۔“ ورجل مسکرایا۔

اس نے سر اٹھا کر بلند و بالا عمارت کی طرف دیکھا۔ جسم کا زمین کے ساتھ تصادم خاصی شدت کا حامل تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گرنے والا بہت بلندی سے کودا یا گرا تھا...  
 فریک کے ذہن میں خودکشی کے سوا کوئی دوسرا خیال نہیں آیا۔ تصادم کی شدت نے کھوپڑی کو پکے ہوئے تریوز کی طرح کھول دیا تھا... ایسا بھیانک منظر تھا کہ فریک کو اسے برداشت کرنے کے لیے اپنی تمام تر ہمت کو بروئے کار لانا پڑا۔  
 وہ عمارت اتنی اونچی تھی کہ فریک منزلوں کی تعداد کا تعین نہیں کر سکا۔ تعمیراتی ڈھانچے میں مضبوطی کی جھلک تھی اور خوب صورتی کے لیے بیرونی جانب شیشے کا خاصا استعمال کیا گیا تھا۔  
 فریک کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے اندازہ لگا سکے کہ اس کے قریب پڑا بے روح جسم کون سی منزل سے نپکا تھا۔  
 وہ وہاں موجود تھا اور اس نے وہ سانحہ دیکھ بھی لیا تھا... لہذا یہ ناخوشگوار معاملہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو چکا تھا۔  
 چند اور افراد نے بھی یہ ہولناک منظر دیکھا اور سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے بلکہ دہشت زدہ ہو کر قدرے پیچھے ہٹ گئے تھے...  
 مختصر بھیڑ سے معاً متوسط قد کا ایک سیاہ فام شخص برآمد ہوا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر لاش کو ڈھکنا چاہا۔ ”پاسادینا پولیس۔“ ساتھ ہی بولا۔ ”پولیس بیک اپ اور ایبویٹنس منگواؤ۔“  
 فریک ابتدائی شاک سے باہر آچکا تھا۔ اس نے سیاہ فام کو روکنا چاہا۔ تاہم سیاہ فام نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک گھٹنے کے بل گرنے والے کی لاش کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ پُر اعتماد اور تجربہ کار لگ رہا تھا۔  
 فریک نے بیلٹ کے ساتھ منسلک پولیس ریڈیو پر اطلاع پہنچائی۔ اولین فرض سے نمٹنے کے بعد اس نے اپنی کو استفسار یہ نظر سے دیکھا۔ وہ اب اپنے قدموں پر کھڑا تھا اور سر اٹھا کر دائیں و بائیں بٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”شکر ہے۔“ فریک نے ہاتھ بڑھایا۔  
 ”ورجل ٹیم۔“ سیاہ فام نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ”غالباً گرتے وقت بلندی عمارت کے نصف سے زیادہ رہی ہوگی... تم نے سر کی حالت دیکھی؟“

”ہاں۔“ ورجل نے نظر آئیز لیج میں کہا۔ ”مرنے والے کے پیروں میں بالکل نئے جوتے تھے۔ جوتوں کے تیلے پر مشکل سے ایک آدھ نشان ہوگا۔“  
 ”اور تم نے اندازہ لگایا کہ خود کو ہلاک کرنے والا ایسے موقع پر تھے جو تے خریدنے کی زحمت نہیں کرتا؟“  
 تجربہ کار سارجنٹ فوراً ہی ورجل کی بات کی تک پہنچ گیا۔ ”بالکل... نئے جوتوں کی خریداری میں انتخاب اور فننگ کے مراحل پیش آتے ہیں... جو شخص کچھ ہی دیر میں خود کو ہلاکت میں ڈالنے کا فیصلہ کر چکا ہو، وہ اس تکھیڑے میں کیوں پڑے گا؟ قطعی غیر منطقی۔ تمہوں کی حالت بتا رہی ہے کہ جوتوں نے زیادہ سے زیادہ دو یا تین ہلاک کا سفر طے کیا ہوگا۔“  
 سارجنٹ نے سر ہلاتے ہوئے دل ہی دل میں ورجل کی ذہانت اور مشاہدے کو سراہا۔ ”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں... لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے خودکشی کا فیصلہ اچانک کیا ہو؟“  
 اسی وقت ایک پٹرول مین نے مداخلت کی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بٹا تھا۔ ”مرنے والے کی آئی ڈی مل گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”رابرٹ ٹی، ولیم سن... گھر کا پتا سارجنٹ، ورجل کی جانب پلٹا۔“ تم کہہ رہے تھے کہ تم نے کوئی چیز نوٹ کی تھی؟“

2014ء جون کی گرامر پڑھیں کا ساجھی

جو لیسورت کہانیوں کا مجموعہ

سیرسہ ڈائجسٹ

ماہنامہ

مزید

خطوط کی محفل

فصل شہزاد

ملک صفدر حیات کی محنت کا ثمر

ملاقات

پہلے کے محفل میں جنسی لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنے والی حسینہ کی زندگی کے نشیب و فراز آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد سے ملاقات

لاوارث وارث

ماضی کے گمشدہ لمحات جب جب سامنے آئے ایک الگ ہی روداد کہہ گئے..... ابتدائی صفحات پر الیاس سینا پوری کی سوغات

پس زنداں

لحمہ بہ لحمہ دلوں کی دھڑکن تیز کرنے اور قدم بہ قدم انجام کی جانب محو سفر طاہر جاوید مغل کے قلم کی روانی

ماروی

محبوب سے دوری مگر یادوں میں قربت کا عجیب گم ماہروی کی دھوپ چھاؤں کا احوال محی الدین نواب کا دلچسپ سلسلہ

منظر اماں کا شرف خیر امجد دینس

تئویر دیا ضلع سلمیر انور کی کاوش

جاسوسی ڈائجسٹ 141 مئی 2014ء

جاسوسی ڈائجسٹ 140 مئی 2014ء

اور ج کا ڈنٹی کا ہے۔“  
 ”کوئی، اس کے گھر پہنچو... شاید گھر پر کوئی مسئلہ رہا ہو۔ کمپیوٹر کارڈ بھی چیک کر لیتا۔“  
 ”بس سر۔“ پٹرول میں نے اپنا ریڈیو سنبھالا۔  
 ورجل نے دیکھا کہ ایک آدمی تیزی کے ساتھ ان دونوں کی طرف آرہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک خوش لباس شخص تھا۔ اس کے جوتے چمک رہے تھے اور بزنس سوٹ پیش قیمت تھا۔  
 ”معاف کیجیے میں فون پر تھا۔“ اس نے معذرت کی۔ ”میرا نام فلپ ہے۔ جنرل نیجر، فلپ۔ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“  
 ”تم جانتے ہو... کیا حادثہ پیش آچکا ہے؟“  
 سارجنٹ نے سوال کیا۔  
 ”بد قسمی ہے میرے... یہاں پہلے کبھی ایسا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔“  
 سارجنٹ اور نیجر کو معروف گفتگو چھوڑ کر ورجل نے آگے بڑھ کر بلڈنگ ڈائریکٹری تک رسائی حاصل کی اور اس میں موجود اندراجات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔  
 واپس آ کر اس نے نیجر کو مخاطب کیا۔ ”مسٹر فلپ! بلڈنگ کی صرف بتیس منزلیں بک ہیں... کچھ بتائیں گے اس ضمن میں؟“  
 نیجر نے ورجل کی آئی ڈی دیکھ لی تھی۔ جواب قیاس سے کوٹ پر منتقل ہو چکی تھی۔  
 ”ہاں، آپ کی بات ٹھیک ہے اور ہم نے بتیس سے اوپر کی منزلوں کو مشتمل بھی نہیں کیا... آپ جانتے ہیں کہ ایسی عمارتوں میں کرایہ دار بلند منزل زیادہ پسند کرتے ہیں... تاہم بتیس سے اوپر ابھی تعمیراتی کام جاری ہے...“  
 ”تمام عمارت انٹرنڈیشن ہے؟“ ورجل نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ بہت زیادہ گلاس استعمال ہوا ہے۔“  
 ”میرا مطلب تھا کہ کھڑکیاں استعمال ہو رہی ہیں یا فی الحال بند ہیں؟“  
 سارجنٹ باب نے ورجل کو دیکھا اور قہقہے انداز میں سر کو حرکت دی۔  
 ”زیادہ تر کھڑکیاں بند ہیں، تاہم چند کسٹرز کی خواہش پر کچھ کھول دیا گیا ہے۔“ نیجر نے جواب دیا۔  
 ”اتنی بلند عمارت کے لیے کیا یہ خطرناک اقدام نہیں ہے جبکہ عمارت انٹرنڈیشن ہے؟“ سارجنٹ نے سوال کیا۔

”آپ کی بات درست ہے... ہم نے کھڑکیاں اس طرح ڈیزائن کی ہیں کہ وہ ایک محفوظ حد سے زیادہ نہیں کھل سکتیں۔“  
 ”کیا کوئی ضدی شخص کھڑکی کے محور و خلا سے باہر نکل سکتا ہے؟“ سارجنٹ نے اپنی بات جاری رکھی۔  
 ”نیجر فلپ ہنچکا یا۔“ یہ آدمی کی جسامت پر منحصر ہے تاہم میں کہہ سکتا ہوں کہ پھر بھی یہ بہت دشوار ہے۔“  
 ”عمارت میں موجود لوگوں کی فہرست تو ہوگی؟“  
 ”نہیں۔ انفرادی کرایہ داروں سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ تاہم ہم فہرست پر کام شروع کر چکے ہیں۔“  
 ”کیا تم رابرٹ ولیم سن کو جانتے ہو جس کی عمر پینتالیس سال اور جسامت درمیانی ہے؟“  
 ”نہیں۔“  
 ورجل نے سوال جواب میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔  
 ”مسٹر فلپ! بتیوں سے اوپر نامکمل منزلوں تک کوئی پہنچنا چاہے تو کیا وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے؟“  
 فلپ نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔ ”بتیسویں فلور کے اوپر زینے بلاک ہیں۔ ایلویٹرز موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف ایک بتیسویں فلور سے اوپر رسائی رکھتا ہے... اور اسے آپریٹ کرنے کے لیے الگ چابی ہے۔“  
 ”قالبا چابی تمہارے پاس ہوگی؟“  
 ”جی ہاں، کیا آپ لوگ اوپر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ نیجر نے پوچھا۔  
 ”پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ عمارت کی شمالی سمت کے کسی فلور کی کھڑکی کو کھولا جاسکتا ہے اور یہ کہ کیا وہاں کوئی کرایہ دار ہے؟“  
 ”یہ ممکن نہیں ہے... پھر بھی میں چیک کر لوں گا۔“  
 ”جھٹ پر تعمیراتی عملہ واحد ایلویٹر کے ذریعے آتا جاتا رہتا ہے... ہمارے پاس بلڈنگ اسپیکٹر ہے جو اسٹرکچر کی نگرانی کے علاوہ دیگر متعلقہ نظام کی نگرانی کرتا ہے۔ کیونکہ اس حجم کی بلڈنگ کی...“  
 ”ہم سمجھ گئے۔“ ورجل نے اس کی بات کاٹی۔ ”اب ہم چھت پر جانا چاہیں گے۔“  
 اس وقت وہی پٹرول میں دوبارہ ظاہر ہوا جسے سارجنٹ نے مردہ آدمی سے متعلق ہدایات دی تھیں۔  
 سارجنٹ باب نے ایک طرف ہٹ کر اس کی بات سنی... بعد ازاں ورجل کو بتایا کہ مرنے والے کا ریکارڈ صاف ہے۔ کوئی جرم، کوئی وارنٹ، کچھ نہیں۔

”گڈ ورک۔“  
 ”ولیم سن بظاہر ایک دولت مند آدمی تھا لیکن اس کی دولت کے ذرائع اندھیرے میں ہیں۔ وہ ایک سال قبل اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ مرنے کے سبب اس کی چند پبلیاں ٹوٹ ہو گئی تھیں۔ علاج کے دوران معلوم ہوا کہ اس نے نشیات استعمال کی تھی۔“  
 ”نشیات کے استعمال کا ڈیٹا کمپیوٹر ریکارڈ پر موجود ہونا چاہیے تھا... نہ کہ اسپتال میں۔ نشیات کے استعمال کا معاملہ کا ڈنٹی کے شیف کے تعاون سے کیوں ظاہر ہوا؟“  
 ورجل نے اعتراض کیا۔  
 ”اس کی میڈیکل ہسٹری میں نشیات کا استعمال شامل ہے۔ تاہم نشیات کے باعث یا کسی اور وجہ سے اس نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی تھی۔ اگرچہ فی الحال میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ بات اس کے ریکارڈ پر کیوں نہیں تھی...“  
 پھر سارجنٹ نے کئی امکانات کی بات کی اور آخر میں کہا۔  
 ”ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی وہ نشے کی حالت میں چھت پر جا پہنچا ہو... اسے خیال ہو گیا ہو کہ وہ اڑ سکتا ہے۔“  
 ”واحد ایلویٹر کی چابی کے بغیر وہ چھت پر نہیں جاسکتا تھا، خیر ڈچھت کو بھی دیکھ لیں۔“ ورجل نے کہا۔  
 ☆☆☆  
 چھت پر منڈیر سے نیچے دیکھنا کمزور دل والے کے لیے ممکن نہیں تھا... چھت پر متعدد مشینیں موجود تھیں۔ نیجر ساتھ تھا۔ ہوا کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ خاصی بلندی پر ہیں...  
 ورجل نے سر اٹھا کر بادلوں کی حرکات کو دیکھا تو ذہنی التباس کے باعث یوں لگا کہ جیسے بلڈنگ ایک جانب جھک رہی ہے... ورجل نے فی الفور نگاہ نیچے کی اور خود کو سنبھالا۔  
 چند گہرے سانس لے کر اس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ پھر احتیاط سے محض دو فٹ بلند حفاظتی منڈیر کی جانب چل پڑا۔ ورجل نے شمالی سمت کی منڈیر کا تفصیلی جائزہ لیا... وہ ہوا اور بلندی کے باعث بہت محتاط تھا... حتیٰ کہ سارجنٹ باب کو اکتاہٹ ہونے لگی۔  
 ”کچھ ملا؟“  
 ”کچھ خاص نہیں۔“ ورجل نے کنارے سے ہنپتے ہوئے کہا۔ ”دو ہی امکانات ہیں، اول خودکشی دوم قتل۔“  
 ”قتل؟“ نیجر شہنشاہی۔  
 ”اس لیے تو خودکشی کی جانب ہی خیال جاتا ہے۔“  
 ورجل نے کہا۔

”میں جیسا ایک سپرٹ تو نہیں ہوں۔“ سارجنٹ بولا۔  
 ”لیکن وہ جس رفتار سے زمین پر گرا... وہ رفتار بلڈنگ کی کسی بھی چلی منزل سے ممکن نہیں...“  
 ☆☆☆  
 دونوں چھت سے واپس آ گئے تھے۔ ورجل نے اعلان کر دیا کہ ولیم سن، چھت سے نہیں کودا تھا... چنانچہ سارجنٹ ابھمن کا شکار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ”اگر فلپ کے مطابق شیشے کی کھڑکیاں کھولی جاسکتیں تو ہمیں کوئی ٹوٹا ہوا مشین تلاش کرنا چاہیے۔“  
 ”نہیں، اس نے کوئی کھڑکی نہیں توڑی۔“ ورجل نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ ”ایسا ہوتا تو فٹ پاتھ پر کوئی نہ کوئی زخمی ہوتا یا شیشے کے ٹکڑے ضرور پائے جاتے۔“  
 سارجنٹ نے خود کو احمق محسوس کیا۔ ورجل کی منطق واضح تر تھی۔  
 ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ چھت سے نہیں کودا؟“  
 ”اوپر ہوا تیز تھی۔“ ورجل نے کہا۔ ”اس کے باوجود چھت پر بغیر موجود تھا۔ شمالی سمت میں جہاں نیچے اس کی لاش پڑی تھی... وہاں منڈیر پر موجود غبارے نشان ہے۔ میں نے احتیاطاً پوری شمالی منڈیر کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ چھت سے نہیں کودا۔“ ورجل نے سکون سے وضاحت کی۔ ”دوسری بات یہ کہ وہ چابی کے بغیر چھت والا ایلویٹر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ نیجر اور بلڈنگ اسپیکٹر اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔“  
 ورجل پُرسوج انداز میں کافی کی جانب متوجہ ہو گیا۔  
 ”اب ایک ہی امکان رہ جاتا ہے۔“  
 ”لیکن وہ آسمان سے تو نہیں ٹپکا ہو گا۔“ سارجنٹ نے حیرت اور ابھمن کے طے جلتے تاثر کے ساتھ کہا۔  
 ”ہیلی کاپٹر۔“ ورجل نے کافی ہلاتے ہوئے دھماکا کیا۔  
 سارجنٹ نے چونک کر ورجل کو دیکھا اور اعتراض داغا۔  
 ”اس صورت میں کوئی نہ کوئی تو دیکھتا... کسی کی نظر پڑتی...؟“  
 ”بیس برس قبل کی بات ہوتی تو تمہارا اعتراض ٹھیک لگتا ہے لیکن یہ آج کی بات ہے۔ پولس، میڈیا... حتیٰ کہ فائر ڈپارٹمنٹ کے ہیلی کاپٹروں کی موجودگی یہاں کی فضا میں عام سی بات ہے۔ عوام کو انہیں دیکھتے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے... کسی کو دلچسپی نہیں ہے کہ سر اٹھا کر ہیلی کاپٹر دیکھتا پھرے... ہاں، جب تک کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔“  
 سارجنٹ نے کافی کا کب اٹھایا اور سوچ میں پڑ گیا۔  
 ”تو پائلٹ کو رپورٹ کرنی چاہیے تھی؟“



## دندان شکن

مختار آزاد

کسی کا حال کتنا ہی بے حال کیوں نہ ہو... وہ مستقبل کے لیے سہانے خواب ضرور بنتا ہے... نئی امیدیں... نئے آہنگ اس کے پیش نظر رہتے ہیں... ماضی سے بیزار ایک ایسے ہی شخص کی روداد جو گزرے ہوئے وقت کی ہر چھائیوں سے بھی بچنا چاہتا تھا... مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ماضی کیسا ہی کیوں نہ ہو... حال اور آنے والا وقت پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے...

عنایت... مصلحت اور کم نوازی کے جال میں الجھ کر خطرناک واڈ کھیلنے والے کھلاڑی کا پڑھارت کھیل...

جونز نے ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے کے لیے ایل وڈ میں ایک چھوٹا سا گھر خریدا تھا۔ دس برس پہلے اُس کے دل میں یہاں رہنے کی خواہش ایک اخبار میں شائع ہونے والے سروے کو پڑھ کر ہوئی تھی جس میں اس قصبے کو ملک کے دس بہترین مضافاتی علاقوں میں سے ایک قرار دیا گیا تھا۔ سروے پڑھنے کے فوراً بعد اس نے اپنے کارندے دوڑائے اور چند روز میں ہی اس نے یہاں ایک گھر خریدا لیا۔

استعمال کرتے ہیں۔ وہ شارٹ کٹ ہے نشیات کا دھندلاہو اپنے کسی بھی ناپسندیدہ آدمی کو بے رحمی سے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

سارجنٹ اپنی نوٹ بک نکال چکا تھا اور بیجان زور دکھائی دے رہا تھا۔ ”میں ولیم سن کے نشیات کے ٹک ڈھونڈ لوں گا... اور کچھ؟“

”مزید؟“ ورجل مسکرایا۔

”سب کچھ۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ مگر کمر ہے۔“ ورجل نے بات شروع کی۔ ”اور اگر ایسا ہی ہے تو کرتے وقت وہ ہوش میں نہیں تھا یا پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ یہ بھی تم یہ آسانی فارنک اور پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم کر سکتے ہو۔ اس کے بعد ہی اسے ہیلی کاپٹر سے پھینکا گیا۔ کسی نے ہیلی کاپٹر نہیں دیکھا، وجہ میں بتا چکا ہوں... میں اتفاقاً وہاں موجود تھا۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ یہ کیس خود کشی کے طور پر جلد بند ہو جاتا... کیونکہ موت کے اسباب اسے واضح تھے کہ کسی ٹیسٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لیکن اب تم بھر پور ٹیسٹ کر سکتے ہو... نیز سرکاری اداروں کے ہیلی کاپٹر کو نکال دیا جائے تو کم افراد بچیں گے جن کے پاس ہیلی کاپٹر ہوگا۔“

ورجل نے رک کر آخری بات کہی۔

”یہی نکتہ سب سے اہم ہے جہاں سے تمہاری تفتیش شروع ہوگی۔“ ورجل کھڑا ہو گیا۔

”اجازت ہے؟“

”میں تمہیں جلد بلاؤں گا... وعدہ رہا۔“ سارجنٹ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

چند روز بعد ورجل کو سارجنٹ باب کے چیف کی طرف سے ایک پیغام ملا۔

”مسٹر ورجل! جب تم میرے محکمے کے سارجنٹ باب کے ساتھ تھے اور باب نے بعد ازاں تمہاری لیٹن پر کام کیا تو بہت جلد پتا چل گیا کہ موت کی اصل وجہ ہیر وڈن کی زیادہ خوراک تھی۔ بھئی تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ حادثے کے وقت فضا سے کسی کو کوئی پیغام وصول نہیں ہوا۔ سارجنٹ کو ملوث ہیلی کاپٹر کی آئی ڈی معلوم کرنے میں کچھ وقت لگا۔ یہ کیس واقعی ہوی سائڈ کا تھا۔ تمہارے تعاون کا بہت شکریہ... مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ڈنر پر ملیں گے۔“

ورجل کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”لاس انجلس کے وسیع علاقے کی فضا میں جو ہیلی کاپٹر موجود ہوتے ہیں، ان کا آپس میں رابطہ ایٹش فریکوئنسی کے ذریعے ہوتا ہے... اگر کوئی حادثہ ہوتا ہے تو پائلٹ رابطہ کرتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہیلی کاپٹر فوراً سن لیتے ہیں۔ نتیجتاً بلا تاخیر فضا میں ہوتے ہیں لیکن پائلٹ نے ایسا نہیں کیا۔ کسی کو کوئی ایسا پیغام نہیں ملا۔ یہ نکتہ مجھے قتل کے امکانات کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔“

”اور کچھ؟“

”ہاں، ہیلی کاپٹر تقریباً ہر رفتار پر پرواز کرتے ہیں... انتہائی رفتار پر بھی۔ بہت کم رفتار پر بھی اور ایک ہی جگہ معلق رہنے کے علاوہ بھی مختلف انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس کا انحصار ضرورت پر ہے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ ولیم سن کو اس طرح پھینکا گیا ہے کہ وہ بلڈنگ کے ساتھ گرے... کوئی بھی ماہر پائلٹ یہ آسانی اپنے وزنی اور آہنی پرندے سے اپنی مرضی کے مطابق کھیل سکتا ہے۔ چاہے ہوا تیز ہی کیوں نہ ہو۔“

”ڈیزل یہاں ایک مضبوط اعتراض کیا جاسکتا ہے۔“

سارجنٹ نے کہا۔

”سن رہا ہوں۔“

”ولیم سن نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟ وہ اتنا کمزور نہیں تھا اور پائلٹ کو مشین پر بھی توجہ رکھنی تھی یا پھر ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے علاوہ بھی ایک یا زیادہ افراد موجود رہے ہوں گئے... اس صورت میں بھی اچھی خاصی جدوجہد ہونی چاہیے تھی۔“

ورجل نے سر ہلایا۔ ”میں اپنا نظریہ ذرا کھل کر بیان کرتا ہوں اور تم اس نظریے کی جانچ بھی کر سکتے ہو۔“

”ولیم سن نشیات استعمال کرتا تھا لیکن وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ ڈرگز اس کے کنٹرول میں تھیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نشیات کے دھندے میں ملوث تھا... تاہم اتنا ہوشیار تھا کہ جھانسا دینے کے لیے خود بھی نشیات استعمال کرتا تھا لیکن اپنے مخصوص شیڈول کے مطابق... اس مفروضے یا نظریے کو سہارا دینے کے لیے اس کی دولت کافی ہے جس کے ذرائع کا پتا نہیں... تم اس رخ پر تفتیش کر سکتے ہو۔“

”اگر میں اب تک ٹھیک جا رہا ہوں تو اس کا مطلب ہم بے رحم اور چالاک مجرموں کے بارے میں بات کر رہے ہیں... جو تیزی سے دولت مند بننے کا بہترین شارٹ کٹ

میں کوئی تو ایسا ہے، جو اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے بھی چہار سواجینی چہرے ہوں تو کسی شناسا کا ہونا، دل کی ڈھارس بندھاتا ہے۔

جوہر مضبوط ہاتھ پاؤں کا آدمی تھا۔ وہ ساٹھ سال سے اوپر کا تھا مگر اب بھی اس کے بازو توانا، اور آواز پاٹ دار تھی۔ بظاہر وہ شانستہ آدمی تھا مگر دوستوں کے لیے۔ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا مگر اس اجنبی شہر میں نہ تو کوئی اس کا دوست تھا اور نہ ہی دشمن۔ چند ہفتوں کے دوران میں اس پڑوس کے جو لوگ اسے پہچانے لگے تھے، اُن کے خیال میں وہ بے ضرر انسان تھا۔ لوگ اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ بات اس نے اچھی طرح محسوس کر لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اب زندگی کے باقی دن چین سے گزاریں۔

طویل ذہنی و جسمانی مشقت بھری زندگی کے بعد اب اسے سکون کی گھڑیاں میسر آ گئی تھیں۔ وہ دن بھر قصبے کے تفریحی مقامات پر گھومتا پھرتا اور رات کو کسی اچھے ریسٹوران میں ڈنر کرنے کے بعد گھر آ کر لمبی تان کر سوجاتا۔ مزاج کے اعتبار سے جوہر نفاست پسند اور خوش رہنے والا انسان تھا۔

جوہر کا گھر ایک تو بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ تنہا رہتا تھا۔ چاہتا تو خود گھر کی صفائی ستھرائی کر سکتا تھا مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔ اس نے زندگی بھر اس طرح کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، بڑھاپے میں کیا خاک کر لیتا۔ اسے گھر کی صفائی ستھرائی اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک جزوقتی ملازمہ کی ضرورت تھی۔ وہ کئی روز تک تلاش میں لگا رہا، آخر ایک دن اُسے اپنے ایک پڑوسی کی معرفت ملازمہ بھی مل گئی۔

یہ جو اس سال جینی اینڈرسن تھی۔ کئی سال پہلے اُس کے ماں باپ ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے، جس کے بعد وہ اپنی ایک خالہ کے ساتھ رہنے لگی۔ دو سال پہلے اُن کے انتقال کے بعد وہ اپنے بوائے فرینڈ کے پاس چلی گئی جو اسی کی طرح یتیم تھا۔ کوئی سال بھر پہلے ہی میں اس کے بوائے فرینڈ رسل کو ایل وڈ کی لائبریری میں اسٹنٹ کی ملازمت ملی تھی۔ وہ بھی اُس کے ساتھ ہی یہاں چلی آئی۔ اس وقت وہ شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک کرائے کے گھر میں اُس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اُس کا گھر جہاں واقع تھا، وہاں تیزی سے تعمیراتی سلسلے جاری تھے۔

جینی کا دو منزلہ گھر یتیمی پیلس کے برابر واقع تھا۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ یہی منزل اب تک خالی تھی۔ یتیمی پیلس اس علاقے کا مشہور گھر تھا جس کے آگے بڑا دروازہ

ایل وڈ کی جو تعریف سروے میں بیان کی گئی تھی، وہ کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ جوہر کا دو منزلہ گھر کارنر پر تھا، جہاں سے دور دور تک پہلے دیکھ کر قدرتی مناظر دیکھنے والے کے تھکے ماندہ جسم و جاں کو لکھوں میں تر و تازہ کر دیتے تھے۔ لیونگ روم کی کھڑکی کھولو تو ہوا سے جموتے درختوں کا نغمہ سنائی دیتا تھا۔ بیڈ روم کی کھڑکی سے جمیل کا نظارہ بہت پرکشش تھا، جہاں دن ہو یا رات، کوچیں، مرغابیاں، بنگے اور دیگر آبی پرندے ادھر ادھر اڑان بھرتے نظر آتے تھے۔ واقعی ایل وڈ جنت کا عکس تھا مگر ایک بات اس کے حسن کو داغ لگاتی تھی اور وہ یہ کہ پچھلے دس برسوں کے دوران میں اس کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ اب ایل وڈ قصبے کے بجائے تیزی سے پھیلتا ہوا ایک شہر تھا۔

جوہر نے بھر پور زندگی گزاری تھی۔ وہ ہمیشہ بھیڑ بھاڑ اور لوگوں میں رہتا رہتا تھا مگر پچھلے دس پندرہ سالوں سے اُس کا دل شہری زندگی کے ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ وہ قدرتی نظاروں کے درمیان سکون سے زندگی کے باقی ایام گزارنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ گھر خریدا تھا مگر جب وہ یہاں منتقل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ جیسا وہ چاہتا تھا، ایسا نہیں ہو سکا۔

ایل وڈ میں جہاں قدرتی نظاروں کی بھرمار تھی وہیں زمین پر تیزی سے مکانات اُگنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جگہ جگہ تعمیراتی کام نظر آتے تھے۔ لگتا تھا کہ شہروں کی زندگی سے اکتا جانے والے اتنی تیزی سے اس طرف آئے کہ اُن کی وجہ سے ایک اور بڑا شہر جنم لینے لگا تھا۔ جوہر چاہتا تو یہ مکان بیچ بیچے بغیر نہیں اور بھی اپنی پسند کے ماحول میں نیا مکان خرید سکتا تھا مگر اب وہ بیزاری اور تنہائی کی عمر کے اس حصے میں مزید بھاگ دوڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایل وڈ جب تک بہت بڑے شہر کا روپ دھارے گا تب تک وہ اس جہان سے ہی گزر چکا ہوگا۔ اس لیے اس نے صبر و شکر کے ساتھ اپنی خود ساختہ ریٹائرمنٹ کی زندگی اس مکان میں بسر کرنا شروع کر دی۔ وہ نیویارک میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے پوری زندگی گزاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ نیویارک سے سیکڑوں میل دور ایل وڈ میں شاید ہی اسے کوئی ایسا شخص ملے جو اس کی پچھلی زندگی سے واقف ہو۔ وہ مکمل طور پر انجان شہر میں، انجان لوگوں کے درمیان اپنی زندگی عام لوگوں کی طرح بسر کرنا چاہتا تھا مگر ایسا ہونہ سکا۔

بہت جلد وہ جان گیا کہ ایل وڈ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک نواحی قصبے میں اس کا بہت پرانا اور دو تین دوست بھی رہتا ہے۔ اس خبر سے اسے یہ بھی اطمینان ہوا کہ چلو قریب

دندان شکن جوہر کو یہ لڑکی پسند آئی تھی۔ جینی کو عجیب و غریب حلے بنانے کا بھی بہت شوق تھا۔ ہر بار وہ اپنا ہینڈ سٹائل بنا لیتی تھی۔ کبھی وہ افریقائی لکتی تو کبھی ریڈ انڈین نظر آنے کی کوشش کرتی۔ شروع شروع میں تو جوہر کے لیے یہ لڑکی حیرت کا باعث بنی مگر رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بچپن میں ماں باپ کی جدائی کا صدمہ اٹھانے والی یہ لڑکی اگر خوش مزاج نہ ہوتی تو اب تک خود کو تباہ کر چکی ہوتی۔

جینی کے بوائے فرینڈ رسل سے بھی جوہر دو چار بار مل چکا تھا۔ اس کے بارے میں اُس کی رائے اچھی تھی۔ رسل شانستہ مزاج کا پڑھا لکھا سنجیدہ انسان تھا۔ وہ دن میں نوکری کرتا اور شام کے کالج سے گریجویشن کر رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چلتے ہوئے ہلکا سا ٹنگ آتا تھا۔ رسل نے بتایا تھا کہ وہ ہائی اسکول میں بیس بال کا کھلاڑی تھا۔ ایک روز وہ کھیلتے ہوئے گیلی چچ پر پھسلا، جس کی وجہ سے اُس کا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ اگرچہ علاج تو ہو گیا تھا مگر گلنے میں لنگ آ گیا تھا مگر سردیوں میں یہ چوٹ اُسے بہت تکلیف دیتی تھی۔ جوہر کو یہ بات پسند آئی تھی کہ جینی کے مقابلے میں رسل بہت ذتے دار اور سنجیدہ انسان تھا۔ جوہر کو یقین تھا کہ رسل اُس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگا۔ خود رسل نے بھی ایک بار اس سے کہا تھا کہ وہ گریجویشن کے بعد اچھی سی ملازمت حاصل کر کے جینی سے شادی کر لے گا۔ ویسے بھی جینی میں لائیبالی پین کے سوا اور کوئی خامی نہیں تھی۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی اور سادہ سی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

جوہر اکثر دن میں ادھر ادھر گھوم پھر کر وقت گزارا کرتا تھا۔ اس نے جینی کو گھر کی اضافی چابی دی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ آنے سے پہلے اسے فون کر لیا کرے تاکہ وہ گھر پر ہی رہے۔ کیونکہ جب وہ آتی تو اس سے دو چار باتیں کر کے اس کی تنہائی دور ہو جاتی تھی۔ اُس کے جاننے کے بعد یہ ایک بار پھر اُداس اور تنہا ہو جاتا تھا۔ جوہر کو جینی میں اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جینی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب بھی اُس کا ہاتھ تنگ ہوتا یہ فوراً اس کی مالی مدد کر دیتا تھا۔ وہ بھی اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ جب وہ آتی تو اتنی بے تکلفی سے اس سے باتیں کرتی جیسے وہ اس کا بہت قریبی دوست ہو۔

☆☆☆

جوہر ناشتے کے بعد گھر سے نکل جاتا تھا لیکن منگل کو ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوسری منزل پر واقع بیڈ







کرنی چاہیے تھی۔“ جوز کے چہرے پر سخت پریشانی نظر آرہی تھی۔  
 ”میں نے کہا بھی کہ اسپتال چلو مگر وہ نہیں مانتا۔“ جینی نے جواب دیا۔  
 ”اس وقت وہ کہاں ہے، اس کی حالت کیسی ہے؟“  
 ”صبح سویرے کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تھی۔ سو کرائی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ نیچے گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔“ جینی نے بتایا۔ ”میں نیچے گئی اور ایک بار پھر اسے اسپتال چلنے کو کہا۔ وہ درد سے کرا رہا تھا۔ کہنے لگا تم کام پر جاؤ میں تھوڑی دیر میں خود ہی جلا جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ انگلی کی پور سے آنسو صاف کرنے لگی۔  
 ”ایک تو تم پوری بات تفصیل سے نہیں بتاتی ہو۔“ جوز نے جھلا کر کہا۔ ”اے کہاں کہاں چومیں لگی ہیں؟“  
 ”پورے جسم کا تو پتا نہیں البتہ چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔“ جینی نے بتایا۔ ”نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ اس پر خون کی پڑیاں جمی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے بھی گھونسوں کے نشان تھے۔ نیل کا نشان کالا پڑ چکا تھا۔ چہرے پر کافی سوجن تھی۔“  
 ”اور گھنٹا؟“ جوز نے تشویش سے کہا۔ ”اس کا گھنٹا تو پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔“  
 ”وہاں بھی چوٹ لگی ہے۔“ جینی نے جواب دیا۔  
 ”اس کی گردن پر بھی کٹ کا نشان تھا۔ لگتا ہے اس لڑکے نے گردن پر زور سے چاقو گزرایا ہوگا۔“  
 ”یہ پولیس کیس ہے اور تم اتنے آرام سے...“  
 ”آرام سے نہیں بیٹھی...“ جینی نے تھلا کر اس کی بات کاٹی۔ ”ساری رات کہتی رہوں کہ پولیس کو فون کرو مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ جب میں خود فون کرنے لگی تو اس نے مجھے بھی نہیں کرنے دیا۔ کہنے لگا کہ ان بد معاشوں سے خواخوہ کی دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اسی لیے اسپتال بھی نہیں جا رہا کہ ڈاکٹر پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔“  
 ”صورت حال بہت تشویش ناک ہے۔“ جوز خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ”سب سے پہلے رسل کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ اس کا ایک سرے ہونا چاہیے۔ گردن پر زخم ہے تو اب ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ کہیں اس پر ٹانگا لگانے کی تو ضرورت نہیں۔“  
 ”اب میں کیا کروں؟“ جینی نے بے بسی سے کہا۔

”تم فوراً گھر پہنچو۔“ جوز نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں کسی کو بھیجتا ہوں تاکہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔“  
 یہ سن کر جینی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ جوز نے ڈانٹ دیا۔ ”تم اسی وقت سیدھی گھر جاؤ۔ اب کیا کرنا ہوگا، وہ میں دیکھ لوں گا۔“  
 یہ سن کر جینی ایک لفظ کہے بغیر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ”ہاں کوئی بھی بات ہو، مجھے فوراً موبائل فون پر اطلاع دینا۔“ اسے جانا دیکھ کر جوز نے تاکید کی۔ ”اور یہ رکھ لو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جینی کی طرف دو سو ڈالر بڑھائے۔ جینی نے چپ چاپ نوٹ لے کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لیے۔  
 جینی کے باہر نکلنے ہی اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر مایا۔ ہیلو۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔  
 ”میں تمہیں ایک پتہ لکھوا رہا ہوں۔ یہاں فوراً کسی شخص کو بھیجو۔ وہاں رسل نامی ایک زخمی لڑکا ہے۔ اسے فوراً اسپتال پہنچاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ فون کے دوسری جانب موجود شخص کو جینی کے گھر کا پتہ لکھوانے لگا۔ پتہ لکھوانے کے بعد اس نے مزید کچھ ہدایتیں دیں اور ریسیور رکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔  
 ”ہیلو...“ کافی دیر بعد اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر مایا۔  
 ”فوراً ملاقات کرنی ہے۔ سہ پہر کو اروا کیسے میں ملو۔ میں باہر ہی بیٹھا ہوں گا... بائے۔“  
 ”ممتا ہوں باس!“ دوسری طرف موجود شخص نے جواب دیا۔ ریسیور کر بیڈل پر رکھ کر ایک بار پھر وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔ جوز کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جینی کو پیش آنے والا قصہ سن کر اسے اپنی بیٹی سینڈرا یاد آگئی۔ بیس برس پہلے وہ اُس وقت جینی کے برابر کی ہی تھی۔  
 ☆☆☆  
 دن کے پونے تین بج رہے تھے۔ جوز کچھ دیر پہلے ہی کیفے اروما پہنچا تھا۔ گرمیاں تھیں مگر اس کے باوجود موسم خوشگوار تھا۔ گرمیوں کی وجہ سے ہی کیفے کے سامنے فٹ پاتھ پر کرسی میز لگی ہوئی تھیں۔ چند لوگ بیٹھے کافی اور سگار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیفے ایسی جگہ بنا ہوا تھا جہاں سے پڑویل کو جانے کے لیے راستہ نکلتا تھا۔ یہ ایل وڈ سے دس کلومیٹر دور واقع قصبہ تھا، جہاں خوش حال اور نہایت

مال دار لوگوں کے فارم ہاؤس تھے۔ جوز کی نظرس اسی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پڑویل کی طرف سے سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو آتی نظر آئی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کیفے کے سامنے عین اس جگہ رکی جہاں جوز بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظرس بھی کار پر جمی۔ اگلے ہی لمحے کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور اعلیٰ نسل کا خونخوار کتا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے کتے کی زنجیر ہاتھ میں تھامے ایک شخص باہر نکلا۔ وہ بہت عمدہ سیاہ سوٹ اور سرخ رنگ کی شرٹ میں لمبوس تھا۔ باہر نکلنے ہی اس نے بڑے تکبرانہ انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ جیسے ہی اس کی نظر جوز پر پڑی وہ مسکراما ہوا جلد سے آگے بڑھا۔ یہ جی کو نڈرا سن تھا۔ ذبیات کے دھندے کا بے تاج بادشاہ مگر مافیا کے دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی بظاہر کاروباری اور شریفانہ زندگی گزارنے کا ڈھونگ رچا چکا تھا۔  
 ”دیکھو کیسا ہے یہ؟“ جی آگے بڑھا اور کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوز سے کہا۔  
 ”بہت خوش لگ رہا ہے باؤزر۔“  
 ”خوش کیوں نہیں ہوگا، میرے پاس جو رہتا ہے شاہانہ انداز میں۔“ جی نے ہنس کر جواب دیا۔ کچھ عرصے پہلے جوز نے یہ کتا اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ جی کو کتوں سے ویسے ہی بہت لگاؤ تھا۔ ”اب یہ باؤزر نہیں مہی ہے۔ میں نے اس کا نیا نام رکھا ہے۔“ وہ جوز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر، ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔  
 ”تمہاری اولاد ہے، جو چاہے نام رکھو۔“ جوز نے مسکرا کر جواب دیا۔  
 ”یہ تو ہے۔“ جی نے تہقہ لگاتے ہوئے کہا۔  
 ”کافی، چائے یا کولڈ ڈرنک؟“  
 ”جو چاہے منگوا لو۔“  
 ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر جوز نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ”دو کافی۔“  
 جوز اور جی کی دوستی بہت پرانی تھی۔ ستر کی دہائی کی بات ہے کہ جب جی نیویارک پہنچا۔ اسے شہر کے مضافات میں ڈیری فارمنگ کے لیے زمین اور لائسنس درکار تھا۔ وہ ذبیات کے دھندے میں لہبا مال کما چکا تھا اور اب غیر قانونی آمدنی کو قانونی شکل دینے کے لیے ڈیری فارمنگ کا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس دھندے میں آنے سے پہلے گوالا تھا۔ کام کا تجربہ تھا اور پیسہ بھی تھا مگر نئے شہر میں اس کا کوئی واقف نہیں تھا۔ اتفاقاً طور پر وہ دونوں ایک ریستوران میں ملے اور باتوں باتوں میں یہ یاد پڑا کہ اس نے جوز سے

دندان شکن کر دیا۔ جوز کو وہ شخص پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ نیویارک میں اس کی اچھی خاصی جان پہچان اور اثر و رسوخ تھا۔ اس نے جی کی مدد کی۔ جوز کی کوششوں سے اسے بہت جلد زمین اور اجازت نامہ مل گیا۔ بمبیسوں کی خریداری، باڑے کی تعمیر اور دیگر کاموں میں بھی جوز نے اس کی بہت مدد کی۔ جلد ہی اس کا کاروبار چل پڑا۔ اس کے بعد کئی ایسے مواقع آئے، جب جی کو اس کی ضرورت پڑی۔ وہ بھی اچھے دوست کی طرح ہر مشکل میں اس کے کام آیا۔ جی نے متعدد بار اسے پانٹرنیٹ کی پیشکش کی مگر ہر بار اس نے جی کی پیشکش کو مسکرا کر ٹال دیا۔ وہ دوستی کو دوستی تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اب تو کئی دہائیاں گزر چکی تھیں۔ جی بہت زیادہ مالدار ہو چکا تھا۔ اس کا کاروبار امریکا کے کئی حصوں میں پھیلا ہوا تھا مگر جرم کی دنیا سے اب بھی اس کا گہرا تعلق برقرار تھا۔  
 ان کی دوستی مدت گزر جانے کے باوجود آج بھی قائم تھی۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جوز نے اس سے رابطہ کر کے مدد کی درخواست کی تھی۔ یہ سنتے ہی جی بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ جوز کے کہنے پر ہی وہ اس سے ملنے کے لیے اس وقت کیفے پہنچا اور نہ تو دوپہر کو جب جوز نے اسے گھر سے فون کیا، وہ اُسی وقت آنے کے لیے تیار تھا۔  
 ”تمہارے فون کے کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔“ جی نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر وہ انتظار کرنے لگا کہ جوز منہ کھولے اور اسے بتائے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا گام اور آنکھیں اُس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔  
 ”شکر ہے۔“ یہ سن کر اس نے جواب دیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اُن کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے۔“  
 ”پورا قصہ بتاؤ، اصل ماجرا کیا ہے؟“ جی نے تشویش کن لہجے میں کہا۔  
 ”جب میں یہاں آیا تو گھر کی صفائی کے لیے ایک لڑکی کو ملازمہ رکھ لیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جینی اور رسل کے ساتھ اُن بد معاش لڑکوں کی حرکت تفصیل سے اُسے سنانا شروع کیا۔  
 ”تو یہ ہے تمہاری پریشانی۔“ جوز نے قصہ تمام کیا تو اس نے جواب دیا۔ ”اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں کہ وہ کون ہیں اور کتنے پانی میں ہیں۔“  
 ”تمہارا دھندہ تو اُس علاقے میں نہیں چل رہا ہے؟“

☆ ☆ ☆  
اسے خاموش دیکھ کر جوز نے پوچھا۔ ”ایسا ہے تو کہیں وہ تمہارے ہی کارندے نہ ہوں۔ جینی بتا رہی تھی کہ وہ جس پیٹے ہیں اور شاید بیچتے بھی ہیں۔“  
”میرا دھندا...“ وہ مسکرایا۔ ”میرے خیال میں تو وہاں میرا کوئی بندہ نہیں مگر پھر بھی پوچھ لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل فون اٹھایا۔ ”کیا نام بتایا تھا اس علاقے کا؟“

”ایسٹ ڈیلوان، ہینری ہیلس۔“  
”ہاں سنو“ جی نے فون اٹینڈ ہونے پر کہا۔ ”ایسٹ ڈیلوان میں ہمارا کوئی گروپ کام کر رہا ہے؟“ اس نے پوچھا اور جواب سننے لگا۔  
”نہیں، کوئی نہیں۔“ جی نے فون بند کر کے کہا۔ ”تم جو کرنا چاہتے ہو، وہ کام میں کروا دیتا ہوں۔“ اس نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔  
”مگر میں تو تمہیں کسی کام کا نہیں کہہ رہا ہوں۔“  
”جانتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”مگر پھر بھی... اگر مناسب سمجھو تو۔“

”میرے خیال میں نہیں۔“ جوز مسکرا دیا۔ ”ابھی ان ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ بد معاشوں کو مزہ چکھا سکیں۔“  
کچھ دیر تک وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں جوز نے ایک بار پھر کافی منگوائی۔ جی اس کا پرانا دوست تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے آدمی بھیج کر اُن لڑکوں کو سیدھا کروادے مگر وہ نہ مانا۔ ”تمہارا منصوبہ کیا ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے جوز سے پوچھا۔

”مجھے ایک بی ایم ڈیلو سیاہ کار چاہیے، باوردی ڈرائیور کے ساتھ۔“ پورا منصوبہ سن کر اس نے جی سے کہا۔  
”ابھی پہنچ جاتی ہے۔“  
”ابھی نہیں۔“ جوز نے لقمہ دیا۔ ”چار بجے میری روزگار ڈن کے سامنے، وہ مجھے وہاں سے پک کر لے۔“

جی سے ملاقات کے بعد جب وہ گینے اروما سے روانہ ہوا تو اُس وقت جی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے فون ہولڈ پر کیا اور ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کیا۔ ”بے فکر ہو، وہ منٹ لے گا اُن سے مگر جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا۔ جوز کو ویسے بھی اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ فون کے دوسری طرف موجود شخص کی بات سننے لگا۔  
”غور سے سنو۔ میں یہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی اسی وقت۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ ہدایات دیں اور موبائل فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

باقی ہیں۔ یہ دنیا ہے پیارے۔ یہاں ہر جگہ سوالات ملتے ہیں اور جینا ہے تو جواب دینا پڑے گا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں بائیں آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ تجربے سے ہی سمجھی ہوگی یہ بات۔“ ڈرائیور نے بیک ویو مرر میں اسے آنکھ مارتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
جوز نے راستے میں ہی ڈاکٹر کو فون کر کے رسل کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے بے دردی سے مارا گیا تھا تاہم خوش قسمتی سے کوئی ایسا زخم نہیں لگا جس کی وجہ سے اسے کسی بڑے خطرے کا سامنا ہو۔ ماسوائے گھسنے پر لگنے والی چوٹ کے۔ یہ وہی گھٹنا تھا جو ایک بار پہلے بھی زخمی ہو چکا تھا اور دوبارہ اسی پر چوٹ لگی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا گھسنے سمیت اس کے جسم پر کوئی جگہ سو جن ہے۔ رسل کو دو تین دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ سو جن اترنے کے بعد اس کے گھٹنوں کے دوبارہ اسکیرے لیے جائیں گے، تب ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب آگے کیا کرنا ہوگا۔

اُس کی منزل ہینری ہیلس تھی۔ وہ اس گھر کا دن کی روشنی میں اچھی طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے جینی کو فون کر کے اُن ٹینوں لڑکوں اور گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جینی نے بتایا تھا کہ وہ تین دراز قامت لڑکے ہیں۔ ان کی عمریں اٹھارہ سے پچیس سال کے درمیان ہوں گی۔ جینی کا کہنا تھا کہ ان کے پاس سیاہ رنگ کی بڑی سی ریچ روڈر جیب ہے۔ اس لیے جوز کو یقین تھا کہ اسے اُن لڑکوں اور گاڑی کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

مگر تم یہ سب کچھ کیوں معلوم کر رہے ہو؟“ جینی نے سب کچھ بتانے کے بعد استفسار یہ لہجے میں سوال کیا۔  
”تا کہ ان کی ایک یادگاری تصویر بھیج سکوں۔“ یہ کہہ کر اس نے زوردار کا ہتھیار لگا کر فون بند کر دیا۔  
کافی دیر بعد ڈرائیور پوسٹ ڈیلوان میں ایک کھلی جگہ پر کار پارک کر رہا تھا۔

اگلے دس منٹ کے اندر اندر اس نے ہینری ہیلس کا پتا چلا لیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو پتا بتا کر ہدایت کی کہ وہ نہایت ست روی سے گاڑی چلاتا ہوا اس گھر کے سامنے سے گزرے۔ جب وہ ہینری ہیلس کے سامنے پہنچے تو گھر کے سامنے کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ ویسے بھی جینی نے جس ریچ روڈر کا ذکر کیا تھا، وہ وہاں دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ آفت کے وہ پرکالے کہیں اور منہ

☆ ☆ ☆  
مار رہے ہوں گے۔ اس نے لمحہ بھر تک گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔  
اگلے آدھا گھنٹے تک وہ ویسٹ ڈیلوان کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس نے ہر شے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ جب وہ اپنے گھر لوٹا تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے گاڑی کو واپس بجھوایا اور نہا کر آرام کرنے لگا۔ اسے رات کا انتظار تھا۔ اس رات اس نے دیر سے ڈنر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ڈنر اسے ویسٹ ڈیلوان کے کسی ریستوران میں کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆  
رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب وہ ویسٹ ڈیلوان کے مرکزی ٹون ریستوران میں کھانا کھا کر باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی جھیل جانے والے راستے پر بڑھ رہی تھی۔ راستہ بالکل سناٹا تھا۔ ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے کار روکی اور درختوں کے جھنڈ میں گاڑی کھڑی کر کے پیدل واپس چل پڑا۔ تقریباً تیس پینتیس منٹ بعد وہ ہینری ہیلس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے سگریٹ سلگائی اور کمر سے بندھے پستول کو ہاتھ لگا کر تسلی کی۔ جوز نے ڈھیلی ڈھالی پتلون، آدمی آستین کی شرٹ اور جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ریٹائرڈ بوڑھا ڈنر کے بعد ہوا خوری کے لیے نکلا ہو۔  
ہینری ہیلس سے میوزک کی بہت ادنیٰ آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا شکار دستیاب ہے۔ سگریٹ زمین پر پھینک کر اس نے پاؤں تلے مسلا اور ہینری ہیلس کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائی۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ اب تک کسی نے اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب سے اندر جھانکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پیچھے کیے ایک لڑکا نیم دراز تھا۔ میوزک کا شور اتنا اونچا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں دو لڑکے آنکھیں موندنے پڑے تھے۔ ”سنو...“ جوز نے لگ بھگ چلاتے ہوئے کہا مگر اس بے ہنگم میوزک میں اس کی کسی نے نہ سنی۔ اس نے شریفانہ انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر نیم دراز لڑکے کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر کے اشارے سے پوچھا کیا ہے۔  
”آواز ہلکی کر دو۔“ جوز نے ہاتھوں سے اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔“ اس لڑکے نے غصیلی آواز میں کہا۔ وہ اتنی زور سے چلتا یا تھا کہ پچھلی سیٹ پر نیم دراز دونوں لڑکے بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ زوردار جھکے سے کھولا۔ دروازہ جونز کو لگا۔ اس نے لڑکھڑانے کی اداکاری کی۔ یہ دیکھ کر وہ ہنسا اور چھلانگ مارتے ہوئے باہر آیا۔ اس کے نکلنے ہی اس کے دوسرے دو ساتھی بھی باہر آ گئے۔ میوزک بدستور اونچی آواز میں بچ رہا تھا۔ وہ تینوں اس کی طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔

”کیوں... کیا ہوا بڑے میاں۔“ ڈرائیونگ سیٹ والے لڑکے نے اس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اتنی اونچی آواز میں میوزک مت بجایا کرو۔“ جونز اپنے لہجے سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت تھوڑا سا ڈرا ہوا ہے۔

”کیوں... کیا تو ہمارا باس ہے!“ ایک اور لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لوگ بے آرام ہوتے ہیں۔“ ”تو تجھے کیا؟“ ”بہتر ہے کہ میری بات سمجھ لو۔“ جونز نے تھپیہ کے انداز میں انہیں انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تو تو کیا کر لے گا۔“ یہ سنتے ہی ایک لڑکے نے اس کے سینے پر زور کا ہاتھ مارا مگر جونز اپنی جگہ پر استقامت سے کھڑا رہا۔ ان تینوں نے اس کے گرد دائرہ بنا لیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا لڑکا ان کا سر غنک رہا تھا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“ جونز کا لہجہ سخت تھا۔ یہ سنتے ہی ان تینوں کو غصہ آ گیا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا۔ دو اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ دو قدم آگے بڑھ کر وہ پیچھے ہٹا اور اس نے ایک ٹانگ اٹھائی۔ وہ کنگ فو کا ماہر لگ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ جونز کو ٹک مارنا، صورت حال بدل گئی۔ جونز نے اپنے برابر کھڑے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے، اس کا جسم فضا میں دائرے کی شکل میں اٹھا۔ اس کی ایک ہانگ سے دو لڑکے ڈھیر ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ تیسرا اپنے دفاع میں کچھ کرتا، وہ ایک بار پھر فضا میں اچھلا۔ اگلے لمحے تیسرا بھی اوندھے منہ زمین چاٹ رہا تھا۔ جونز نے بس

نہیں کی۔ کئی منٹ تک انہیں مارتا رہا۔ صرف تین منٹ کے اندر وہ تینوں نیم بے ہوش ہو چکے تھے۔ جونز زمین پر بیٹھا اور بے بعد دیگرے ان تینوں کی گردنوں پر ہاتھ پھیر کر ہٹکے سے دبا یا۔ تینوں نیم بے ہوش ہو چکے تھے۔ ریخ روڈر سے بدستور کالوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے تینوں لڑکوں کو ان کی گاڑی کی پچھلی نشست پر اوپر تلتے ٹھوسا۔ اسے علم تھا کہ گردن کی مخصوص رگ دبا دینے کے باعث اب وہ کئی گھنٹے تک بٹنے بٹنے اور بولنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ البتہ وہ سن سکتے تھے۔ پانچ منٹ کے اندر جونز نے کارروائی مکمل کر لی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے میوزک بند کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم بہت میوزک سن چکے۔“ اس نے پچھلی سیٹ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تینوں اس کی بات سن رہے ہوں گے۔ یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور زور سے کہا۔ ”کہا تھا کہ سمجھ جاؤ مگر تم ماننے ہی نہیں۔ اب یہ گاڑی اور اس کا میوزک ستم تمہاری قبر بننے جا رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نہایت تیزی سے گاڑی ریورس کی۔ کچھ دیر بعد وہ جمیل والے راستے پر جا رہا تھا۔ سڑک بدستور سناٹا تھی۔ جس جگہ اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی، وہاں جا کر رکا۔ اس نے ریخ روڈر کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے۔ دروازے لاک کیے اور گاڑی کا رخ جمیل کی طرف کر کے گیر نیٹر ل کیا اور باہر آ کر پیچھے سے گاڑی کو دھکا دینے والا ہی تھا کہ اسی دوران جھاڑیوں میں حرکت ہوئی۔ ”ایک منٹ۔“ غیر متوقع آواز سن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جھاڑیوں سے وہی ڈرائیور نکل رہا تھا، جسے سہ پہر جمی نے بی ایچ ڈبلیو کے ساتھ بھجوا یا تھا۔

”تم...“ اسے دیکھتے ہی جونز نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں میں۔“ وہ مسکرایا۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ”تمہاری مدد کا منتظر، باس کا حکم ہے۔“ ”تو پھر آؤ، ڈرا دھکا لگاؤ۔“ جونز نے مسکرا کر کہا۔ چند منٹ بعد ریخ روڈر جمیل کی تہ میں جا چکی تھی۔

ڈرائیور نے اسے بتایا کہ جب وہ ان لڑکوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا، اس وقت بھی اس کی مدد کے لیے دو آدمی وہاں موجود تھے۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ باس کا حکم تھا کہ ہم سب تمہاری نظر سے خود کو روپوش رکھنے کی کوشش کریں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ تم بوڑھے ہو، شاید ان جوانوں کا مقابلہ نہ کر سکو۔ مگر تم نے تو... بڑے میاں تو کمال کے جوان

نکلے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”ٹھیک ہے اب تم چلو۔“ جونز نے کہا۔ اب تک وہ جمیل کے کنارے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ”آئی ایم سوری سینڈرا...“ یہ کہہ کر وہ سر سے سرے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

اب تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی تھی مگر جونز کے دل پر لگے زخم اب تک تازہ تھے۔ بہت پہلے کچھ بد معاش لڑکوں نے ساحل پر پک تک مناتے ہوئے اس کی بیٹی کو زبردستی زیادتی کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ انہوں نے بیٹیں بس نہیں کی۔ زیادتی کے بعد وہ اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر فرار ہو رہے تھے کہ کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی کہ کچھ بد معاش لڑکے نیم بے ہوش لڑکی کو جیب میں ڈال کر بھاگ رہے ہیں۔ فون کرنے والے نے پولیس کو مقام اور گاڑی کا نمبر بھی بتا دیا تھا۔ پولیس نے تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی راستے پر جانے والی جیب کا پتا چلا لیا۔ لڑکوں نے پولیس کو پیچھے آتا دیکھ کر بچنے کے لیے رفتار تیز کر دی اور پھر ایک موڑ کو تیز رفتاری سے کاٹتے ہوئے گاڑی اُن کے قابو سے باہر ہو کر پلٹ کر کھائی میں جا گری۔ سینڈرا اور اُن تین میں سے دو لڑکے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ایک شدید زخمی ہوا جو کئی روز بعد اسپتال میں چل بسا۔ زخمی لڑکے نے سینڈرا سے اجتماعی زیادتی کا اعتراف کر لیا تھا۔ سینڈرا اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیوی کئی سال پہلے کینسر کے باعث چل بسی تھی۔ اس کے بعد بیٹی ہی اس کے جینے کا سہارا تھی۔ سینڈرا کی موت کے بعد اس کا شہری زندگی سے دل ہی اچاٹ ہو گیا۔ وہ نکلتا چاہتا تھا لیکن وہ جس دھندے میں تھا، اُس سے نکلتا آسان نہیں ہوتا۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد اس نے اپنے دھندے سے جان چھڑائی اور سب کچھ بھلا کر سکون کی زندگی بسر کرنا شروع کی مگر جب جینی نے اسے اپنی پتاسناکی تو اس کا خون کھول گیا۔ اس کے پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ جینی نے نہیں بلکہ سینڈرا نے بتایا ہے۔ وہ ان تینوں اوباشوں کا مزہ چکھانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ آج برسوں بعد ایک بار پھر پہلے والا جونز اس کے اندر انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

دندان شکن

صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے، جب جونز ناشتا کر کے تیار ہوا۔ وہ شہر کے مرکزی بازاری کی طرف جا رہا تھا۔ گھنٹا بھر تک وہ شاپنگ میں مصروف رہا۔ اس کے بعد وہ بیڑی سیٹس کی طرف چل دیا۔ وہ جینی سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈور بتل بجائی تو جینی نے دروازہ کھولا۔

”تم... یہاں۔“ جونز کو دیکھتے ہی وہ حیرت سے بولی۔ ”اندر آ جاؤ۔“ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

”کیا حال ہیں؟“

”بالکل ٹھیک۔“ جینی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ جونز کو دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

”رسل کا کیا حال ہے؟“ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی بات ہوئی تھی، کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر بہت اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بتا رہا تھا کہ اب کافی بہتر حالت ہے۔“ جینی نے تفصیل سے بتایا۔

”پولیس پہنچی تھی اس کے پاس؟“ ”نہیں۔“ جینی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے بھی یہ بات اس سے پوچھی تھی۔“ ”خیر اب پولیس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ جونز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

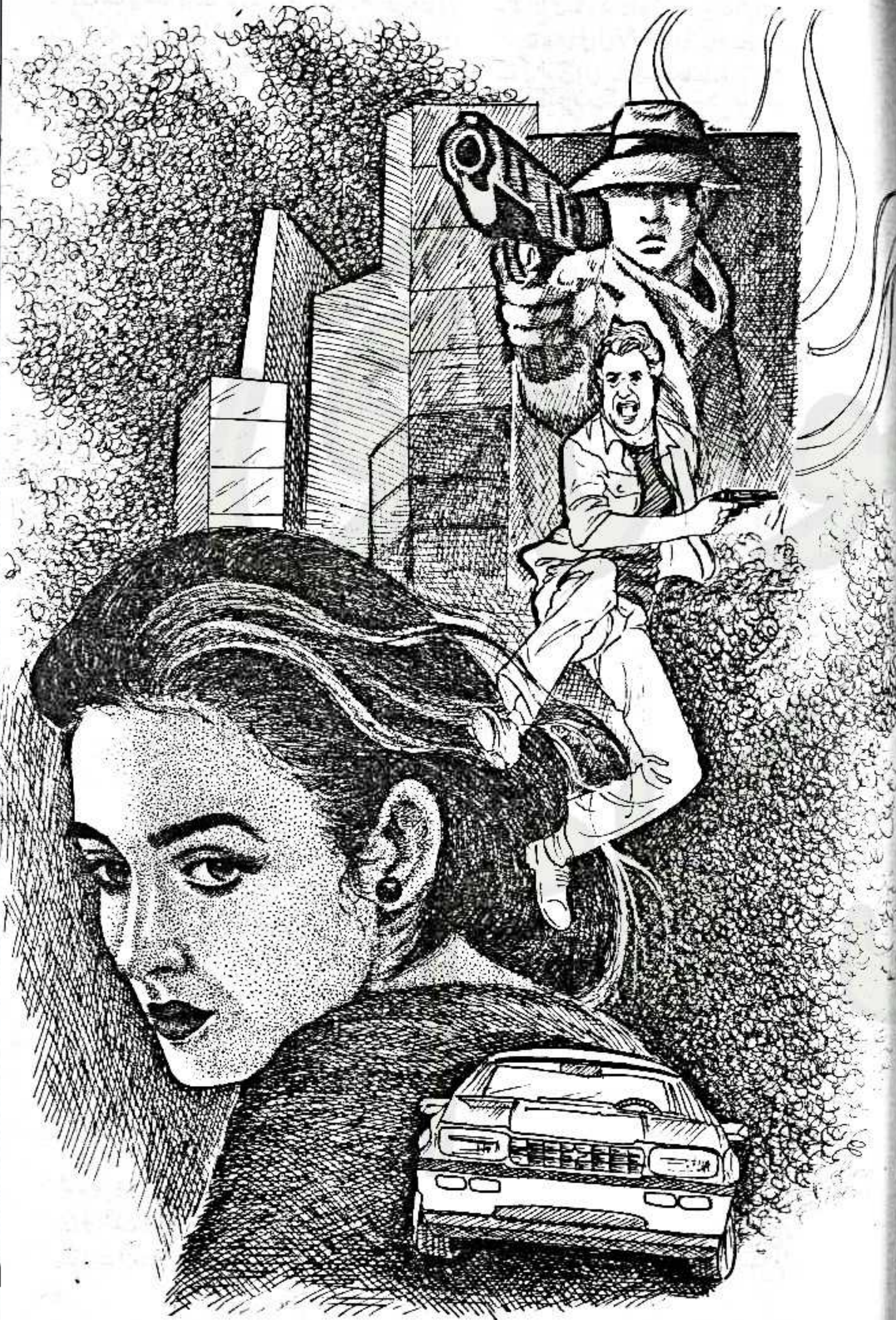
اسی دوران میں ڈور بتل بجی۔ جینی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ”رکوہ... رات نیند کیسی آئی۔“ جونز نے پوچھا۔

”بہت اچھی۔“

”اب تمہیں ہمیشہ بہت اچھی نیند آئے گی اور وہ بھی گرمیوں میں کھڑکی کھولے بغیر۔“ ”کیا...“ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پاتی ہے۔

”جاؤ اور جا کر دروازہ کھول دو۔“ جینی نے دروازہ کھولا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ ”یہ انٹرنیشنل شہر کہاں لگتا ہے؟“ جینی نے پلٹ کر جونز کی طرف دیکھا۔

”اسے بیڈروم کا راستہ دکھاؤ۔“ جینی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے دروازے کے سامنے سے بچی اور ان دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔



## شکست

اقبال کاظمی

المیہ... اتفاقات زیست کا حصہ ہیں... لیکن کچھ المیہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ وقت کتنے ہی فاصلے عبور کر لے... وہ ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے... ان کی کسک... دل اور روح کو جھنجوڑے رکھتی ہے... ایک ایسی ہی گم گشتہ و دل نشیں کہانی... جو کسی نہ کسی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے... کہیں دوستی کا جذبہ... ہے تو کہیں انسان کے اندر زہر کی طرح پھیلتے لالچ کی عکاسی... کہیں محبت میں شک کی دیواریں تو کہیں عمل اور بے عملی کے بہنور میں گہرے انسانوں کے قصے... جو لمحہ بہ لمحہ انتقام کے شعلوں میں گہرتے ہی جا رہے تھے...

ماضی کا ایک انٹرنٹ قصہ جو نقطے سے

داڑے کی صورت اختیار کرنا چاہا گیا...

بروک لاج کے برآمدے میں کرسی پر نیم دراز لوسی، قہقہے کی طرف سے آنے والی سڑک پر اس کا روک دیکھ کر چونک سی گئی جو کسی بدست شرابی کی طرح جھومتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ صبح سے ہونے والی موسلا دھار بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اور اب محض یونٹا باندی ہو رہی تھی۔ لوسی موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ دیر پہلے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تھی۔ اس بارش نے زندگی کا سارا نظام کلیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ کم از کم دو

جاسوسی ڈائجسٹ (158) مئی 2014ء



”کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ طلاق کیوں لینا چاہتی ہے جبکہ اسے کوئی تکلیف بھی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میں اسے ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ رچرڈ کہتے کہتے رک گیا اور لوسی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس کی نظروں میں کوئی اور ہو۔ تم اس کی چھوٹی بہن ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اس معاملے میں کچھ علم ہو۔ اگر ایسا ہے تو حالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور شاید اسے کچھ سمجھایا بھی جاسکے۔“

”میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“ لوسی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے جوڈی کے بارے میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی۔“

”لیکن پھر طلاق کا مطالبہ کیوں؟“ رچرڈ کی پیشانی پر سلوٹس ابھر آئیں۔

”آپ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات جس نے اس سنگین صورت حال کو جنم دیا ہو؟“ لوسی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل نہیں۔“ رچرڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے اس کے ذاتی معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کی اور نہ ہی کسی معاملے میں اس سے کبھی کوئی باز پرس کی ہے۔ رات گئے تک ٹائٹ کلبوں میں گھومنا اس کے معمولات میں شامل ہے۔ اس رات بھی وہ میرے ساتھ لونی تھی۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ وہ جب کافی دیر تک اپنی خواب گاہ کی طرف نہیں آئی تو میں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا۔ وہ اسٹور روم میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے زیورات والا باکس لیے باہر نکلی۔ اسے میز جیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جوئے میں سب کچھ ہار آئی تھی اور اب اپنے زیورات لے کر جا رہی تھی لیکن جب وہ دوبارہ خواب گاہ سے باہر نہ نکلی تو میں نے اپنے کمرے سے نکل کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن نہ تو اس نے میری پکار کا جواب دیا اور نہ ہی دروازہ کھولا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور رات بھر جوڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہماری ملاقات صبح ناشتے پر ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شاید اسے رقم کی ضرورت ہو لیکن اس نے فوراً ہی طلاق کا مطالبہ کر دیا اور یہ دم مہلک بھی دی کہ اگر میں نے اپنی مرضی سے طلاق نہ دی تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اس

ملک سے جا رہی ہے کسی ایسی جگہ جہاں سے کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ کیا ایک اس نے مجھ سے ملنے کے لیے اور ملک سے جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟“

لوسی اس کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی۔ جوڈی کا یہ فیصلہ واقعی حیران کن تھا جبکہ رچرڈ کے پاس۔۔۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ اداس سی نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ممکن ہے اس نے یہ سب کچھ مذاق میں کہا ہو۔ ویسے جوڈی بھی عجیب لڑکی ہے۔ بعض اوقات بڑے سنگین مذاق کر گزرتی ہے۔“

”پہلے میں بھی اسے مذاق ہی سمجھا تھا لیکن وہ اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے اور اپنے دکیل سے کس تیار کر رہی ہے۔ جوڈی یہ شہر چھوڑنا چاہتی ہے لوسی! وہ خوف زدہ ہے۔ اس کے ذہن پر کوئی انجانا سا خوف مسلط ہے۔ یہ انجانا خوف ہی اسے یہاں سے دور کسی انجان منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ آج شام کی ٹرین سے جا رہی ہے اور اپنا سامان بھی تیار کر چکی ہے۔ میں یہاں تمہارے پاس صرف اس لیے آیا ہوں کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ اگر وہ تمہاری بات نہ مانے تو اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ زندگی کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے یا نادانستگی میں غلط لوگوں کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ زمانہ بہت نازک ہے لوسی۔ اگر وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تو میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اس کی نگرانی کروں؟“ لوسی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔ تمہارے زمانہ تعلیم کے دوران میں نے تمہاری مدد کی تھی اور اب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

تھا۔ رچرڈ چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم جوڈی کی بہن ہو اور تمہیں بھی یقیناً اس سے بہتر رہی ہو گی۔ تمہارے مالی حالات بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ میں تم پر اخراجات کا بوجھ بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ لہذا تمام اخراجات کے علاوہ دو ہزار ڈالر بھی تمہاری خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

لوسی عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ وہ جوڈی کے مزاج سے واقف تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اسے جھٹک بھی دیتی لیکن یہاں مسئلہ دیگر نوعیت کا تھا۔ رچرڈ کے اس خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اگر وہ غلط ہاتھوں میں پڑ گئی تو کسی بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ جوڈی کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پھر اسے رچرڈ کا بھی خیال تھا۔ اس کا یہ احسان واقعی بہت بڑا تھا کہ زمانہ تعلیم کے دوران وہ اس کے اخراجات پورے کرتا رہا تھا اور اب وہ اس احسان کا بدلہ چاہتا تھا۔

”اگر جوڈی کو پتا چل گیا کہ میں اس کی نگرانی کر رہی ہوں تو بہت برا ہو گا۔“ لوسی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ اسے معلوم ہے کہ تم اس کے ساتھ جا رہی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے تمہاری رفاقت پر آمادہ کیا ہے۔ وہ اس شرط پر تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوئی ہے کہ تم اس کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو گی۔“

”ٹھیک ہے۔ کب جانا ہو گا؟“ لوسی نے دریافت کیا۔

”وقت بہت کم ہے اور مجھے کچھ ضروری کام بھی نمٹانے ہیں۔“ رچرڈ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اپنا ضروری سامان لے کر میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں مار تھاکے ہاں چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے تم شام کو آسانی سے اسٹیشن پہنچ سکو گی۔ ٹکٹ وغیرہ تمہیں وہیں پہنچا دیا جائے گا۔“

”مجھے تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“ لوسی کہتی ہوئی اندر چلی گئی اور تقریباً بیس منٹ بعد سوٹ کیس لے کر لوٹ آئی۔

وہ تقریباً دو گھنٹے میں شہر پہنچ گئی۔ رچرڈ اسے مار تھاکے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ مار تھاکے اس کی پرانی جاننے والی تھی جس وجہ سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ لوسی کو اچانک ہی خیال آیا کہ کیوں نہ اسٹیشن جانے سے پہلے جوڈی سے مل لیا جائے۔ وہ ابھی گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ جوڈی

خود پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر لوسی کو دھچکا سا لگا۔ کتنا بدل گئی تھی وہ۔ ہمیشہ قہقہے اڑانے والی لڑکی حزن و ملال کی تصویر بنی نظر آ رہی تھی۔ لباس بھی مسلا ہوا سا تھا جیسے دو دن سے تبدیل نہ کیا گیا ہو۔

”مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ رچرڈ تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔“ جوڈی اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”لیکن اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آ کر اپنا ارادہ بدل دوں گی تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں رچرڈ کے کہنے پر تمہیں اپنے ساتھ لے جا تو رہی ہوں لیکن اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”رچرڈ نے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اور تم ملک سے باہر جا رہی ہو۔ میں تو محض تمہاری دیکھ بھال کے لیے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی ہوں۔ مجھے تمہاری سرگرمیوں سے کوئی غرض نہیں ہو گی۔ لیکن اگر تمہیں میرا ساتھ جانا پسند نہیں تو میں اپنا ارادہ بدل بھی سکتی ہوں۔“ لوسی نے جواب دیا۔

”مجھے تمہارے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ان باتوں کا خیال رکھنا۔“ جوڈی کہتے ہوئے مزید رکے بغیر واپس چلی گئی۔

لوسی اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک سوچتی رہی۔ جوڈی کی حالت دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ واقعی کسی بات سے خوف زدہ ہے اور شاید اسے اپنوں پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ لوسی کو اپنی بہن کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا۔

سہ پہر کے قریب رچرڈ کا ایک ملازم اسے کچھ رقم کے علاوہ نیویارک کا ٹکٹ بھی دے گیا۔ شام چھ بجے لوسی اسٹیشن پہنچ گئی۔ جوڈی نے چار برتھوں والا پورا کمپارٹمنٹ ریزرو کر وار کھا تھا جبکہ لوسی کی سیٹ دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ اس وقت جوڈی ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور سامان کے بارے میں ہدایات دے رہی تھی۔ وہ افسردہ اور تنہا تنہا سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے لوسی کو دیکھ لیا تھا مگر توجہ نہیں دی۔ قلی جیسے ہی جوڈی کا آخری سوٹ کیس اٹھا کر ٹرین میں داخل ہوا، اس نے ایک دم دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے چکر آ رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھکتی چلی گئی اور دھڑام سے نیچے گر گئی۔ لوسی لپک کر اس کے قریب پہنچی اور یہ دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی کہ جوڈی بے ہوش ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے کچھ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ لوسی اسے ہوش میں لانے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہی تھی کہ جوڈی نے

خود ہی آنکھیں کھول دیں۔ لوسی نے اسے سہارا دینا چاہا مگر جوڑی اس کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ اسی لمحے دسل سٹائی دی۔ لوسی بھی لپک کر ٹرین میں سوار ہو گئی۔ ٹرین حرکت میں آ گئی۔ جوڑی دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔ دفعتاً اس کا چہرہ ایک دم پہلا پڑ گیا اور وہ کھڑے کھڑے لہرائے لگی۔ اگر قریب کھڑا ہوا ایک دروازے آدی اسے سہارا دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

”کیا بات ہے جوڑی! اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو سفر ملتوی کر دو۔“ لوسی نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، یونہی چکر آ گیا تھا۔ سر میں معمولی سا درد ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“ جوڑی کہتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے کمبل میں گھس گئی اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ لوسی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ جوڑی نے پلیٹ فارم پر یقیناً کسی ایسے شخص کو دیکھ لیا تھا جس نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا لیکن وہ شخص کون ہو سکتا تھا؟ یہی سوچتے ہوئے لوسی دروازے سے باہر جھانکنے لگی مگر اس دوران میں گاڑی پلیٹ فارم کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

لوسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر تارکی میں جھانکتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی جوڑی کسی سے ڈر کر شہر چھوڑ رہی ہے؟ اگر وہ واقعی کسی سے خوف زدہ ہوئی تو شہر چھوڑنے کا فیصلہ حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہاں رہتے ہوئے رچرڈ اس کی بہتر حفاظت کر سکتا تھا لیکن پھر دفعتاً اسے خیال آ گیا کہ جوڑی، رچرڈ سے بھی تو طلاق لے رہی تھی.... لیکن کیوں؟ حالات نے اس قدر اچانک یہ پلٹا کیوں کھایا تھا؟ وہ کون تھا جس سے وہ خوف زدہ تھی؟

”ہیلو!“

لوسی کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہی دروازے کا قفل تھا جس نے دروازے میں جوڑی کو سہارا دیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”دوسرے کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والی خاتون غالباً آپ کی بہن ہیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس کے لیے خاصی پریشان دکھائی دیتی ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

”ہاں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور میں واقعی اس کے لیے پریشان ہوں۔“ لوسی نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں ایک دوسرے سے

متعارف ہو جانا چاہیے۔“ وہ شخص بولا۔ ”میرا نام اوبرائین ہے۔ فوج میں تھا لیکن ٹانگ میں گولی لگنے کے باعث فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصے بعد ہی پولیس میں ملازمت مل گئی۔ اب کئی سال کی ملازمت کے بعد چھٹیاں منانے کے لیے نیویارک جا رہا ہوں۔ آپ کا کوئی مشغلہ تو ہوگا۔ میرا مطلب ہے بانی وغیرہ؟“

”میں کبھی نہیں؟“ لوسی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ہر انسان وقت گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کرتا ہے۔“ اوبرائین بے تکلفانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”اب میری ہی مثال لے لو۔ میں نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ میرے پاس دنیا کے تقریباً ہر ملک کی مرغی موجود ہے۔ میں ان مرغیوں کی نسل ملانے کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کرنا چاہتا ہوں جس میں کم از کم پانچ چھ مہینے ضرور لگیں گے۔ لیکن مجھے ابھی تک اپنی پسند کا کوئی مکان نہیں مل سکا جہاں اس منصوبے پر عمل شروع کر سکوں۔ لیکن تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ وہ خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے لوسی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا نام لوسی ہے اور میں پراسرار اور سنسنی خیز قسم کی کہانیاں لکھتی ہوں۔“ لوسی نے کہا اور پھر اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔

اوبرائین خاصا دلچسپ آدمی ثابت ہوا۔ وہ فوج اور پولیس کی زندگی کے واقعات سناتا رہا اور لوسی اسے اپنے حالات سے آگاہ کرتی رہی۔ لوسی نے بروک لاج کے بارے میں بتاتے ہوئے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو وہ اپنی مرغیوں پر تجربات کے لیے وہاں آ سکتا ہے جہاں اسے ہر قسم کی سہولت میسر ہوگی۔ رات بھر سفر کے دوران اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

دن چڑھتے ہی لوسی آنکھیں ملتی ہوئی جوڑی کے کمپارٹمنٹ کی طرف چلی گئی۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ لوسی کی آواز پہچاننے کے بعد ہی اس نے دروازہ کھولا۔ جوڑی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے رات بھر میں ایک لمحے کو بھی ہلک نہیں جھپکی تھی۔ لوسی اس کے لیے ڈانٹنگ کار سے ناشائستگیوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ غالباً کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔

تقریباً تین منٹ بعد ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ جوڑی نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر اچانک ہی

اس نے فیصلہ سنا دیا کہ اس نے نیویارک جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور اس اسٹیشن پر اتر کر کسی دوسری ٹرین سے ریٹرو واپس جا رہی ہے۔ لوسی اس کے اس فیصلے پر ششدر رہی رہ گئی۔ اس نے اسٹیشن پر کھڑے ہوئے ایک قلی کی مدد سے جوڑی کا سامان اتر دیا اور دوڑتی ہوئی اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچ گئی۔ اسی وقت انجین کی دسل کی آواز سٹائی دی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دوڑتی ہوئی ٹرین سے اتر گئی۔ ٹرین حرکت میں آ چکی تھی۔ جوڑی ٹرین کی مخالف سمت رخ کیے اس طرح کھڑی تھی جیسے کسی سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ لوسی نے ٹرین کی طرف دیکھا۔ سرخ رنگ کے کوٹ میں لمبوس ایک شخص جوڑی کو دیکھ کر نیچے اترنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا لیکن اسی لمحے ٹرین کا خود کار دروازہ بند ہو گیا اور رفتار تیز ہو گئی۔ وہ شخص شیشے میں سے جھانکتا رہ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد انہیں ریٹرو جانے والی ٹرین مل گئی۔ لوسی کا خیال تھا کہ جوڑی ریٹرو پہنچتے ہی گھر کا رخ کرے گی اور رچرڈ سے اپنے کیے کی معافی مانگے گی لیکن اسٹیشن سے باہر آنے کے بعد جب اس نے ٹیکسی والے کو اپنے قہبے کا پتا بتایا تو لوسی کو ایک بار پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”کیا تم بروک لاج جا رہی ہو؟“ لوسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، وہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں میں اپنے آپ کو کسی حد تک محفوظ سمجھ سکتی ہوں۔“ جوڑی نے جواب دیا۔

”محموظ۔“ لوسی نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”معاملہ کیا ہے جوڑی! آخر تم کچھ بتاتی کیوں نہیں؟ تم کسی سے ڈر رہی ہو کیا؟ کون ہے وہ شخص اور تم سے کیا چاہتا ہے؟“

”نہ میں کسی سے خوف زدہ ہوں اور نہ ہی کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔“ جوڑی نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کچھ جاننے کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔ لیکن.... بروک لاج تو ایک ویرانہ ہے۔ وہاں تمہیں سکون نہیں ملے گا۔“

”اب اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔“ جوڑی نے دونوں لہجے میں جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ بروک لاج پہنچتے ہی جوڑی نے اپنے سامان اور پرکی منزل پر اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں وہ شادی سے پہلے رہا کرتی تھی۔ اس نے کمرے کے

### بہن کو اکب کچھ

ایک بزرگ نقل سماعت کا شکار تھے۔ گرد و پیش میں چیخ و پکار ہو یا ڈھول بج رہے ہوں، انہیں کچھ سناٹی نہیں دیتا تھا۔ وہ برسوں یہ عذاب چھیلتے رہے آخر کار ایک نامور معالج سے رجوع کیا۔ اس نے ان کے ایک کان میں بہت ننھا سا لیکن بیش قیمت آلہ لگا دیا اور وہ سانسوں کی آواز بھی سننے لگے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ معالج نے انہیں ایک ماہ بعد دوبارہ بلایا تاکہ آلے میں کسی قسم کی شکایت ہو تو وہ اسے سیٹ کر سکے۔

ایک ماہ بعد وہ گئے تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیسے... اب کیا حال ہے... آپ کے گھردالے تو بہت خوش ہوں گے کہ اب آپ کی سماعت بحال ہو گئی ہے۔“

”نہیں...“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے آلہ سماعت لگو لیا ہے۔ بہروں کی طرح خاموشی سے بیٹھا سب کی سننا رہتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اب تک پانچ بار اپنی وصیت تبدیل کر چکا ہوں۔“

### یہ مغربا بے

اطالوی میاں بیوی کے چار بیٹے تھے، تین اپنے رنگ روپ اور شکل و شبابت میں قابل دید تھے لیکن چوتھا بیٹا پست قامت اور کم رو تھا۔ اس کے بال بھی کالے تھے۔ اس پر باپ دل ہی دل میں کڑھتار بہتا تھا۔

باپ بیمار ہوا اور بستر مرگ پر پہنچ گیا تو اس نے اپنی بیوی کو بلا کر کہا۔ ”دیکھو بیٹی! صبح کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ چھوٹا والا میرا ہی بیٹا ہے نا... برسوں سے یہ خیال میرے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے کہ مجھ سے بے وفائی کی گئی ہے۔“

”میں دل و جان سے قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وہ ہم دونوں کا ہی بیٹا ہے... تمہیں اندر ہی اندر جلتے کڑھنے کے بجائے پہلے ہی مجھ سے بات کر لینی چاہیے تھی۔“ بیوی نے پورے خلوص اور سچائی سے کہا۔

اور وہ واقعی سچی تھی۔ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ اس کے شوہر نے تینوں بڑے بیٹوں کے بارے میں وہ سوال نہیں کیا تھا۔

نہال خرم کا تعاون بنگلہ دیش سے

دروازے اور کھڑکیوں کو خوب اچھی طرح چیک کیا اور ہدایت کر دی کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے آپ کو محصور کر لیا۔

لوسی کی پریشانی بڑھتی گئی۔ جوڑی کسی طرح بھی زبان کھولنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو الٹا ڈانٹ سنا پڑی۔ بالآخر اس نے جوڑی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا لیکن اس کی اپنی پریشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ گھر میں ریڈل کے علاوہ ہیلاگانامی ایک اوجیز عمر ملازمہ تھی۔ جوڑی کے لیے کھانا کبھی ہیلاگا اس کے کمرے میں پہنچا دیتی اور بھی لوسی خود جاتی۔ جوڑی اچھی طرح تصدیق کے بعد ہی دروازہ کھولتی کرتی تھی۔ اس کی صحت.... روز بہ روز گرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں بند سہمی سہمی رہتی۔ کوئی خوف اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔

حویلی نما اس مکان کے ساتھ ایک بہت بڑا سونمنگ پول اور اس کے دوسری طرف تین چار کمروں پر مشتمل ایک اور چھوٹا سا مکان بھی تھا جو کسی زمانے میں حویلی کے ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس مکان سے آگے لکڑی کی بیٹوں کا جنگلا تھا جس کے دوسری طرف آڈریان ہاؤس واقع تھا۔ لیکن اس کے مکین بھی کئی سال قبل کیلی فورنیا جا چکے تھے اور اس وقت سے وہ مکان بھی خالی پڑا تھا۔ لوسی کو یہاں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ گھر کا تھوڑا بہت کام ہیلاگا کر لیا کرتی تھی۔ لوسی کاغذ اور قلم لے کر تالاب کے دوسری طرف ملازمین والے مکان میں چلی جاتی اور دن بھر وہاں بیٹھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ ایک روز تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے یونہی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ اس کی صفائی کر لی جائے۔ ملازمین والے کالج کے قریب پہنچتے ہی دفعتاً اس کی نظریں آڈریان ہاؤس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک ٹیکسی کو کھڑے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ ٹیکسی حرکت میں آ کر تیزی سے مخالف سمت کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے لوسی اس کا نمبر بھی نہیں دیکھ سکی۔ لیکن بیکاسے خیال آیا کہ اس ٹیکسی کا تعلق رینو سے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں چلنے والی ٹیکسیوں کا رنگ زرد تھا جبکہ یہ ٹیکسی سلیٹی رنگ کی تھی۔ اس رنگ کی ٹیکسیاں اس نے نیویارک میں دیکھی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ کون ہو سکتا تھا اور اسے دیکھ کر چلا کیوں گیا؟

وہ سر جھپٹتے ہوئے کالج کی طرف بڑھ گئی۔ کھولتے ہی اسے ایک بار پھر چونکنا پڑا۔ ہال کمرے کے دروازے پر سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ، کچھ راکھ اور سگریٹ کے چھ نکڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ خود سگریٹ نہیں پھینکتی تھی۔ گزشتہ روز تقریباً تین چار گھنٹے یہاں بیٹھی لکھتی رہی تھی۔ اس وقت یہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے آڈریان ہاؤس کی طرف کھلتے والی کھڑکی کی طرف دیکھا تو اندر سے بند تھی۔ اس کی نظریں پھر ایک بار سگریٹ کے نکڑوں اور بکھری ہوئی راکھ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر خالی پیکٹ اٹھا لیا۔ اس کا دماغ بری طرح چکر رہا تھا۔ اس نے پیکٹ پھینک دیا اور دوڑتی ہوئی کالج سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ دن بڑی مشکل سے گزرا۔ اس نے ہیلاگا یا ریڈل سے اس کا تذکرہ نہیں کیا لیکن ذہن میں بار بار یہی خیال آتا رہا کہ آڈریان ہاؤس میں ٹیکسی پر کون آیا تھا اور وہ کون تھا جو کالج میں بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جوڑی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے کہ وہ بروک لاج میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گی۔ لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جوڑی جس شخص سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی وہ بالآخر یہاں بھی پہنچ گیا تھا اور کالج میں چھپا ہوا غالباً اس کی نگہبانی کر رہا تھا۔

لوسی رات بھر انہی خیالات میں الجھی رہی۔ اسے ڈھنگ سے نیند بھی نہ آسکی۔ اگرچہ سونے سے پہلے اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے خود بند کئے تھے لیکن ہر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اٹھ کر ہر دروازہ اور ہر کھڑکی چیک کر لیتی اور معمولی سی آہٹ پر بھی بری طرح چونک پڑتی۔

صبح ناشتا کرتے ہی وہ شاپنگ کا بہانہ کر کے شہر روانہ ہو گئی۔ ایک ڈرگ اسٹور پر رک کر اس نے رچرڈ کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ لوسی نے اس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا اور فون بند کر کے اسٹور سے باہر نکل آئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ رچرڈ کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔

”وہ کسی سے خوف زدہ ہے۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں اس طرح بند کر رکھی ہیں جیسے اسے اپنے قتل کے جانے کا خطرہ ہو۔ اور پھر کل کے واقعے سے تو میں بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ کوئی شخص اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور جوڑی اتنی خوف زدہ کیوں ہے۔“ رچرڈ نے صوفی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ کوئی شخص اسے بلیک میل کر رہا ہے۔ اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے تو میں اس بلیک میل سے نجات حاصل کرنے کے لیے جوڑی کو منہ مائی رقم دے سکتا ہوں۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ اس نے اس معاملے میں بالکل ہی چپ سادہ رکھی ہے۔ غالباً وہ اس بلیک میلر ہی کے خوف سے مجھ سے طلاق بھی لیتا چاہتی ہے۔ تم ایک بار اور کوشش کر کے دیکھو۔ جوڑی کی خوشی کے لیے میں اپنی ساری دولت لٹانے کو تیار ہوں۔“

”کوشش کرو گی لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ منہ سے کچھ پھولے یا طلاق کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہو۔“ لوسی کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

رچرڈ کے مکان سے نکل کر وہ یونہی بازار میں گھومنے لگی۔ ایک دکان سے نکلے ہوئے اچانک ہی اوبرائن سے آشنا سا منہ ہو گیا۔

”ہیلو لوسی!“ وہ اسے دیکھتے ہی چکا۔ ”تم توڑین سے اس طرح آتے گی نہیں جیسے کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہو۔“

”مجھے جوڑی کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔“ لوسی نے جواب دیا۔ ”وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہے۔ اس نے اچانک ہی رینو واپس آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تم کیسے آئے؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنی مرغیوں پر کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں۔“ اوبرائن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سنا ہے یہاں شہر کے نواح میں کم کرائے پر اچھے کشادہ مکان مل جاتے ہیں۔ آؤ تمہیں اپنی مرغیاں دکھاؤں۔“ وہ

لوسی کو ایک ہوٹل میں لے گیا جس کے کپاؤنڈ میں کھڑے ہوئے ایک ٹرک پر مرغیوں کے لاتعداد پنجرے لدے ہوئے تھے۔ ”یہ مرغیاں میں اپنے ساتھ ہی لے آیا ہوں۔ مکان ملتے ہی اوہاٹو سے باقی مرغیاں بھی پہنچ جائیں گی۔“

”تم نے تو چلتا پھرتا پولیٹری فارم کھول رکھا ہے۔“ لوسی ٹرک میں جھانکتے ہوئے مسکرائی۔ ”اگر ابھی تک مکان کا مسئلہ حل نہ ہوا ہو تو میں اپنی پیشکش دہرانے کو تیار ہوں۔ وہاں تمہاری مرغیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”گڈ!“ اوبرائن چکا۔ ”اگر تم سنجیدہ ہو تو میرا خیال ہے کہ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

اوبرائن نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور لوسی کو اشارہ کرتا ہوا ٹرک میں سوار ہو گیا۔ لوسی بھی اوپر سے گھوم کر پنجرہ زینٹ پر بیٹھ گئی اور اسے راستے کے بارے میں ہدایات

دیتی رہی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں بروک لاج پہنچ گئے۔ ریڈل بھی موجود تھا۔ تعارف کرانے پر اس نے بڑی گرم جوشی سے اوبرائن سے ہاتھ ملایا اور پھر اسے کالج دکھانے لے گیا۔ اوبرائن کو یہ جگہ پسند آگئی۔ اس نے چند ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا اور ریڈل سے مل کر ٹرک سے مرغیوں کے پنجرے اتارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ریڈل کو بتا رہا تھا کہ مرغیوں پر کس قسم کے تجربات کرنا چاہتا ہے۔

دوسرے روز لوسی کی بڑی بہن این کا بیٹا مل بھی پہنچ گیا۔ کالج میں چھٹیاں ہو گئی تھیں اور وہ چند روز یہاں رہنے کے لیے آ گیا تھا۔ عمر میں وہ لوسی سے چند ہی سال چھوٹا تھا۔ خالد اور بھانجے والے رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے۔ اوبرائن سے ملنے کے بعد مل نے اسے دنیا کا پرلے درجے کا احسن قرار دیا۔ اس کے خیال میں وہ شخص پاگل ہی ہو سکتا تھا جو انسانوں کی صحبت چھوڑ کر دن بھر مرغیوں میں گھمرا رہے اور ان سے اس طرح باتیں کرتا رہے جیسے انسانوں سے باتیں کی جاتی ہیں۔

تین چار روز گزر گئے۔ دن میں ایک دو مرتبہ لوسی اور اوبرائن کا آشنا سا منہ ضرور ہوتا۔ اس کے پاس باتوں کے لیے مرغیوں کے علاوہ اور کوئی موضوع نہیں تھا۔ لوسی کو حیرت تھی کہ وہ فوج میں کس طرح چلا گیا تھا اور پھر پولیس میں کیسے آ گیا تھا۔ ظاہر ہے لوسی کی بھی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اسے وقت گزاری کے لیے ایک دلچسپ سا کام مل گیا تھا جس کی موجودگی میں کم از کم بوریت اور تنہائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا۔

جون شروع ہوتے ہی گرمی نے اپنے تئور دکھانے شروع کر دیے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا لیکن رات قیامت بن کر گزرتی۔ جس اور گھنٹے سے ایک لمحے کو بھی چین نہ آتا۔ وہ رات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ لوسی اپنے کمرے میں بستر پر دراز بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب حویلی کے سامنے والی سڑک پر کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ لوسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ براؤن کی ٹیکسی ہوگی جو کسی سواری کو کہیں چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ لوسی نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسی وقت دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ساتھ ہی مل کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”آئی.... آئی دروازہ کھولو۔ باہر آؤ۔ غضب ہو گیا۔“

جاسوسی ڈائجسٹ - 166 - مئی 2014ء

















اندونہاک خبر سنائی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے بچے کے بارے میں روٹی کو بتایا؟“  
 ڈاکٹر نے شاکر سے پوچھا۔  
 ”ہاں، ڈاکٹر۔ یہ بہت مشکل تھا۔ پہلی بار تو بہت دشوار..... انتہائی دشوار۔ میں تو بیٹے کی خوش خبری سنانے جا رہا تھا۔ لیل..... لیکن یہ کیا ہو گیا؟“  
 ”صبر کریں، مسٹر شاکر۔“ ڈاکٹر کلٹوم نے کہا۔ ”کیا آپ کی بیگم کو بچے کی تدفین کے بارے میں پتا ہے؟“  
 ”نہیں ابھی نہیں۔“ شاکر نے کہا۔ ”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ روٹی اس حد تک سنبھل چکی ہے کہ میں یہ اطلاع اسے دوں؟“  
 ”میں نہیں سمجھتی کہ وہ یہ سن کر آپ کے خلاف سوچے گی..... وہ اتنی سمجھ دار ہے کہ سمجھتی ہے..... تدفین کے معاملے میں تاخیر ممکن نہیں تھی۔“  
 ”ڈاکٹر، وہ ایک متوازن سوچ رکھنے والی باہمت خاتون ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، مجھے بتادینا چاہیے۔“

ارادے اور خواہش کے ملاپ سے جنم لینے والی جرم کی بازگشت

سنہری موقع مقدر سے ملتا ہے... اور اس موقع سے ہر صورت استفادہ لازمی قرار پاتا ہے... سوچنے اور غور کرنے سے تاخیر ہو سکتی ہے... اور تاخیر سراسر گھاٹے کا سودا ہے...

دوسرا بچہ  
 جملہ دستی



”ٹھیک ہے، میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔“

”او کے ڈاکٹر، شکریہ۔“

”اگرچہ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے۔“ ڈاکٹر کلٹوم نے کہا۔ ”لیکن یہ زیادہ بہتر ہے کہ ڈاکٹر کے بجائے کوئی ایسا شخص یہ بات بتائے جس کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔“  
 ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آسان ہو یا مشکل کسی کو تو ذمہ داری تدفین کے بارے میں بتانا ہی ہے۔“  
 ”ایگریڈ..... لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، کیس اتنا بگڑ گیا تھا کہ اب کئی پیچیدگیاں جنم لے چکی ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”وہ اب اولاد حاصل نہیں کر سکے گی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ اب دوسرے بچے کے بارے میں ہرگز نہ سوچیں..... ایسی کوئی بھی کوشش آپ کی بیوی کی ہلاکت کو یقینی بنا دے گی۔“ ڈاکٹر نے اکتشاف کیا۔

”میں ذمے داری لیتا ہوں..... میں اسے قائل کر لوں گا۔ پہلے مجھے اس کمرے کی ترتیب بدلنی پڑے گی۔ جو ہم نے متوجع بے بی کے لیے بڑے ارمانوں سے ترتیب دیا تھا۔ ورنہ وہ کمرہ مستقل روٹی کی ذہنی پریشانی کا باعث بنتا رہے گا۔“

”آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں لیکن میری وارننگ کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں، اولاد کو اب ہمیشہ کے لیے بھول جائیں ورنہ آپ بیوی کو کھو دیں گے..... گڈ لک۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

روٹی پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ تکلیف قابل برداشت تھی۔ وہ نئے انداز سے سوچ رہی تھی۔ اپنے اوپر گزرنے والے سانچے سے وہ آگاہ تھی، ابتدا میں اسے موت کا خیال آیا تھا.....  
 وہ شاکر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ یقیناً بہت پریشان رہا ہوگا۔ وہ کب سے یہاں تھا؟ وہ اب کہاں ہے؟ کیا وہ جا ب پر گیا ہوگا؟ کام اس کے لیے کتنا اہم تھا..... شاکر کتنا محنتی تھا..... اسے میری دولت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہمارے گھر والے شروع میں کتنی غلط رائے رکھتے تھے اس کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ شاکر، روٹی کی دولت کے پیچھے ہے..... لیکن آہستہ آہستہ اس نے سب کو غلط ثابت کر دیا تھا۔

”آئی تو یو شاکر۔“ وہ بڑبڑائی۔ روٹی اسے خوب

صورت بچوں کا تحفہ دینا چاہتی تھی..... لیکن..... اسے شاکر کے لیے خود کو ٹھیک کرنا تھا۔ میں اب اسے غیر ضروری محنت نہیں کرنے دوں گی.....

روٹی کو خوشی تھی کہ اسپتال آنے سے پہلے اس نے اپنی وصیت تیار کر لی تھی۔ وہ مطمئن تھی... وصیت شاکر کے حق میں تھی اور شاکر کو اس بارے میں کچھ نہیں پتا تھا۔

آہٹ پر روٹی نے سر گھمایا۔ روٹی کا چہرہ کھلا گیا تھا۔ دروازے میں شاکر کھڑا تھا۔ چھپانے کے باوجود دکھ اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔  
 روٹی تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔  
 ”شاکر.....“

”روٹی.....“ شاکر نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
 کچھ دیر بعد دونوں بولنے کے قابل ہوئے۔

”اوہ شاکر..... کتنا بڑا ہوا۔“ وہ سسک پڑی۔  
 ”ہمت کرو، روٹی..... تم بہت ہمت والی ہو۔“  
 ”شاکر، تم سمیت کتنے لوگوں کو پریشانی سے گزرنا پڑا۔ ہم دونوں سب ٹھیک کر لیں گے..... ایک نیا آغاز کریں گے۔“

”شاباش! مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“  
 ”شاکر..... مجھے صحت یاب ہونے دو۔ ہم دوسرے بچے کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دیں گے..... اولاد کے بغیر زندگی بہت پھیلے اور بے کیف ہوتی ہے۔“

شاکر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں خفیف سا اسرار تھا جسے روٹی محسوس نہیں کر سکی۔

”ہنی، یقیناً ہم دوبارہ ایسا نہیں ہونے دیں گے..... تم بچے کا نام ابھی سے سوچ لو..... اس مرتبہ بچے کا نام تم رکھو گی۔ ہماری اولاد ضرور ہوگی۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا کیونکہ وہ اپنے ان الفاظ پر عمل کرنے اور اپنی پیاری بیوی کی خواہش پوری کرنے کا مقصد ارادہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

روٹی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اولاد کے بارے میں ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔  
 دوسرے بچے کے لیے دوسرے اسپتال اور دوسری ڈاکٹر سے رجوع کر کے وہ آخر تک اس راز کی حفاظت کر سکتا تھا۔  
 شاکر نے آنکھیں موند کر اطمینان سے سوچا۔





خواہش مند تھا۔  
نوجوان کی عمر پانچس، بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔  
اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ ہک مین نے اپنا اسٹول کچھ پر سے  
کھسکا لیا۔ وہ کاؤنٹر کی دوسری جانب قدرے اوپر دیوار کو  
دیکھ رہا تھا جہاں حنوطا شدہ ہرن کا سر نصب تھا، اس کا انداز  
گھورنے والا تھا۔  
”کتنی پرسکون شام ہے۔“ نوجوان نے کہا۔  
ہک مین نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں۔“ اس  
نے ہنکارا بھرا اور لیو کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بارٹینڈر نے  
برف کے ٹکڑے ڈال کر وٹسکی کا جام ہک مین کی طرف  
بڑھایا۔

ہک مین کو سرو کر کے وہ نوجوان کی طرف مڑا۔  
”کیا پسند کرو گے؟“ لیو نے نوجوان کو سوالیہ نظروں  
سے دیکھا۔  
”بیر۔“ نوجوان نے مختصر جواب دیا۔ بیر کا گلاس  
نوجوان کے حوالے کر کے لیو پھر ہک مین کی جانب متوجہ ہو  
گیا۔

”مسٹر ہک مین اسپینڈوج نہیں چلے گا؟“  
”شکر ہے لیو لیکن ابھی نہیں۔ میں آج کل کوشش میں  
ہوں کہ کچھ وزن کم کر لیا جائے۔“  
لیو نے اپنے تو نہ نما پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور مسکرایا۔ ”یہ  
تو مجھے سوچنا چاہیے لیکن میں مطمئن ہوں۔ ہاں جب تک  
لڑکیاں شکایت کرنا نہ شروع کر دیں، کیوں؟“ اس نے ہک  
مین کو آنکھ ماری۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ہک مین نے مسکرانے کی  
کوشش کی اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔  
لیو نے دونوں کی ادائیگی سمیٹی اور ایک کونے کی  
طرف بڑھ گیا۔  
”لاس اینجلس میں پہلی بار آیا ہوں۔“ نوجوان نے  
پھر لب کشائی کی۔

ہک مین نے اس پر اچھی نظر ڈالی لیکن خاموش رہا۔  
نوجوان نے اس کی پروا نہیں کی پھر بولا۔ ”میں اور لیگان  
سے آیا ہوں۔“  
”اچھی جگہ ہے۔“ ہک مین نے بالآخر جواب دیا۔  
”ہری بھری اور خوب صورت۔ تاہم بارش بہت ہوتی  
ہے۔“ اس نے نوجوان کو نظر بھر کر دیکھا۔ نوجوان نے جھک  
کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ تم برا تو نہیں مناؤ

مے؟“ اس نے کہا۔ ”کسی نہ کسی کو تو میں نے ایک بار یہ کہانی  
سنائی ہے اور اگر تم شکاری ہو تو یقیناً تم دلچسپی لو گے؟“  
ہک مین چند ثانیے تک نوجوان کے چہرے کا جائزہ  
لیتا رہا۔ وہ ایک چھریرے بدن کا لڑکا تھا۔ بال خاکی رنگ  
کے تھے، شیو بڑھا ہوا تھا۔ چیک دار جیکٹ اس کے جسم پر  
بھاری معلوم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی  
چمک تھی۔ زخمی نگاہ۔۔۔

”کیسی کہانی؟“ ہک مین نے ایک گہری سانس لی۔  
”بھنگی ہوئی گولی۔۔۔ یہ ایک بھنگی ہوئی گولی کی کہانی  
ہے۔“

”ٹھیک ہے، شروع کرو۔“ ہک مین نے گویا اسے  
اجازت دی۔  
نوجوان نے لیو کو اشارہ کر کے دو جام اور منگوائے۔  
ایک جام اپنے منتخب کردہ سامع کے لیے بھی پھر اس نے  
سپاٹ لےجے میں بولنا شروع کیا۔  
”میرا نام ویزی میاٹر ہے۔ گزشتہ ستمبر میں میری  
شادی پورٹ لینڈ میں ہوئی تھی۔ میری بیوی کا نام جوڈی  
تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اسکول کے زمانے سے  
جاتے تھے۔ وہ نیلی آنکھوں والی ایک حسین دوشیزہ تھی جس  
کے بال سنہری رنگت کے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی گہری  
نیلی جھیل کے مانند تھیں۔

”میں نے اپنی ملازمت سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور  
ہم ہنی مون کے لیے نکل گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم بڈریو  
کار اپنی ہی اسٹیٹ کے گرد چکر لگائیں گے۔ یہ ایک لمبی  
ڈرائیو تھی۔ وہ دوسرا دن تھا۔ ہم ہائی وے پر یوجین کے  
مشرق میں تھے۔ جوڈی نے ہائی وے پر ایک پرانی سڑک  
کو اندر جھٹک کی طرف جاتے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اس  
طرف بلیک بیری بکثرت ملے گی۔ چنانچہ میں ہائی وے سے  
اتر کر اندر گھس گیا۔

”جوں جوں کار آگے بڑھ رہی تھی، سبزہ زار گھٹا ہوتے  
ہوئے جنگل میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل بہت زیادہ گھٹا  
ہونے سے پہلے میں نے کار ایک مناسب جگہ پر روک دی۔  
ہم باہر آ گئے۔ یہاں بلیک بیری کی جھاڑیاں بکثرت موجود  
تھیں۔ جوڈی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کار  
سے پلاسٹک کی باسکٹ نکالی اور مجھ سے آگے بھاگی۔ وہ  
باسکٹ میں پھل جمع کرتی جا رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹی پہاڑی  
تھی۔ وہ قدرے بلندی پر چلی گئی۔ وہاں سے اس نے  
پُرسرت انداز میں ہاتھ ہلایا۔

”جلدی یہاں آؤ ویزی۔۔۔ دیکھو یہ کیا چیز ملی ہے؟“  
اس نے مجھے پکارا۔ وہ میری منتظر تھی۔ میں تیزی سے آگے  
بڑھا۔ میں اس تک پہنچنے ہی والا تھا کہ ایک پٹانے جیسی آواز  
آئی۔ نامعلوم گولی جوڈی کے سر میں سوراخ کرتی گزرتی۔  
میری جان سے زیادہ پیاری بیوی لمحہ بھر میں مر گئی۔ ہماری  
شادی کو محض دو دن ہوئے تھے۔“ نوجوان کے سپاٹ لےجے  
میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

”اوہ، یہ تو بہت خوف ناک ہے۔“ ہک مین کے  
منہ سے نکلا۔ وہ کچھ اور بولنا چاہ رہا تھا لیکن مزید کچھ نہ  
کہہ سکا۔

”میں جیسے نیم پاگل ہو چکا تھا۔“ ویزی نے بات  
آگے بڑھائی۔ ”دفعاً تین مزید دھماکے ہوئے۔۔۔ مجھے  
نہیں پتا کہ گولیاں کہاں سے آئیں اور کہاں نکرائیں۔ میں  
دیوالگی کے عالم میں نامعلوم شیطان کی تلاش میں دوڑا پھر  
پتا نہیں کب اور کس طرح میں واپس جوڈی کی لاش تک  
آیا کیونکہ انہوں نے چھ گھنٹے بعد شاک کی حالت میں مجھے وہاں  
پایا۔ اگر ہائی وے کی تیشی پولیس نے ہماری کار شاہراہ سے  
اترتے نہ دیکھی ہوتی اور وہ تیشی کے لیے نہ نکلتے تو میں  
اور جوڈی آج بھی وہیں پڑے ہوتے شاید مردہ ڈھانچوں  
کی صورت میں۔“

”بہر حال یہ بھی اچھا ہوا۔“ ہک مین نے کہا۔  
”کیا واقعی؟“ نوجوان نے کہا۔ ”نہیں کچھ بھی اچھا  
نہیں ہوا۔ جوڈی کی جگہ مجھے مرجانا چاہیے تھا۔ اگلے پانچ  
مہینے میں نے اسپتال میں گزارے ایک سو سینتالیس دن  
کیونکہ صرف میری ذہنی حالت خراب تھی بلکہ عالم جنون میں  
بھاگ دوڑ کے دوران کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرنے سے میری  
ٹانگ بھی ٹوٹ چکی تھی۔“

”پولیس نے پتا نہیں چلایا کہ کون فارنگ کر رہا تھا؟“  
”کچھ خاص نہیں۔ وہ اتنا ہی جان سکے کہ وہ تیس  
سے ساٹھ کی ہرن مارنے والی رائفل تھی۔ ایک خالی وٹسکی  
کی بوتل وہاں ملی جہاں سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ان کا  
اندازہ تھا کہ فارنگ کرنے والا ایک پرانے اشتہاری  
کھبے پر نشانہ بازی کر رہا تھا۔ اس کی تین گولیاں کھبے پر  
لگیں جبکہ پہلی گولی نے جوڈی کی جان لے لی۔ اسے پتا  
ہی نہیں چلا کہ اس کی کسی آوارہ گولی نے ایک انسانی  
زندگی نگل لی ہے۔“

”یہ واقعی ایک دردناک حادثہ تھا۔“ ہک مین نے  
کہا۔ ”کیا بھاگ دوڑ کے دوران میں تم کچھ جان سکے؟“

## گاوچی گان

”چمین کی دھارک کتھاؤں (مذہبی کہانیوں)  
میں اس کا ذکر نہیں موجود نہیں اور آج کی جدید نسل بھی  
اس عظیم کردار کی ادبی خدمات سے واقفیت نہیں رکھتی،  
کیونکہ اس پر تحقیق نہ ہونے کے برابر ہوئی۔ مشہور  
دا نثور کتھیو شس بھی اس کا کسی نہ کسی وقت میں احسان  
مند ضرور رہا تھا۔ اس کو صرف نام کی مناسبت سے چمین  
سے نسبت دی گئی ہے ورنہ یہ عالمی سر بابیہ بے کلی یا  
علاقائی نہیں۔ گاوچی گان ایک گمشدہ دانشور تھی جس  
کے عظیم مقالات اور افکار آج بھی بہت ساری جگہ رائج  
ہیں جس میں صبر اور استقامت سرفہرست ہیں۔ یہ بات  
الگ ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں۔ اس کی عظمت کے  
لیے یہ دلیل کافی ہے کہ قدیم تہذیب کے کچھ پیر و کار آج  
بھی اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس کے  
متعلق خاموش ہیں مگر جابجا اس کے آثار ضرور ملتے  
ہیں۔ خصوصاً برصغیر پاک و ہند، جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ  
اور عموماً پوری دنیا کے ممالک میں اس کے انتہائی  
عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی کوئی تصنیف منظر عام پر  
نہیں آسکی اور نہ ہی ایسی کوشش کی گئی بلکہ اس کا طرز عمل  
دیکھ کر ہی لوگوں نے اس سے زندگی گزارنے کا فن  
سیکھا۔ اس کے رویے اور معاہدت سے اپنے مسائل کو  
حل کیا۔ فطرت سے اس کی وابستگی بہت دیدنی تھی اس  
لیے اس کا زیادہ وقت باغات اور کھیتوں کے درمیان  
گزرتا تھا۔ اسے علاقائی ادب میں ارادتاً اور غیر ارادتاً  
بھی تضحیک کا نشانہ بننا پڑا مگر اس کے پایہ  
استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ اسے بطور ضرب  
المثل اور مزاح کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اردو ادب  
کی تاریخ میں اس کو کتنا سراہا گیا اس کے متعلق میری  
اپنی تحقیق زیادہ نہیں مگر علامہ محمد اقبال جیسے عظیم شاعر نے  
بھی اس کو موضوع کلام رکھا تھا اور اس پر نظم لکھی تھی جس  
کا عنوان تھا ”گائے اور بکری“ آپ شاید سوچ رہے  
ہیں اس پوری نظم میں اس کا ذکر کہاں ہے تو جناب اس کا  
نام ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ ”گاوچی گان“ گمشدہ  
گائے یعنی ”the lost cow...“

تحقیق و جستجو، سید کھیل حسین کاظمی

یہ وہی لڑا بھری میری اینڈ فریمنٹ پو اسٹا  
سازند سٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے  
منے اور پر اسے ڈانچوں کی خرید و فروخت کی جائے  
دوکان



## منظرِ امام بساطِ عشق

خیالِ خاطرِ احباب چاہے ہر دم  
انیں شخص نہ لگ جائے آگینوں کو

محبوب کے ملنے کا ایک لمحہ... مقدر کی لکیروں میں دھنک بکھیر دیتا  
ہے... محبت کا موسم دل میں ٹھہر جائے تو پھر صدیوں کا گہرا نقش بن  
جاتا ہے... بس ایک لمحہ... محبت کا جذبہ... سرتاپا سرشاری...  
فخر اور طاقت... کبھی امتحان کی گھڑیاں...

### میزانِ محبت پر چاہتوں کا کڑا امتحان... ایک دل ربا کہانی

غزالہ نے چائے بنانی چاہی لیکن میں نے اسے  
روک دیا۔  
”نہیں، آج نہیں۔ آج چائے میں بناؤں گا۔“ میں  
نے کہا۔  
”وہ کیوں؟“ خورشید نے حیرت سے پوچھا۔  
”اس لیے کہ تم دونوں کو پتا چل جائے کہ مجھے بھی  
چائے بنانی آتی ہے۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”میری بیوی تو  
مجھے نکالی جھتی ہے۔“  
”اور کیا؟“ غزالہ نے کہا۔ ”آپ تو اپنے ہاتھوں کو  
زحمت ہی نہیں دیتے۔“  
”لیکن آج دے رہا ہوں نا۔ اس نے سختی خیز انداز میں  
خورشید کی طرف دیکھا۔ ”یار خورشید! آج تمہیں ایمان  
داری سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ دونوں میں سے چائے کون بہتر  
بناتا ہے۔“  
”اوکے۔“ خورشید نے شانے اچکائے۔ ”اگر آج  
تمہیں اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو جاؤ تم ہی بنا کر لے آؤ۔“  
میں مسکراتا ہوا مچن کی طرف چلا گیا۔  
میں جانتا تھا کہ میرے بچے ہی کیا ہونے والا ہے۔

”میری بھاگ دوڑ رانگاں نہیں گئی تھی۔“ نوجوان  
نے جواب دیا۔ ”میں نے اس شیطان کی کارروائی کھی۔  
میں واضح کر دوں کہ میں نے بھی اسے حادثہ تسلیم نہیں  
کیا۔“  
”اور کیا دیکھا تم نے؟“  
”میں نے اس کے چہرے کی جھلک بھی بخوبی دیکھ لی  
تھی بلکہ کار پر کیلیفورنیا کال سنسن نمبر بھی پڑھ لیا تھا۔ اس  
کے چہرے پر مدنوئی کے اثرات مجھے اب بھی یاد ہیں۔ وہ  
خالی بوتل پیسٹک کر کار میں نکل گیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کے  
دوران ہاتھ لہراتا گیا۔ وہ مستی میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ  
اگلے روز اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا ہوگا۔“  
”کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا؟“  
”بالکل نہیں حالانکہ میں کار کے پیچھے بھاگا تھا اور اسی  
وقت ٹھوکر کھا کر گرا۔ میری ٹانگ بھی ٹوٹی پھر مجھے پتا نہیں کہ  
میں واپس جوڑی تک کیسے پہنچا۔“  
”تو پھر تم نے پولیس کو بتایا نہیں؟ وہ بہ آسانی نمبر  
کے ذریعے اس تک پہنچ جاتے۔ تم نے تو اس کی شکل بھی دیکھ  
لی تھی؟“ ہک مین نے حیرت کا اظہار کیا۔  
ویرلی مائز معا کھڑا ہو گیا۔ کاغذی نیپکن سے اس  
نے منہ صاف کیا۔ ”کہانی کا بقیہ حصہ میں ابھی واپس آ کر  
سناتا ہوں۔“ وہ بولا۔  
جب نوجوان لنگڑاتا ہوا دوش روم کی طرف گیا تو لیو  
ہک مین کے قریب آیا۔ ”وہ لڑکا کچھ زیادہ اونچا نہیں  
بول رہا تھا؟“ لیو نے کہا۔ ”تمہیں پریشان تو نہیں کر رہا  
تھا؟“  
”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے سینے کا غبار نکال  
رہا تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ ایک جان لیوا حادثہ پیش آیا  
تھا۔“ ہک مین نے بتایا۔  
”اگر کوئی گڑبڑ کرے تو فوراً مجھے اشارہ کرنا میں نمٹ  
لوں گا۔ میرے کان میں پڑا تھا کہ وہ اور یگان سے آیا  
ہے۔ وہاں کے لوگ ہماری طرح نہیں ہوتے۔“ نوجوان کو  
واپس آتے دیکھ کر لیو ہاں سے ہٹ گیا۔ تاہم ہٹنے وقت  
اس نے لڑکے کو کڑی نظروں سے گھورا تھا۔  
”ہاں تو میں بتا رہا تھا۔“ ویرلی نے سلسلہ کلام وہیں سے  
جوڑا۔ ”پولیس یقیناً اسے پکڑ سکتی تھی اگر میں سب کچھ بتا دیتا۔“  
”کیا مطلب؟“  
”ہاں... میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔“  
”لیکن کیوں؟“ ہک مین نے استفسار کیا۔ ”کیا تم

خورشید اور میری بیوی غزالہ ایک دوسرے سے کیا باتیں کریں گے۔ یہ کہانی ہو سکتا ہے بہت دنوں سے چل رہی ہو لیکن میں نے ایک مہینہ پہلے محسوس کی تھی۔ اس قسم کے جذبات پوشیدہ نہیں رہتے۔

ایک دوسرے پر متنی خیز نگاہیں۔ میرے سامنے بے جا تکلف کا اظہار۔ پھر کسی کام سے میرے ہنٹے ہی دونوں کے درمیان مہم ہی سرگوشیاں۔

لیکن ممکن تھا کہ صرف میرا وہم ہو اس لیے میں موقع کے انتظار میں تھا۔ پھر مجھے اس قسم کے کئی مواقع ملے۔

میں عام طور پر چھ سات بجے گھر آیا کرتا ہوں لیکن اس کہانی کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے وقت سے پہلے آکر ادھر ادھر چھپ جاتا۔

اور ٹھیک چھ بجتے سے پہلے خورشید چوری چھپے مجھے گھر سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا۔ یعنی میرے آنے سے پہلے۔

میں اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتا اور وہ ایک طرف چل دیتا۔ وہ اپنی گاڑی ہمارے گھر سے بہت دور پارک کیا کرتا تھا۔

ایسا کئی بار ہوا اور جب میں نے یقین کر لیا کہ ان دونوں کے درمیان کہانی کچھ اور ہے تو ایک شام خورشید کو چائے پر بلا لیا۔

وہ میرا دوست تھا۔ (پتا نہیں دیتی کس کو کہتے ہیں)

اس کی ایک عادت تھی کہ وہ آتے ہی چائے کی فرمائش کیا کرتا۔ غزالہ فوراً اس کے لیے چائے بنانے چلی جاتی۔

لیکن اس شام چائے غزالہ نے نہیں، میں نے بنائی تھی۔

میں جب چائے کی پیالیاں لیے کمرے میں داخل ہوا تو ایسا لگا جیسے میری آہٹ پا کر دونوں کچھ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے ہوں۔

میں نے ٹرے لاکر میز پر رکھ دی۔ بغیر کسی تاثرات کے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ۔

”واہ! آخر تم نے چائے بنا ہی لی۔“ خورشید نے کہا۔

”کیوں نہیں۔ کسی کام کا ارادہ کیا جائے تو وہ ہو ہی جاتا ہے۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ویسے بھی انسان کو اس قسم کے کاموں کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ نہ جانے کس وقت ضرورت پڑ جائے۔“

خورشید نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے روک دیا۔

”نہیں خورشید... ابھی چائے نہیں پیتا۔“

”وہ کیوں؟“ خورشید نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”چائے کے ٹھونٹ لینے سے پہلے میری ایک بات سن لو۔“ میں نے کہا۔

”کیا بات ہے بھائی؟ بہت سنجیدہ ہو رہے ہو... کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں، بہت خاص بات ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم تو میرے بہت پرانے دوست ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ میں نے زندگی کس انداز کی گزارا ہے۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ لیکن اس وقت کیا یاد آ رہا ہے تمہیں؟“

”اس وقت مجھے اپنی وہ جان لیوا تنہائی یاد آ رہی ہے جو میں نے غزالہ سے پہلے برداشت کی تھی۔“

”اوہو، آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔“ غزالہ جلدی سے بولی۔ ”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں پھر گرم ہو جائے گی لیکن جو میں بتانے جا رہا ہوں، وہ پھر نہیں بتا سکوں گا۔“

”چلو یار، اب بتا بھی دو۔“

”پھر یہ ہوا کہ میری اس جان لیوا تنہائی میں غزالہ میرے لیے خوشی کی خبر بن کر آ گئی۔ جب میں نے پہلی بار اس کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ دیکھو یہی ہے وہ جس کی تلاش تمہاری روح کو تھی۔ جس کے بغیر تم خود کو ادا و محسوس کرتے تھے۔ اس کو اگر تم نے حاصل کر لیا تو تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔“

غزالہ اور خورشید دونوں پہلو بدل کر رہ گئے۔ نہ جانے میری یہ باتیں ان پر کیا اثر کر رہی تھیں۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”پھر یہ ہوا کہ مجھ پر غزالہ کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہو گیا۔ میرے اس جنون کے ایک گواہ تم بھی ہو۔ کہو ایسا ہوا تھا یا نہیں؟“

”ہاں یار، ایسا ہی ہوا تھا۔“ خورشید دھیرے سے بولا۔ اس کی آواز کچھ کھوکھلی ہو رہی تھی۔ ”لیکن پھر پوچھتا ہوں کہ اس وقت یہ باتیں کیوں کر رہے ہو؟“

”اپنے آپ کو دہرانے اور یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سنئے رہو۔ میں چائے دوسری بنا دوں گا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔“

”آپ کیوں یور کر رہے ہیں؟“ غزالہ نے کہا۔

”نہیں غزالہ... یور نہیں کر رہا۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، دس منٹ کے بعد سمجھ میں آ جائے گا۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ہزاروں دشواریوں کے بعد غزالہ کو حاصل کر ہی لیا۔“

”ہاں، میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ خورشید دھیرے سے بولا۔

”اس سے اندازہ لگا لو کہ غزالہ میرے لیے کتنی قیمتی ہو گی۔ میری نگاہوں میں اس کی کیا اہمیت ہو گی۔“

”تو ہے۔ آپ تو تقریر کرنے لگے۔“ غزالہ نے کہا۔

میں نے غزالہ کی طرف دھیان دیے بغیر خورشید کو دیکھا۔ ”اب خورشید، تم یہ سوچو کہ جب کسی سے اس کی کوئی قیمتی چیز چھیننے کی کوشش کی جائے تو اسے کیا محسوس ہوگا۔“

خورشید کے چہرے پر ایک رنگ لہرا کر رہ گیا۔

”آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ غزالہ نے پوچھا۔

”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ تم دونوں کے لیے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں بہت خوش تھا۔ غزالہ! تم کو پا کر مجھے ایسا لگا جیسے زندگی پر میرا بھی کچھ حق ہو ہی گیا ہے۔ پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔“

”کیسے بدل گیا؟“ خورشید نے پوچھا۔

”کیسے بدل گیا؟“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اچھا سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں کھل کر بات کر رہی ہوں۔“

دونوں میری طرف دیکھتے رہے۔

میں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ”خورشید! یہ تبدیلی تمہاری وجہ سے آئی۔“

میں نے کہا۔ ”تم میری پرسکون زندگی کے لیے ایک آسیب کی طرح ہو۔ ٹھہرو، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی احتیاطی اقدام نہیں لگا رہا بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔“

سانا چھا گیا۔ دونوں کے چہرے بری طرح اتر گئے تھے۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ خورشید نے کچھ دیر بعد کہا۔

”میں اور غزالہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔“

”محبت!“ میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ ”تم کیا جانو محبت کیا چیز ہوتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ غزالہ سے ملنے سے پہلے مجھے نہ معلوم ہو لیکن اب میں جان چکا ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔“

”چلو تم بتاؤ۔“ میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں بھی خورشید کی محبت پر بھرپور ہوا ہے؟“

”ہاں، پورا بھر وسا۔“ غزالہ نے دبے لفظوں میں کہا۔

ورد کی ایک شدید لہر میرے سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ بات وہ کہہ رہی تھی جس کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

بساط عشق

میری آنکھوں میں آنسو آنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

”مجھے آنسو ہے کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن بے پناہ محبت نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ دیا ہے۔“ خورشید نے میری طرف دیکھا۔

”اور تم یہ بھول گئے کہ غزالہ تمہارے دوست کی بیوی ہے۔“

”ہر لمحہ خیال رہا لیکن محبت کا جذبہ پھرے ہوئے سیلاب کی طرح ہوتا ہے۔ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔“

”اور تم دونوں اس سیلاب میں بہہ نکلے؟“

”ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔“ اس بار غزالہ نے کہا۔

اگرچہ اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اس کا لہجہ بااعتماد تھا۔ جیسے سوچ سمجھ کر کچھ کہنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔

”بہت خوب۔“ میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟“

”شاید اس لیے کہ میں تم سے کہیں بڑھ کر غزالہ سے محبت کرتا ہوں۔“ خورشید نے کہا۔

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“

”کیسا ثبوت چاہتے ہو؟“

”محبت کرنے والے قربانی دینا جانتے ہیں۔“

میرے دوست نما دشمن۔ تم اس معاملے میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے اور محبت کے راستے میں قربانی دینا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن میں دے سکتا ہوں کیونکہ میں نے واقعی محبت کی ہے۔ تمہاری طرح صرف دعوے نہیں کر رہا۔“

”کیسی قربانی بتاؤ؟“ خورشید جوش میں آ گیا۔

”یہ چائے اٹھا کر پی جاؤ۔“ میں نے پیالیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میرے دوست نما دشمن۔ تم نے کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ آخر کیوں... آج میں تمہارے لیے چائے بنانے کی ضد کیوں کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا بکواس ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ان میں سے ایک پیالی میں زہر ہے۔“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتاتے ہوئے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی۔ ”یہ دیکھو، اس میں زہر ہے۔ بہت ہی خطرناک قسم کا۔ تم تو جانتے ہو کہ کیمسٹری میرا سبیکٹ رہی ہے۔ مختلف قسم کے زہر پر کام بھی کرتا رہا ہوں۔ تو یہ زہر ایسا ہے جو صرف آدھے گھنٹے کے اندر پینے والے کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔“

جب کسی بیڑ کو گھن لگ جائے تو وہ... اندر ہی اندر جزوں کو کھو کھلا کرتا چلا جاتا ہے... تو پھر ایسے بیڑ کو بچایا نہیں جاسکتا... انسان کا بھی یہی حال ہے... نظر آنے والے زخم دیکھتے ہی دیکھتے بھر جاتے ہیں... لیکن جسم کی گہرائیوں میں اتر جانے والی کسک ہو یا انتقام کی چنگاری... وہ کبھی سرد نہیں ہوتی... جرم کی دنیا میں داخل ہو جانے والے بدنیت لوگوں کا عبرت انگیز ماجرا...

مجرد یوں اور صورتوں کے الاؤ میں دکھ جانے والے مصوموں کا ایسا...

## جائے مرگ

وانیسال عارف

نادر کرمانی دیکھنے میں عام سا آدمی لگتا تھا۔ قد پانچ فٹ سات انچ تھا۔ وزن ساٹھ باسٹھ کلو گرام ہو گا۔ کسی قدر اندر دبا ہوا پیٹ اور کسی قدر ابھرا ہوا سینہ، بازو عام تھے لیکن ٹانگیں مضبوط تھیں۔ رنگت سانولی، مناسب نقوش اور سر پر کہیں کہیں سے سفید ہوتے پورے بال تھے۔ اس نے انہیں کرپوٹ کر رکھا تھا۔ چہرہ ساٹھ رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن پر دوسرے زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ خود بھی توجہ حاصل کرنے کا قائل نہیں تھا۔ برسوں کے تجربے نے



”آپ شاید پاگل ہو گئے ہیں۔“ غزالہ جلدی سے بولی۔ ”یہ خطرناک ٹھیل ہے۔“  
”ہاں بہت خطرناک۔ لیکن محبت کی راہ میں ایسے ہی کھیل ہوا کرتے ہیں اور میں تمہارے اس محبوب کو بچنے کا ایک موقع بھی تو دے رہا ہوں۔ یعنی فٹنی فٹنی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہ بیالی اٹھالے جس میں زہر نہ ہو۔ وہ بیالی میرے حصے میں آجائے۔“  
”مجھے ایسا پاگل پن پسند نہیں ہے۔“ خورشید نے کہا۔ ”یہ خودکشی ہے۔“  
”محبت کرنے والے یہ سب نہیں دیکھتے۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ محبت کا دعویٰ تو آسان ہے لیکن اس راہ میں اپنا ثبوت دینا بہت مشکل۔“  
پھر خاموشی۔ خورشید پہلو بدلنے لگا تھا جبکہ غزالہ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔  
”اٹھاؤ تا پیالی۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بھی تو دیکھو کہ پہلا موقع تمہیں دے رہا ہوں اور وہ اس لیے کہ کہیں تم یہ مت سمجھو کہ میں نے جو بیالی تمہارے سامنے رکھی ہے، اسی میں زہر ہے۔ نہیں، اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم دونوں میں سے جو بیالی چاہے، اٹھا سکتے ہو۔“  
”پلیز نہ کریں ایسا۔“ غزالہ نے کہا۔  
”کیوں نہ کروں؟ تمہیں اتنی آسانی سے ہاتھ سے کیوں جانے دوں؟ جب زندگی بھر گھائے ہی کا سودا کیا ہے تو ایک سودا اور کئی۔ میرا خیال ہے کہ تم ہی خورشید سے کہو۔ یہ تمہارے کہنے پر کوئی بیالی اٹھالے گا۔“  
”دیکھو، ایسی حرکتیں صرف فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔“ خورشید نے کہا۔  
”فلمیں اور کہانیاں بھی تو زندگی کی ہوتی ہیں۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”اسی لیے تو میں جان چھڑا رہا ہوں ایسی زندگی سے۔ فرض کرو تم نے بغیر زہر کی پیالی اٹھالی اور تمہارا کچھ نہیں ہوا تو پھر دوسری پیالی تو مجھے بتینی ہے نا اور میرے لیے غزالہ کے بغیر زندگی کا تصور تو ویسے ہی دھنلا گیا ہے۔ اس لیے میرے جینے یا مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری موت کے بعد غزالہ خود بخود تمہاری ہو جائے گی۔“  
”اور میری موت کے بعد؟“  
”ظاہر ہے پھر وہ میری ہی رہے گی۔ چلو، اب وقت ضائع نہ کرو۔ اٹھاؤ پیالی۔“  
”نہیں۔“ خورشید کھڑا ہو گیا۔ ”میں اس حماقت میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

”غزالہ پلیز... سمجھاؤ اس کو۔“  
غزالہ نے خورشید کی طرف دیکھا۔  
”پاگل مت بنو۔“ خورشید نے کہا۔ ”میں پرانے زمانے کا کوئی بے وقوف عاشق نہیں ہوں جو اس قسم کے تجربے کے لیے خواہ مخواہ مر جاؤں۔ مجھے نہیں چاہیے ایسا امتحان اور ایسی قربانی۔“  
”تو پھر یہ بتا کر جانا کہ تم آئندہ سے غزالہ کے راستے میں نہیں آؤ گے۔ اس کی جان چھوڑ دو گے۔“  
”ایسی بے وقوفی سے تو یہی بہتر ہوگا۔“  
”تو پھر جانے سے پہلے ایک بات سنتے جاؤ۔“ میں نے کہا۔  
”کہو۔“  
”یہ دیکھو۔“ میں نے ایک پیالی اٹھالی۔ ”چائے اب بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ایک سانس میں پیالی ختم کر لی۔ اس کے بعد دوسری پیالی بھی ختم کر دی۔“  
”میرے دوست نما دشمن۔ ان دونوں میں سے کسی پیالی میں زہر نہیں تھا۔“ میں نے بتایا۔  
”تو پھر... یہ... یہ ڈراما۔“  
”ڈراما نہیں، محبت کا امتحان۔“ میں نے کہا۔ ”اور افسوس کہ تم اس امتحان میں ٹل ہو گئے۔“  
خورشید کچھ دیر کھڑا خوںخوار رنگا ہوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر پاؤں پٹختا ہوا اپنا ہر چلا گیا۔  
غزالہ اچانک بکھر گئی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔  
”ارے، تم کیوں رو رہی ہو؟“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اچھا ہونا تمہاری آنکھیں کھل گئیں۔“  
”ہاں منیر! میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔ ”مجھے احساس ہو گیا ہے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں ایک فریبی کے ہاتھوں میں آکر تم سے بے وقافی کا گناہ کر رہی تھی۔“  
”خیر۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب ایک بات یہ سن لو کہ اب خود میری آنکھیں بھی کھل گئی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔“  
”نہیں، تم یہ... نہیں کر سکتے۔“  
”یہ تو کرنا ہی ہوگا غزالہ... مجھے افسوس ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل پھر کوئی اور خورشید تمہاری زندگی میں نہیں آجائے گا؟“  
غزالہ روٹی رہی اور میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔  
مجھے ایک بار پھر اپنی تنہائیوں کے ساتھ رہنا تھا۔

اسے سمجھا دیا تھا کہ توجہ آدمی کو مشہور اور غافل کرتی ہے اور وہ اسی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ جیل میں بھی اسے عام قیدی سے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی اور وہ اسی لیے یہاں آیا تھا۔ ریکارڈ میں اس کا نام فضل خان تھا۔ یہاں کوئی اسے نادر کرمانی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ وہ جیل کی جس بیرک میں تھا، اس کے ساتھ دو قاتل تھے جو عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو تھا اور ایک عام نوجوان تھا۔ ان میں وہی سب سے غیر نمایاں تھا۔

نادر کرمانی چوری کے الزام میں آیا تھا۔ ایک بیٹھے میں گھستے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور اس نے چوری کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس نے اسے مزید کیس ڈالنے سے۔ اس کے اعتراف جرم کے بعد اسے عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں بھی اس کے اعتراف نے کارروائی آسان کر دی۔ گرفتاری کے صرف بیس دن بعد اسے سات مہینے کی سزا سننا کر سینٹرل جیل بیج دیا گیا۔ ذہنی طور پر وہ ایک سال کی سزا کے لیے بھی تیار تھا اس لیے جب اسے سات مہینے کی سزا ہوئی تو اسے خوشی ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ اس نے جیل میں چال چلن ٹھیک رکھا تو جلد اسے رہا کر دیا جائے گا۔ چال چلن درست رکھنے کے لیے وہ ہر ایک سے بنا کر رکھتا تھا۔ سب سے جھک کر عاجزی سے ملتا، دیے جانے والے کام دوڑ کر کرتا تھا۔ گالی بولتا جیسے کوئی اس کی تعریف کر رہا ہے۔ اس طرح وہ جیل کی اکثریت میں شامل تھا جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔

دونوں قاتل قیدی اس بیرک کے بادشاہ تھے۔ ڈاکو ایک طرح سے وزیر تھا جبکہ نادر اور نوجوان سلمان کا شمار رعایا میں ہوتا تھا۔ ان تینوں کی خدمت میں وہ دونوں پیش کر کے آؤ گے، اتنا ہی اونچا مقام ملے گا۔ اس بیرک میں بھی یہ قانون رائج تھا۔ سب کے لیے ایک سا کھانا آتا تھا مگر پہلے وہ تین کھاتے اور بچا کچھا ان دونوں کو ملتا تھا۔ مشقت کے سارے کام انہیں کرنا پڑتے تھے۔ وہ انہیں حقہ گرم کر کے دیتے، چائے بناتے، برتن دھوتے، ان کے کپڑے دھوتے اور رات کو سونے سے پہلے ان کی مٹی چانی کر کے سوتے۔ ان کی گالیاں سنتے اور کبھی کبھی مار بھی کھاتے تھے۔ سلمان ویسے ہی مظلوم قسم کا نوجوان تھا جو صورت سے دگی نظر آتا تھا۔ اسے بلوے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کالج کے طلبا کسی بات پر ہنگامہ آرائی کر رہے تھے، پولیس

نے دھاوا بولا اور مونی پر موجود ہر نوجوان کو پکڑ کر لے گئی۔ ان میں سلمان بھی شامل تھا جو طالب علم نہیں تھا اسی لیے ہائی سب چھوٹ گئے اور اسے ہنگامہ آرائی کے الزام میں ایک سال کی سزا ہو گئی۔ وہ نادر کی یہاں آمد سے پہلے موجود تھا۔ قیدیوں کا معمول تھا، وہ صبح سویرے اٹھ جاتے تھے کیونکہ انہیں اپنے بہت سے کام خود کرنا ہوتے تھے۔ اس میں ناشا بنانا بھی شامل تھا۔ نادر بھی ان قیدیوں میں سے تھا جو ناشتے کی تیاری میں حصہ لیتے تھے۔ وہ چائے بناتا تھا۔ چائے بڑی کیتلی میں بھر کر ہر بیرک تک جاتا اور قیدی اپنے اپنے پیالوں میں اس سے چائے وصول کرتے۔ کیتلی خالی ہوتی تو وہ اسے دوبارہ بھر کر لاتا اور اپنے حصے کے ہر بیرک تک چائے پہنچاتا۔ انہیں چائے کے ساتھ خشک نان ملتا تھا۔ عام طور سے وہ جب اپنا کام نمٹا کر واپس بیرک میں آتا تو اس کا نان بھی کھی آدھا اور کھی چوتھائی رہ جاتا۔ وہ اسے ہی کھا کر ناشا مکمل کر لیتا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے انہیں باہر جانے اور اپنی چیزیں صاف کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دوپہر میں کھانا بنانے والوں میں سلمان شامل ہوتا۔ دوپہر کا کھانا عام طور سے پتلے دال چاول یا شوربے والی سبزی اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ گوشت عام طور سے ہنٹے میں ایک بار ملتا تھا اور نادر و سلمان کے حصے میں وہ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ گوشت باقی تین کھاتے تھے اور انہیں شوربے پر گزارہ کرنا پڑتا۔ کپڑے دھونے کی باری مقرر تھی۔ ایک بار نادر سب کے کپڑے دھوتا تھا اور دوسری بار سلمان۔ اگر نادر کرمانی کا کوئی جاننے والا اسے یہاں دیکھ لیتا تو وہ کبھی تسلیم نہ کرتا کہ وہ نادر کرمانی ہی ہے۔ اسے اور اس کی فطرت کو دنیا میں چند لوگ ہی اچھی طرح جانتے تھے اور وہ سب نادر سے ڈرتے تھے۔

☆☆☆

نادر نے اس شخص کو منہ پر مکا مارا تو اسے بہت مزہ آیا۔ وہ اس وقت سولہ سترہ سال کا تھا۔ چنانچہ اس کے اسٹال پر بہت رش تھا اور اس آدمی نے نادر کا پاؤں چل دیا تھا۔ اس نے اختیار سے گھونسا مارا۔ حالانکہ وہ عمر اور تن و توش میں نادر سے کہیں آگے کی چیز تھا مگر مکا کھا کر وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے نادر کو دیکھا جو اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور جوم سے نکل کر وہاں سے چلا گیا۔ تب نادر کو عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا۔ اسے زندگی میں پہلے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ مار پیٹ میں وہ بچپن سے ہی طاق تھا۔ چھٹی جماعت تک وہ اسکول میں رہا اور کوئی دن ایسا نہیں

مزرتا تھا جب اس کی کسی سے مار پیٹ نہ ہو۔ لیکن وہ سب اس کے ساتھ کے لڑکے ہوتے تھے مگر یہ شخص اس سے کہیں بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کے باوجود وہ دم دبا کر چلا گیا۔ نادر شہر کے اس پرانے اور پسماندہ علاقے میں پلا بڑھا تھا جہاں گلیوں میں جرائم کا راج تھا۔ ہر گلی اور ہر محلہ مختلف جرائم پیشہ گروہوں میں بنا ہوا تھا جہاں نوجوان تعلیم کے بجائے جرائم کی دنیا میں اپنا مستقبل تلاش کرتے تھے۔ جہاں پستول کی گولی پینا ڈول کی گولی کی طرح عام دستیاب تھی اور کوئی بھی لے سکتا تھا۔ نادر کا باپ منشیات فروش تھا۔ اس کے دو بھائی یہی کام کرتے تھے اور وہ بچپن سے انہیں جیل اور حوالات آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ پولیس ان کے ہاں جتنی آتی تھی، اتنے تو رشتے دار اور پلنے والے نہیں آتے تھے۔ ایسے ماحول میں پلنے والا نادر سولہ سال تک کسی قدر شریف لڑکا تھا۔ شریف ان معنوں میں کہ اس نے کسی مجرمانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ باپ اور بیٹوں کی محبت سے بچانے کے لیے اس کی ماں نے اسے اپنے مکے بھجوادیا تھا۔ اصل خطرہ یہ تھا کہ اب وہ گرفتاری کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ گھر میں اس کا باپ یا بھائی نہ ملنے تو پولیس اسے لے جاتی۔ شاید اسی لیے پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ نہیں تھا۔

میسے کی کمی نہیں تھی اور عام گھروں کی طرح خرچ کی پابندی بھی نہیں تھی۔ جو جتنا چاہتا اور جس مدت میں چاہتا خرچ کر سکتا تھا۔ کم عمری سے غلط عورتوں کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس کے باپ اور بھائیوں کو پتا تھا لیکن انہوں نے اسے نوکا نہیں۔ وہ تو خود ان چکروں میں رہتے تھے۔ اس نے نشہ نہیں کیا تھا البتہ پینے لگا تھا مگر وہ بھی ایک حد میں رہ کر۔۔۔ وہ عادی نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس تفریح کے موقعوں کی کمی نہیں تھی اور وہ ان سے پورا فائدہ بھی اٹھاتا مگر اس روز اس آدمی کو مار کر اسے جو لطف آیا تو اسے پتا چل گیا کہ اس کے لیے زندگی کا اصل مزہ کس کام میں ہے۔ اسے ایک انوکھی قوت اور برتری کا احساس ہوا۔ وہ چاٹ لے کر جوم سے باہر آیا تو ایک شخص اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چاٹ کے بعد وہ بوتل لینے کے لیے اٹھا تھا کہ اس آدمی نے اسے کولڈ ڈرنک لا دی۔ نادر حیران ہوا تو اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”بہو جوان۔“

”تم کون ہو؟“

”جمال نام ہے میرا۔“

”میں تمہیں نہیں جانتا۔“

”پر میں تمہیں جان گیا ہوں۔“ جمال نے کہا۔ ”تم“

نے جس طرح اس آدمی کو ہاتھ مارا، اس سے لگتا ہے کہ تم آگے جاؤ گے۔“

”آگے کہاں؟“

”دولت کی چوٹی پر جوان۔“ جمال بولا۔ ”بوتل پیو، گیس نکل گئی تو مزہ نہیں آئے گا۔“

بوتل ختم ہونے سے پہلے ان دونوں میں دوستی ہو گئی۔ نادر کو یہ شخص اچھا لگا جس نے اس کی حرکت کی تعریف کی تھی۔ جمال تقریباً چوہیس پچیس سال کا خوش رو اور ذرا ماڈرن نظر آنے والا شخص تھا۔ پھر ان دونوں کی ملاقات ہونے لگی۔ جلد نادر کو پتا چل گیا کہ جمال اس کے باپ اور بھائیوں کی طرح جرائم پیشہ تھا۔ مگر وہ بڑھا لکھا اور چالاک آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت ہوشیاری سے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا۔ اس نے نادر سے کہا۔ ”دس بندے قتل کر دو لیکن پولیس کے ہاتھ نہ آؤ۔ ایک بار پولیس کے ہاتھ آگے تو سمجھ لو گئے۔ اب تم یا تو پولیس کے ٹاؤٹ بن کر رہو گے یا پھر پولیس ہر واردات کے بعد تمہارا پیچھا کرے گی۔ بے شک تم نے اس واردات میں حصہ نہ لیا ہو۔“

نادر بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کے باپ بھائی دس میں سے دو بار ہی اپنی حرکتوں کی وجہ سے تھانے جاتے تھے ورنہ آٹھ بار وہ صرف اس لیے رگڑے میں آتے کہ وہ نامی گرامی ہسٹری شیٹر تھے اور علاقے میں ہونے والی ہر واردات میں ان کا ہاتھ تلاش کیا جاتا تھا۔ نادر کو جمال کی یہ بات بھی اچھی لگی۔ جمال نے اس کی تربیت کی۔ اسے اسلحہ چلانا سکھایا۔ چاقو زنی میں طاق کیا اور جسمانی لڑائی کی تربیت دی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی نادر سے نہیں کہا کہ وہ کسی واردات میں اس کا ساتھ دے۔ لڑائی بھڑائی کے ساتھ جمال نے اس کی دوسری طرح سے تربیت بھی کی۔ اسے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور بولنا سکھایا۔ وہ اسے لے کر اونچی سوسائٹی کی بیٹھکوں میں جاتا۔ یہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلز اور ریستوران ہوتے تھے جہاں سوسائٹی کی کریم آتی تھی۔ جمال اسے دکھاتا کہ وہ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ایک بار اس نے جمال سے پوچھا۔ ”تم مجھے یہ سب کیوں دکھاتے ہو؟“

”ہم دولت کمانے کے لیے جرم کرتے ہیں اور دولت ان لوگوں کے پاس ہے۔ یاد رکھو، اپنے شکار کو جتنے قریب سے جانو گے اسے لونا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔“

نادر نے اس کی یہ بات بھی گہرے میں باندھ لی۔ دو

سال بعد نادر نے پہلی بار اس کے ہمراہ ایک واردات میں حصہ لیا۔ ان کا نشانہ ایک منی چیجر تھا جو ہنڈی سے آنے والی بھاری مالیت کی رقم اپنے پیٹکے میں رکھتا تھا۔ جمال نے اندر کے ایک ملازم کو مل کر یہ واردات کی۔ ملازم نے چوکیدار کو چائے میں بے ہوشی کی دوا دے دی تھی اور وہ آرام سے اندر داخل ہو گئے۔ منی چیجر تجوری کھولنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن جب جمال نے اس کی نوجوان بیٹی کو برہنہ کیا تو وہ مان گیا۔ لڑکی کو دیکھ کر نادر کے منہ میں پانی آ گیا اور اس نے چاہا کہ جانے سے پہلے وہ اس کی عزت برباد کر جائے لیکن جمال نے اسے روک دیا۔ بعد میں اس نے نادر سے کہا۔ ”یاد رکھو، انسان رو پنے کا زخم برداشت کر لیتا ہے لیکن عزت کا زخم بھی نہیں بھولتا اور ہمیشہ اس کا پیچھا کرتا ہے جس نے اسے یہ زخم دیا ہو۔“

یہ بھی جمال کا اصول تھا کہ وہ صرف دولت سے مطلب رکھتا تھا۔ اس واردات میں انہیں دس لاکھ سے اوپر کی رقم ملی تھی۔ کل چار آدمی تھے۔ جمال نے سب کو لاکھ لاکھ روپے دیے اور باقی رقم اس کے پاس گئی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ ایک تو جمال باس تھا، ساری پلاننگ اس نے کی تھی۔ پھر ان تینوں کے لیے لاکھ روپے بھی بہت بڑی رقم تھی۔ آج سے تیس سال پہلے اس کی خاصی قدر ہوتی تھی جب لاکھ روپے میں مکان مل جاتا تھا۔ نادر نے یہ رقم اس طرح خرچ کی کہ ایک مہینے بعد اس کے پاس ہزار روپے بھی نہیں تھے اس نے نکل کر عیاشی کی تھی۔ جمال اس کا دوست اور باس بھی تھا مگر جب اس نے نادر کو اس لڑکی سے زیادتی سے روکنا تو اس کے دل میں جمال کے لیے گرہ پڑ گئی۔ اسے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے تھے جو اس کے کسی کام میں رکاوٹ بنیں مگر اس گرہ کو اس نے دل میں دبا کر رکھا۔ کنگال ہونے کے بعد اس نے جمال سے کہا۔

”کوئی اور کام تلاش کرو، ادھر مال ختم ہے۔“  
 ”کام چھ مہینے بعد۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”میرا اصول ہے چھ مہینے میں ایک کام کرنا ہوں۔“  
 دو اور سماجی مہر داد اور شکور کو بھی جمال نے اسی طرح تلاش کیا تھا اور انہیں تربیت دی تھی، جیسے نادر کو تلاش کیا تھا اور اسے تربیت دی تھی۔ ان کا تعلق بھی نچلے طبقے کے جرائم پیشہ گھرانوں سے تھا۔ وہ پہلے سے جمال کے ساتھ کام کرتے رہے تھے اس لیے انہوں نے اپنا پیسا سنبھال کر خرچ کیا۔ آنے والے پانچ مہینے نادر پر بھاری گزرے۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد باپ اور بھائیوں نے ہاتھ

بچھ لیا تھا اور اب اسے اپنا گزارہ خود کرتا تھا۔ جمال نے اس کی کچھ مدد کی لیکن اس سے اس کا گزارہ ہونے والا نہیں تھا۔ بالآخر چھ مہینے بعد جمال نے اگلی واردات کا منصوبہ بنایا۔ اس بار اس نے ایک جیولر کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک بہت بڑی صرافہ مارکیٹ میں جیولر کی بے شمار دکانیں تھیں۔ وہاں رات کے وقت چھ گارڈز ہوتے تھے اور مارکیٹ کا مرکزی دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اس بار بھی جمال نے اندر کے بھیدی سے کام لیا۔ ایک گارڈ کو ساتھ ملا کر اس نے باقی سب کو قابو کیا اور اطمینان سے گیس کٹری دکھانے سے روک دیا۔ اس نے کام کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جس ملازم سے مدد لی تھی، اسے چھوڑ دیا تھا۔ نادر نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

”وہ ملازم چھپا ہوا تھا اور پھر سیٹھ نے پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کرائی تھی۔ چوکیدار کو چائے ملازمہ نے دی تھی اس لیے اس کا نام نہیں آیا۔ لیکن اس بار پولیس رپورٹ ہوگی اور اس کے پانچ ساتھی اسے دیکھ چکے ہیں۔ پولیس اسے بجاتی تو یہ ہمارے بارے میں بک دیتا۔ یاد رکھو، واردات میں مال کی اتنی فکر مت کرو جتنی اس نشان کی کرو جو پیچھے رہ جاتا ہے اور پولیس اس کی مدد سے تمہیں قابو کر سکتی ہے۔“

اس واردات سے نادر کے حصے میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپے آئے اور اس نے ہاتھ روک کر خرچ کیے، اس کے باوجود چار مہینے بعد وہ کنگال ہو چکا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ جمال ہر چھ مہینے بعد واردات کی مشق دہراتا۔ اس دوران میں وہ بندہ تاڑتا، اس کی ریکی کرتا اور منصوبہ بناتا پھر اس پر عمل کرتا۔ اس لیے رقم کا بڑا حصہ جو ساٹھ سے ستر فیصد بنتا تھا، وہ لے جاتا تھا اور باقی تیس چالیس فیصد ان تینوں کے حصے میں آتا تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد ایک دن نادر نے سوچا تو وہ حیران ہوا۔ وہ جمال کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ جمال ہے اور ان کا باس ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا خاندان ہے یا نہیں؟ اور وہ لوٹ کے مال کا کیا کرتا ہے؟ نادر اور باقی دو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ حد یہ کہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جمال کا اصل نام بھی ہے یا کچھ اور ہے۔

جمال اور ان کی ملاقات ہمیشہ علاقے کے ایک ہوٹل

میں ہوتی تھی۔ ہوٹل کے مالک کے توسط سے انہیں جمال کا پیغام مل جاتا اور وہ اس سے ملنے پہنچ جاتے۔ ویسے وہ ان کے گھروں سے بھی واقف تھا۔ نادر ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ یہ اس نے کرائے پر لیا ہوا تھا اور یہاں وہ صرف رات گزارنے جاتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک کا وقت اور بعض اوقات اس کی رات بھی اس کمرے سے باہر گزرتی تھی۔ یہاں وہ کسی کو لے کر نہیں آتا تھا اور بلڈنگ میں رہنے والے صرف صورت سے اسے پہچانتے تھے۔ اس کے نام سے چند ہی لوگ واقف تھے۔ جمال نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ آپس میں تعلق نہیں رکھیں گے اور سوائے واردات کے دنوں کے وہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ اب تک وہ اس ہدایت پر عمل کرتے آئے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی سے سامنا ہو جاتا تو وہ نظریں چرا کر نکل جاتے۔

دس برس تک نادر اسی طرح جمال کے ساتھ لگا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اور باقی دو جمال کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہیں۔ محسوس تو اس نے پہلے ہی کر لیا تھا مگر اس نے فیصلہ اب کیا کہ وہ مزید اس کے ہاتھوں بے وقوف نہیں بنے گا۔ پہلے مرحلے میں اس نے جمال کے اس فیصلے سے انحراف کیا کہ وہ اس سے ہٹ کر کوئی واردات نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ناتجربہ کار تھے اور اگر پکڑے جاتے تو پورا گروہ پولیس کی نظر میں آ جاتا اس لیے اس کی طرف سے سخت حکم تھا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ شاید اسی لیے جمال نے انہیں الگ الگ رہنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ نہ ملیں اور نہ مل کر کچھ کرنے کا سوچیں۔ اب نادر کو احساس ہو رہا تھا کہ جمال نے کتنی ہوشیاری سے انہیں استعمال کیا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ جمال عمر اور تجربے میں ان سے بڑا تھا۔ پھر اس نے پہلے ان کی تربیت کر کے ان پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت عرصے تک تو وہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکے تھے۔

نادر نے پہلے شکور اور مہر داد کو ساتھ ملانے کا سوچا مگر پھر اسے محسوس ہوا کہ اس میں خطرہ ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی جمال کو پھوٹ دے۔ اس لیے اس نے اکیلے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ واردات کے لیے اسلحہ جمال لاتا تھا اور کام کے بعد اسے واپس لے جاتا۔ نادر نے ایک نائن ایم ایم پستول حاصل کیا۔ اس پر اسے اچھی مشق تھی اور اس کا نشانہ بھی اچھا تھا۔ اس نے ایسی واردات کا سوچا جسے اکیلا

آدمی آسانی سے کر سکے۔ تب اسے سب سے آسان کام بینک اے ٹی ایم میں واردات کا لگا۔ اس نے شہر میں ایسے ایسے ٹی ایم تلاش کیے جو الگ تھلک تھے اور جہاں گارڈز بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اے ٹی ایم بینکوں کے باہر فولادی باکس میں ہوتے تھے۔ نادر کے پاس ون ٹو فائیو بانگ تھی۔

پہلی واردات میں اس کے ہاتھ میں ہزار روپے لگے۔ اس نے جس شخص کو لوٹا تھا، وہ ایک وقت میں اس سے زیادہ رقم نہیں نکال سکتا تھا اس لیے اسے تیس ہزار پر قناعت کرنا پڑی لیکن یہ بھی اچھی خاصی رقم تھی۔ اے ٹی ایم کے ساتھ کمرے ہوتے تھے لیکن وہ سن گلاسز اور پی کیپ کی مدد سے اپنا چہرہ اس طرح چھپاتا کہ اس کی شناخت ناممکن ہو جاتی۔ پہلی کامیابی کے بعد اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ تیسری واردات میں اس نے ایک بڑے میاں کو منتخب کیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کی کار سے نکلے تھے مگر خلاف توقع وہ اڑ گئے اور انہوں نے اے ٹی ایم استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ نادر نے انہیں شوٹ کر دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قتل اسے مضطرب کر دے گا مگر وہ بالکل یسوکون رہا بلکہ اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک انسان کو قتل کر کے خوشی ہوئی تھی۔ اسے اپنی ناکامی کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس ناکامی کی کسر اس نے اگلی بار پوری کر لی جب اس نے اگلے شکار کو بڑے میاں کا حوالہ دیا اور وہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کی لمٹ زیادہ تھی اور اس بار نادر کو اسی ہزار کی رقم ملی۔

آنے والے پانچ سال تک نادر کامیابی سے الگ وارداتیں کرتا رہا۔ اے ٹی ایم کی نہیں تھی بلکہ ہر کچھ عرصے بعد نئے نئے اے ٹی ایم کھل رہے تھے۔ پھر اے ٹی ایم بینکوں کے ساتھ اندر ہو گئے تو نادر جیسے ڈکیتوں کے لیے اور آسانی ہو گئی۔ اب وہ تسلی سے لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر لوٹ مار کرتا تھا۔ جہاں تک بینک کے کمرے کی بات تھی تو اس نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ ان کیمروں کی مدد سے آج تک کوئی ڈکیت نہیں پکڑا گیا ہے۔ کبین کے اندر وہ تسلی سے واردات کرتا تھا اور اگر کسی اے ٹی ایم میں رقم نہیں ہوتی تو وہ اپنے شکار کو دوسرے اے ٹی ایم میں لے جاتا۔ جمال حسب معمول چھ مہینے بعد واردات کرتا اور ہر بار پہلے سے بڑا ہاتھ مارتا۔ لیکن ان کا حصہ اس رفتار سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اگر نادر اپنا کام نہیں کرتا تو اس کے لیے گزارہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ اپنی ہوشیاری کی وجہ سے

وہ پولیس سے بھی بچا ہوا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دوران واردات یا اس کے بعد اس کا پولیس سے سامنا ہوا مگر وہ گھبرائے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا۔

پانچ سال پہلے جمال نے ان کے ساتھ آخری بار واردات کی تھی۔ اس بار انہوں نے بہت بڑا ہاتھ مارا تھا۔ نشانہ پھر ایک سیٹھ تھا۔ اسے بہت بڑی رقم وصول ہوئی تھی اور یہ رقم اس کے دفتر کے سیف میں تھی۔ سیٹھ کا اکاؤنٹ جمال کے ساتھ شریک تھا۔ اس واردات میں انہیں دو کروڑ روپے ملے تھے۔ مگر خلاف توقع جمال نے ان کا حصہ فوری دینے کے بجائے انہیں ایک ساحلی ہٹ میں ملنے کو کہا اور خود رقم لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ اس ساحلی ہٹ پہنچے تو اسے متقل پایا۔ جمال نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ وہ سخت مشتعل تھے مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ سانپ نکل گیا تھا اور پیسے کے لیے لکیر تک چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ نادر نے شکور اور مہر داد سے کہا۔ ”اس نے ہمیں استعمال کیا لیکن وہ ہمیں کام کرنا سکھا گیا ہے۔ اب ہمیں خود اپنے لیے کام کرنا ہوگا اور یہ اچھی بات ہے۔ اب ملنے والا مال ہم تینوں کے حصے میں آئے گا۔ پہلے تو اصل مال وہ لے جاتا تھا اور ہمارے پاس بس چھلکا آتا تھا۔“

شکور اور مہر داد نے اس سے اتفاق کیا اور انہوں نے اپنا لینگ بنا کر وارداتیں شروع کر دیں۔ ساشی ملے تو نادر اب گھروں میں ڈبکتی مارنے لگا۔ وہ موقع ٹاڑتے تھے۔ صبح کے وقت جب مرد دفتروں یا گھر سے باہر ہوتے اسی طرح بچے اسکول کالج گئے ہوتے تھے تو وہ کسی بہانے گھروں میں گھستے تھے۔ عام طور سے وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی کی آڑ میں گھستے تھے۔ چند دن گرانی کے بعد انہیں پتا چل جاتا کہ کام والی کب آتی ہے۔ وہ اس کے پیچھے اندر گھس جاتے اور گن پوائنٹ پر سب کو قابو کر لیتے۔ اگر ہنگامہ ہوتا یا عورتیں شور مچاتیں تو بھاگ نکلتے۔ اگر خاموشی سے قابو میں آجاتیں تو اپنا کام کرتے تھے۔ اگر کوئی چھوٹا بچہ ہوتا تو ان کا کام اور آسان ہو جاتا۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھتے تو گھر والے سب دینے کو تیار ہو جاتے۔ ہر واردات میں انہیں کچھ نہ کچھ مل جاتا۔ کبھی تو بیس پچیس ہزار روپے یا اتنی مالیت کی قیمتی اشیاء جاتی تھیں اور کبھی لاکھوں ہاتھ لگ جاتے۔ زیور تقریباً ہر گھر میں ہوتا تھا۔ اس طرح قیمتی موبائل، گھڑیاں اور نقدی بھی ملتی تھی۔

اب انہیں زیادہ مل رہا تھا۔ اگرچہ وہ جمال کی پلاننگ

کرنے کے اہل نہیں تھے۔ جیسے وہ بڑا شکار طیر تھا لیکن وہ خود کو بچانا سیکھ گئے تھے اس لیے جو ملتا اس میں بھی خوش تھے۔ پھر اپنی مرضی سے واردات کے لیے آزاد تھے۔ جب رقم کی ضرورت ہوتی تو شکار تلاش کر لیتے۔ انہیں چھ مہینے تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جمال نہیں رہتا تھا اس لیے اس کے اصولوں پر عمل بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ پہلے وہ آپس میں ملتے تھے پھر انہوں نے مل کر رہنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بڑا اسلحہ نہیں رکھا کیونکہ یہ نظر میں آتا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں گلو خلاصی بھی مشکل ہو جاتی۔ اس لیے وہ صرف پستول رکھتے تھے اور عام لوگوں کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ نادر کو اب اپنی خباثت دکھانے کا موقع بھی ملتا تھا۔ وہ جہاں واردات کرتے، لوگوں پر تشدد کرتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں چھپی ہوئی قیمتی اشیاء نکلوانے کے لیے یہ کام کرنا پڑتا تھا لیکن اکثر وہ صرف لطف اندوز ہونے کے لیے یہ کام کرتے۔ اگر کسی گھر میں جوان اور خوب صورت عورتیں یا لڑکیاں مل جاتیں تو یہ ان کے لیے بونس ہو جاتا۔ پہلے جمال انہیں روک دیتا تھا لیکن اب انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ دل کھول کر اپنے ارمان پورے کرتے۔

کئی سال تک انہوں نے کامیابی سے وارداتیں کیں اور ایک بار بھی نہیں پکڑے گئے۔ ہاں، ایک بار ایسا ہوا کہ وہ واردات کر کے نکل رہے تھے کہ اتفاق سے پولیس موبائل وہاں آگئی اور نادر نے فائرنگ کر کے دو پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر وہ موبائل کے تازہ ناکارہ کر کے وہاں سے بھاگ نکلے۔ پولیس کوشش کے باوجود انہیں تلاش نہیں کر سکی تھی۔ اس ایک موقع کے سوا پولیس یا کوئی اور کبھی انہیں پکڑنے کے قریب نہیں آسکا تھا۔ واردات کے بعد وہ کچھ عرصے باہر نکلنے سے گریز کرتے تھے اور اپنے اس گھر میں ہی آرام کرتے اور کھاتے پیتے تھے جو انہوں نے خفیہ ٹھکانے کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ جب وہ محسوس کرتے کہ ان کی واردات کی پورٹ نہیں کی گئی ہے یا پھر پولیس کو ان کی تلاش سے کوئی غرض نہیں ہے تو وہ واپس اپنے اصل ٹھکانے پر آ جاتے۔

موقع تازے کا کام نادر کرتا تھا۔ اس روز وہ گشت پر تھا۔ بانگ پر ہیلمٹ تلے چھپ کر وہ پوش علاقوں کی گلیوں کا چکر لگاتا۔ پھر کسی گھر کو تازہ کر گئی دن اس کی گرانی کرتا اور جب جگہ واردات کے لیے موزوں لگتی تو وہ اندر گھسنے کی پلاننگ کرتا۔ مگر اس روز اسے کچھ اور نظر آ گیا۔ ایک شخص

نئے ماڈل کی گٹھری کار میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ جس گھر کے سامنے تھا، اس کے دروازے پر ایک خوب صورت عورت خود میں ایک سال کے بچے کو لیے اس شخص کو ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ مکان دو سو چالیس گز پر تھا اور بہت اسٹائلش بنا ہوا تھا۔ اس علاقے میں اتنے بڑے پلاٹ کی مالیت دو کروڑ روپے سے زیادہ تھی۔ نادر اس شخص کو دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بانگ لہرائی اور اس نے مگر نادر کی طرف دیکھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ ہیلمٹ میں تھا ورنہ جمال سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ پشت دیکھ کر بھی اسے پہچان سکتا تھا۔

وہ جمال ہی تھا۔ اگرچہ اس کے بال لائٹ براؤن تھے اور اس نے فریج کٹ رکھی ہوئی تھی۔ سن گلاسٹر کے ساتھ اس کی شخصیت بدلی ہوئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ نادر اسے پہچان نہ پاتا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر وہ رکا اور بانگ کے بیک ویو مرر میں جمال کو دیکھنے لگا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد نادر بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ رہائشی علاقے کی حد تک اس نے فاصلہ رکھا تھا لیکن جب وہ بڑی سڑک پر آیا تو جمال کی کار کے پاس آ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ جمال کہاں جا رہا ہے۔ یہ وقت اور اس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی دفتر جا رہا ہو۔ اس کا رخ کلفٹن کی طرف تھا۔ کار ایک ایسی عمارت میں داخل ہوئی جس میں دفاتر تھے اور اس کے نچلے دو فلور پارکنگ کے لیے مخصوص تھے۔ گیٹ پر گاڑ موجود تھے۔ جب جمال کی کار اندر چلی گئی تو کچھ دیر بعد نادر گیٹ پر پہنچا اور گاڑ سے کہا۔

”میں انٹرویو کے لیے آیا ہوں۔ مجھے رائن انٹرنیشنل کے آفس جانا ہے۔“

اس کمپنی کا بورڈ باہر لگا ہوا تھا۔ گاڑ نے اسے اندر جانے کی اجازت دے دی مگر بانگ اسے عمارت کے باہر پارک کرنے کو کہا۔ جب وہ اندر پہنچا تو اس نے جمال ٹولفٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے لفٹ میں جاتے ہی نادر آگے آیا۔ اس نے لفٹ کے نمبر دیکھے اور جیسے ہی لفٹ چار نمبر پر رکی، اس نے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ واپس آئی تو اس نے چار نمبر کا بٹن دبا دیا۔ مگر اس فلور پر کئی دفاتر تھے اور اندر جائے بغیر یہ جاننا ناممکن تھا کہ جمال کس دفتر میں گیا ہے اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ جمال کے سامنے جائے۔ وہ اسے پہچان جاتا

تو ہوشیار ہو جاتا۔ نادر کو جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ آرام سے بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ اگلے دن وہ پھر اسی عمارت میں تھا اور اس بار وہ جمال سے پہلے اوپر موجود تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ جمال احسن اینڈ کمپنی کے دفتر میں گیا ہے۔ نادر صبر و سکون سے پیچھے لگا رہا اور دو ہفتے میں وہ جمال کے بارے میں تقریباً سب جان چکا تھا۔

جمال کا نام یہاں احسن سٹراک تھا۔ وہ اس کمپنی کا مالک تھا جو بیرون ملک سے مختلف برانڈز کا دو نمبر منگوا کر ملک بھر میں سپلائی کرتی تھی۔ گویا یہاں بھی وہ غلط کام ہی کر رہا تھا۔ اس کے دفتر میں چار افراد کام کرتے تھے۔ ان میں بڑی حسین سسی سیکریٹری بھی شامل تھی۔ صائمہ صرف سیکریٹری نہیں تھی۔ احسن یا جمال نے اسے دفتر کے پاس ہی ایک چھوٹا فلیٹ لے کر دیا ہوا تھا اور یقیناً اسے خواہ سے زیادہ ہی ادا کرتا ہوگا کیونکہ وہ ہفتے میں دوراتیں صائمہ کے فلیٹ میں گزارتا تھا۔ اپنی نوجوان اور حسین بیوی ہوتے ہوئے بھی۔ نورین وفا شعار اور خدمت گزار بیوی کی طرح اس کا گھر سنبھالتی تھی اور اس کے دو بچے پالتی تھی۔ بڑی بیٹی کی عمر چار سال تھی اور وہ اسکول جاتی تھی جبکہ بیٹا بھی سوا سال کا تھا۔ احسن کے ٹھاٹ باٹ اور لائف اسٹائل بتاتا تھا کہ اس کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی قیمتی کار تھی اور گھر تو تھا ہی بہت شاندار۔

نادر کو یقین تھا کہ احسن نے یہ سب ڈبکتی کی رقوم سے حاصل کیا ہے۔ وہ بڑا حصہ لیتا تھا اور یقیناً اسے بچا کر رکھتا ہو گا۔ انہیں وہ اتنا دیتا تھا کہ وہ بس گزارہ کر سکیں اور مسلسل اس کے محتاج رہیں۔ اس نے ذہن میں ایک ہدف بنایا ہوگا اور جب یہ ہدف حاصل کر لیا تو انہیں ہری جھنڈی دکھا کر غائب ہو گیا۔ جمع کی ہوئی رقم سے اس نے اپنی زندگی بنائی تھی۔ وہ جس ذہن کا آدمی تھا، وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن نادر اور اس کے ساتھی یوں زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ ان کا طرز زندگی ہی الگ تھا۔ جمال نے ان کے ساتھ آخر میں غلط کیا تھا اور نادر کے دل میں اسی کا خیال آیا۔ ساری معلومات کر کے جب اس نے شکور اور مہر داد کو بتایا تو وہ اچھل پڑے۔ شکور نے جوش سے کہا۔

”اس کمپنی کو چھوڑنا نہیں ہے۔“

”زیادہ جوش میں مت آؤ۔“ نادر نے کہا۔ ”مت

بھولو کہ وہ ہمارا استاد ہے۔“

”استاد کی ایسی کم تھی۔“ مہر داد بولا۔ ”وہ ہمارا حصہ

مار گیا تھا۔ ہر ایک کے حصے میں کم سے کم بیس پچیس لاکھ



آزاد کرالیتے۔

احسن ٹھیک پانچ بجے دفتر سے نکلا اور کار لے کر روانہ ہو گیا۔ نادر اور مہر داد الگ الگ بائیس پر اس کے پیچھے تھے۔ وہ راستے میں ایک مارکیٹ میں رکا اور اس نے کچھ خریداری کی۔ اس میں بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور کھانے پینے کی اشیاء شامل تھیں۔ عیاشی کی زندگی اور آرام و سکون نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس کا رنگ مزید صاف ہو گیا تھا اور صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی عمر کم سے کم بیالیس برس تھی مگر وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹا لگتا تھا۔ دفتر سے نکلنے کے ایک گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں تھا۔ احسن نے ہارن دیا تو ایک نو عمر ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے گیا۔ مکان پوری طرح کوڑھا تھا۔ یہ ایک منزلہ تھا مگر زینہ اور ایک بند کمرے تک جاتا تھا اور اس کا دروازہ بند کر لینے سے کوئی اور پر سے بھی اندر نہیں کھس سکتا تھا۔ ویسے مکان کی ساخت ایسی تھی کہ اوپر جانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ پلان بنایا تھا۔ شکور نے انہیں ایس ایم ایس کے ذریعے مطلع کیا کہ وہ ٹھیک ہے اور اب تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

نادر اور مہر داد اسی علاقے میں رہے۔ وہ وقفے وقفے سے شکور سے ایس ایم ایس پر رابطہ کر رہے تھے۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ مکان کے اندر ابھی سرگرمیاں جاری ہیں۔ رات گزارہ بچے تک مکان کے پورچ میں کھلتے والے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ مکین اب آرام یا سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ بارہ بجے شکور حرکت میں آیا۔ اس نے ڈکی کھولی اور باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے اس نے گیٹ کھولا۔ چھوٹا گیٹ اندر سے بس کنڈی لگا کر بند کیا گیا تھا۔ نادر اور مہر داد باہر موجود تھے، وہ فوراً اندر آگئے۔ پورچ میں راہداری کا دروازہ تھا، جولاءِ بج تک جاتی تھی اور نشست گاہ کا دروازہ تھا جو پورچ میں کھلتا تھا۔ بیڑھیوں کے نیچے چھوٹا واش روم تھا۔ اس کا دروازہ بیک وقت پورچ اور ساتھ میں چھوٹے بیڈروم میں لگتا تھا۔ راہداری اور نشست گاہ کے دروازے اندر سے بند تھے لیکن اتفاق سے واش روم کا دروازہ کھلا لیا گیا اور وہ اس کی مدد سے اندر آئے۔ درمیان میں بڑا سالاؤج اور اس کے ساتھ اوپن بکن تھا۔ نشست گاہ اور چھوٹا بیڈروم تاریک تھا، البتہ لاؤج میں ایک لائٹ جل رہی تھی۔ آخر میں دو بیڈروم برابر برابر تھے۔ احسن کے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اندر سے آتی دبی آدازیں بتا رہی تھیں کہ دونوں میاں بیوی بیدار اور

مصروف ہیں۔

لے لیا تھا بلکہ بہت بڑی دولت بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ اتنی دولت تھی کہ ان کی زندگی سنور سکتی تھی مگر وہ حرام، زندگی سنوارنے کے لیے نہیں بلکہ عیاشی کے لیے کماتے تھے۔ انہوں نے رقم اور زیورات آپس میں تقسیم کر لیے۔ اس وقت نادر نے فیصلہ کیا کہ وہ اب ان سے کچھ عرصے الگ رہے گا۔ اسے ڈر تھا کہ اب پولیس زیادہ شدومد سے انہیں تلاش کرے گی کیونکہ کیس میڈیا پر آ گیا تھا اور پولیس پر بہت دباؤ تھا۔ اسے اصل خطرہ شکور اور مہر داد سے تھا۔ وہ اتنے محتاط نہیں تھے۔ وہ پکڑے جاتے تو اس کا نام بھی یک دیتے۔

نادر کی چھٹی حس نے اسے درست خبردار کیا تھا مگر خطرہ پولیس کی طرف سے نہیں تھا۔ احسن بچ گیا تھا۔ خون بہہ جانے کے بعد بھی اور اسپتال میں دو مہینے تک داخل رہنے کے بعد وہ زندگی کی بازی جیت گیا۔ شاید انتقام کی آرزو نے اسے زندہ رکھا تھا اور اس نے اسپتال سے نکلنے ہی ان تینوں کی تلاش شروع کر دی۔ شکور اور مہر داد سامنے تھے۔ انہوں نے جینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ لگ گئے اور یکے بعد دیگرے ان کی لاشیں مختلف جگہوں پر ملیں۔ نادر نے اخبارات میں ان کی جو تصاویر دیکھی تھیں، اس کے روٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ روپوش تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ احسن پولیس کی بہ نسبت اسے زیادہ بہتر تلاش کر سکتا ہے کیونکہ وہ اسے جانتا ہے۔ اس نے شکور اور مہر داد سے بھی خود انتقام لیا تھا۔ وہ کرائے کی ایک چھوٹی سی کھولی میں چھپا ہوا تھا اور اس نے اپنے جیسے میں آنے والی دولت اسی کھولی کی جچی زمین میں دفن کر رکھی تھی۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس شہر بلکہ اس ملک میں بھی وہ محفوظ نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے نکل جائے گا۔ اس نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے جعلی نام سے شناختی کارڈ بھی بنوا لیا تھا۔ پاسپورٹ اس کے ہاتھ آتا تو وہ یہاں سے نکل جاتا۔ مگر اتنی دنوں پاسپورٹ کے معاملے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اس لیے ارجنٹ درخواست کے باوجود اس کا پاسپورٹ نہیں آرہا تھا۔ پھر ایک صبح وہ باہر نکلا تو اسے لگا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ جلد اس نے دیکھ لیا کہ وہ احسن تھا جو ہمیں بدل کر اس کے پیچھے تھا۔ وہ ہراساں ہو کر بھاگا اور پھر ایک جگہ جان چھڑا کر ایک بیٹکے میں داخل ہوا تھا کہ اندر موجود ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر چور ہونے کا الزام لگایا۔ اتفاق سے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، وہ خاموشی سے چٹا

دوسرا کمر بچوں کا تھا۔ بچی بستر پر تھی اور بچہ پالنے میں تھا۔ نو عمر ملازمہ فرش پر بچھے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ نادر نے بچی کو اٹھایا اور احسن کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔ وہ سب کچھ اور ہوشیار تھے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھے کہ بچی ہے اور احسن کی بیوی نے دروازہ کھول دیا۔ نادر نے بچی کے سر پر ہستول رکھا ہوا تھا اس لیے عورت کی چیخ حلق میں گھٹ گئی۔ پھر وہ تینوں اندر گئے۔ احسن پھر کر اٹھا لیکن پھر بیٹی کو گن پوائنٹ پر دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ مہر داد اور شکور نے آرام سے اسے قابو کر کے سامنے کھڑکی کی گرل کے ساتھ رسی سے باندھ دیا۔ اس کا منہ ٹیپ سے بند کر دیا گیا۔ اس کی بیوی نائچی میں تھی اور خود کو ان لوگوں سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے احسن کی بیوی کو بھی باندھ دیا اور اس کا منہ بھی ٹیپ سے بند کر دیا۔ آنے والے کچھ گھنٹے احسن اور اس کی بیوی پر بہت بھاری گزرے۔ پہلے ان تینوں نے مکمل تلاشی لے کر رقم اور زیورات برآمد کیا۔ پھر انہوں نے ایک طرف دیوار میں لگی چھوٹی سی تجوری تلاش کر لی۔ یہ نمبر سے کھلتی تھی۔ احسن نے بڑی مشکل سے اس کا نمبر بتایا۔

یہاں احسن کے سامنے مکافات عمل آیا تھا۔ کبھی اس نے کسی کو مجبور کرنے کے لیے اس کی عزت کو بے لباس کیا تھا۔ آج اس کے سابق ساتھیوں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے اس کی عزت کو بے لباس کر دیا تھا۔ تجوری میں ڈالرز اور یورو کی صورت میں بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے علاوہ کچھ جواؤ زیورات تھے جو یقیناً بہت قیمتی تھے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے احسن پر تشدد کیا کہ اگر اس نے کچھ اور چھپایا ہو تو وہ بھی بتا دے مگر اس کے پاس اب کچھ نہیں تھا۔ وہ اسے چاقوؤں سے گودتے رہے۔ اس کا ایک کان اور نچلا ہونٹ بھی کاٹ دیا تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب اس کے پاس دینے کے لیے اور کچھ نہیں ہے تو وہ شیطان بن گئے اور احسن کے سامنے اس کی بیوی پر ٹوٹ پڑے۔ مگر انہیں زیادہ موقع نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ عورت سانس نہیں لے رہی تھی۔ احساسِ ذلت نے اس کا دل بند کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے مر گئی تھی۔ نادر بد مزہ ہوا۔ احسن بے ہوش ہو گیا تھا۔

وہ صبح کے قریب اس کے گھر سے نکلے۔ اس وقت احسن بھی قریب المرگ تھا۔ اس کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ وہ تینوں خوش تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنا انتقام

کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس نے خود بھی نہیں بتایا۔  
 ”تمہارا دنیا میں کوئی تو ہوگا؟“  
 ”جب یہاں آیا تو ماں اور بہن تھی۔“  
 نادر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تھی۔۔۔ اور اب؟“  
 سلمان نے گہری سانس لی۔ ”اب نہیں ہیں۔“  
 ”اوہ۔“ نادر نے افسوس کیا۔ ”پہلے یار جو اللہ کی مرضی۔“  
 ”ہاں، اس کی مرضی ہے۔۔۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔“ سلمان بولا پھر اس نے نادر کی طرف دیکھا۔  
 ”آپ نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا۔“  
 نادر نے پُر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تمہارا کیا خیال ہے؟“  
 سلمان نے چپکچاپ کہا۔ ”سچ بتاؤں؟“  
 ”ہاں، سچ سچ بتاؤ کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟“  
 ”مجھے لگتا ہے آپ وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہو۔“ سلمان نے کہا۔ ”آپ اصل میں کچھ اور ہو۔“  
 نادر حیران ہوا۔ سلمان نے اس کے بارے میں بالکل ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ فکر مند ہو گیا جب سلمان جیسا سیدھا آدمی سمجھ سکتا تھا تو دوسرے تو بہت ہوشیار اور چمٹے ہوئے لوگ تھے۔ اس نے سلمان سے پوچھا۔ ”تم نے کسی اور سے یہ بات تو نہیں کی ہے؟“  
 ”نہیں، میں نے کبھی کسی سے آپ کے بارے میں بات نہیں کی۔“ سلمان نے سادگی سے کہا۔ ”میں تو سوائے آپ کے اور کسی سے بات نہیں کرتا۔“  
 ”تم نے کبھی ان لوگوں کی باتیں سنی ہیں جو وہ میرے بارے میں کر رہے ہوں۔“ نادر نے باقی تین کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا۔  
 ”کئی بار۔۔۔“  
 ”کیا کہتے ہیں؟“  
 ”وہ سمجھتے ہیں آپ بہت ڈرپوک آدمی ہو۔۔۔ جب آپ ان کی ہر بات مانتے ہو تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔“  
 نادر نے سکون کا سانس لیا۔ ”پر تم ایسا نہیں سمجھتے؟“  
 ”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ اندر سے بالکل مختلف ہو۔“  
 ”میں ایسا ہی ہوں۔“ نادر نے پہلی بار اقرار کیا۔  
 ”تبھی آپ اپنے بارے میں نہیں بتاتے؟“

رہا پھر بیٹھے کے مالک نے پولیس بلا لی اور اس نے چور ہونے کا اعتراف کر لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ جیل میں احسن سے محفوظ رہے گا اس لیے اس نے اپنا نام غلط بتایا۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اس کا حلیہ بھی غریبانہ سا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزا ہو گئی۔ اب وہ جیل میں احسن سے محفوظ تھا۔ اسے امید تھی کہ احسن اس کے غائب ہونے کے بعد ٹھنڈا بیٹھ جائے گا۔ رہائی کے بعد وہ کوٹھری سے اپنی رقم لے گا۔ اس کا پاسپورٹ بھی بن کر آ گیا ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا۔  
 ☆☆☆  
 سلمان مسکین اور کسی قدر غمگین سا نوجوان تھا۔ وہ خاموشی سے سب کی خدمت کرتا اور جب فارغ ہوتا تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ خود سے کسی سے بات نہیں کرتا تھا، ہاں کوئی بات کرتا تو اس کا جواب دیتا۔ نادر اس سے انسیت محسوس کرنے لگا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی اس کا دل کرتا کہ اسے اپنی اصلیت بتا دے۔ اسے بتائے کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا یہاں بن کر رہتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصلیت پر آجائے تو یہ قاتل اور ڈاکو اس کے پیر چائیں۔ ابھی جو اسے گالیاں دیتے ہیں، ان کی زبان سے آواز نہیں نکلے گی۔ پھر اسے اپنی سوچ پر ہنسی آتی۔ ٹھیک ہے اس کے ساٹھی جانتے تھے کہ وہ کس قدر سفاک آدمی ہے۔ وہ اس سے ڈرتے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ دوسرے بھی اس سے ڈرتے۔ وہ خود کو سمجھاتا کہ وہ یہاں چھپنے آیا ہے، اپنے بارے میں اعلان کرنے نہیں آیا ہے۔ اس کی رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ سلمان اس سے چند دن پہلے رہا ہوا جاتا۔ ایک دن وہ بیرک کی صفائی کر رہے تھے۔ باقی تین یہاں نہیں تھے۔ وہ باہر کھلی دھوپ کے حڑے لوٹ رہے تھے اور صفائی کا کام ان کے سپرد کر گئے تھے۔ بیرک کی ہر ہفتے صفائی ہوتی تھی۔ سلمان دیواروں سے جالے صاف کر رہا تھا۔ کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے مٹی بہت آتی تھی۔ جالے بننے اور پھر پھیلنے جاتے تھے۔ نادر جھاڑو لگا رہا تھا۔ کچرا سمیٹ کر وہ دونوں تھک کر بیٹھ گئے۔ وہ صبح سے مصروف تھے۔ نادر نے کہا۔ ”بس کچھ دن رہ گئے ہیں رہائی میں۔“  
 ”آپ بھی چلے جاؤ گے۔“ سلمان نے کہا۔  
 ”تم کہاں جاؤ گے؟“  
 ”پتا نہیں۔“ سلمان نے دیکھی انداز میں کہا۔  
 نادر کو پہلی بار خیال آیا کہ اس نے کبھی سلمان سے اس

جانے سرگ

دو سال کے کسی کسی گونے میں لادو ملک گھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے لیے ہونے والے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر III سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی من کو رنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

اسے چائے پینے میں مزہ آرہا تھا۔ سلمان اس کے پاس بیٹھا تھا۔ نادر نے اس سے کہا۔ ”تم پرسوں چلے جاؤ گے؟“

”ہاں۔“

”میں تمہارے بعد رہا ہوں گا۔ پر میں یہاں نہیں رہوں گا، اس ملک سے چلا جاؤں گا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ جس دشمن سے بچنے کے لیے جیل آیا تھا، وہ میری تاک میں ہوگا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے باہر جانا ہوگا۔ یہاں رہا تو وہ بھی نہ بھی مجھے تلاش کر کے مار دے گا۔“

سلمان نے حیرت سے کہا۔ ”وہ اتنا خطرناک ہے؟“

”ہاں کیونکہ وہ میرا استاد ہے۔ اسی نے مجھے سب سکھایا تھا۔“ نادر نے کہا اور پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔

وہ سلمان کو اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگا۔ کیسے وہ جرائم کی دنیا میں آیا۔ پھر چالاک جمال یا احسن اسے اور اس کے ساتھیوں کو استعمال کرتا رہا۔ آخر میں وہ انہیں چھوڑ کر غائب ہو گیا اور وہ خود وار داتیں کرنے لگے۔ سلمان حیرت اور خوف سے سن رہا تھا۔ اگرچہ اس نے پہلے ہی نادر سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو ہے، اسے چھپاتا ہے لیکن اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس قدر سفاک اور خطرناک شخص ہوگا۔ پھر نادر کہانی کے اس حصے تک پہنچا جب اس نے جمال کو دیکھ لیا۔

اس کا اصل نام احسن تھا۔

”آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا؟“

نادر نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟“

”بہت برا۔۔۔۔۔ اسے مارا ہوگا۔“

”نہیں، اس سے بھی بُرا کیا۔“

”اس سے بُرا کیا ہو سکتا ہے؟“ سلمان نے سادگی سے کہا۔

نادر نہ جانے کس کیفیت میں تھا، اس نے سلمان کو سب بتا دیا کہ انہوں نے احسن، اس کی بیوی اور اس کے گھر میں کیا کیا تھا۔ حد یہ کہ انہوں نے ان کی ملازمہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ جب احسن کی بیوی مرگئی تو وہ اپنی حیوانیت اس پر اتارنے لگے۔ وہ رات بھر وقفے وقفے سے احسن پر تشدد کرتے رہے۔ وہ چاہتے تو ایک گولی یا چاقو کے ایک وار سے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اذیت سے مرے۔ ان کی یہی خواہش احسن کی زندگی اور شہور اور مہر داد کی موت کی وجہ بن گئی۔ بہت زیادہ خون بہنے کے باوجود وہ بخنک گیا اور پھر

موت بن کر ان کا پیچھا کرنے لگا۔ سلمان دم یہ خود سانس رہا تھا۔ اس بار وہ سچ میں نادر سے خوفزدہ ہو گیا اور ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے سفاک انسان ہو۔“

”جو مجھے نہیں جانتے، وہ یہی سمجھتے ہیں۔“ نادر فرخ سے ہنسا۔ ”پر جو جانتے ہیں، وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔“

”مجھے بھی آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔“ سلمان نے کہا۔ ”پر وہ شخص کیسا ہوگا جس سے آپ بھی ڈر رہے ہیں۔“

”وہ بہت خطرناک ہے۔“ نادر نے فکر مندی سے کہا۔ ”مجھے اب بھی اطمینان نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ میرے بارے میں جان گیا ہو اور جیل سے باہر میرا منتظر ہو۔“

سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمرے میں دیک گیا تھا۔ کچھ دیر بعد نادر بھی سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ اس سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس روز وہ کام پر بھی نہیں گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اسے چھٹی دے دی گئی۔ سلمان کام پر چلا گیا۔ دوپہر کے وقت نادر کچھ دیر کے لیے باہر نکلا مگر اس سے زیادہ دیر باہر نہیں رہا گیا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ واپس جا کر لیٹ گیا۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسی طرح اس کی طبیعت خراب رہی اور وہ رہا کر دیا گیا تو وہ سب کیسے کرے گا جو اس نے سوچا ہوا تھا۔ شام کے وقت اس کی طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی مگر رات ہوتے ہی پھر بخار اور جسم میں درد شروع ہو گیا۔ سلمان کہیں سے اس کے لیے دوا لے آیا تھا، دوا کھا کر نادر سو گیا۔ قاتل قیدیوں کو آج بھی بوتل ملی تھی۔ اس بار انہوں نے ڈاکو کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ وہ سلمان کو بھی پلانے کے موڈ میں تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بارہ بجے تک انہوں نے بوتل ختم کر دی اور دو بجے تک وہ نشے کی حالت میں اول فول بکیتے ہوئے سو گئے۔ ان کے سوتے ہی سلمان حرکت میں آ گیا۔

نادر گہری نیند میں تھا پھر اسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے اور کوئی اسے تھپڑ مار رہا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ کھلی۔ تب اسے سلمان نظر آیا جو رہ رہ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا اور دہلی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ۔۔۔۔۔“

کتے۔۔۔۔۔ اٹھنا کیوں نہیں ہے؟

نادر کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ سلمان میں بھلا اتنی جرأت کہ وہ اسے تھپڑ مارے اور اسے یوں مخاطب کرے۔ مگر پھر وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس

نے اٹھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کمرے کے تیلے اس کا جسم بندھا ہوا ہے۔ پھر اس نے بولنا چاہا تو اپنا منہ بھی بند پایا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور زکام کی وجہ سے ناک تقریباً بند ہونے کی وجہ سے وہ سانس بھی مشکل سے لے پا رہا تھا اور اسی وجہ سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ سلمان کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سادہ اور ڈرپوک سا لڑکا ہے جو کسی کی آنکھوں میں دیکھ کر بات بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے چہرے پر وحشت اور آنکھوں میں سرنی تھی۔ اسے بیدار ہونا دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا۔ اسی لمحے باہر گشت کرنے والا جیل گارڈ آیا تو سلمان نے پھرتی سے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ گارڈ کے جوتوں کی آواز بیک کے سامنے تک آئی اور پھر آگے چلی گئی۔ گارڈ کے جاتے ہی سلمان نے اپنے اور اس کے سر سے کمرے کے کپڑے ہٹا لیے اور آہستہ سے بولا۔

”تم ہوش میں ہو؟“

نادر نے سر ہلایا اور ناک سے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ سلمان نے جواب دیا۔ ”بتاتا ہوں۔۔۔۔۔ بتاتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر بیک کے دروازے تک گیا اور دائیں بائیں دیکھ کر واپس آیا۔ بیک کے سامنے بلب روشن تھا اور اس کی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ سلمان واپس آ کر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ اس نے پتا نہیں کہاں سے یہ ڈوری لی تھی جس سے نادر کو باندھا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں رومال ٹھنسا ہوا تھا اور اوپر دوسرا رومال بندھا تھا۔ سلمان نے اس پر کمرے کا ٹھیک کیا اور بولا۔ ”تمہیں بتانا تھا کہ میں بے گناہ پڑا گیا تھا۔۔۔۔۔ فساد تو دور کی بات ہے، میں کسی سے نظر اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا اور بہن کا ایک ہی بھائی تھا۔ میرا باپ بچپن میں گزر گیا۔ میری ماں نے مجھے گھروں میں کام کر کے پالا مگر اس نے مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ میں نے دنیا کا سامنا نہیں کیا۔ پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ میں نے میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا مگر جب مجھے شیلڈ دینے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا تو میری ناگہمیں کانپ رہی تھیں اور مجھ سے نظریں نہیں اٹھاتی جا رہی تھیں۔ اسکول میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ میں کسی سے گلے ملنے والا لڑکا نہیں تھا۔ میں سوائے تعلیم کے ہر شے میں پیچھے تھا۔ یہی حال محلے میں تھا۔ وہاں میں کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ بات تو تب کرتا جب میں گھر سے باہر نکلتا۔

میں اسکول سے گھر آتا اور پھر ضرورت کے لیے ہی گھر سے نکلتا تھا۔“

سلمان دھیمی آواز میں لیکن تیز تیز بول رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کی ٹھنکن نکال رہا ہو اور نادر کو ستانا اس کا مقصد نہ ہو جو بچپنی بچپنی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سلمان نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم سوچ سکتے ہو میں کس قسم کا لڑکا تھا۔ ہم بہت غریب تھے۔ ایک کمرے کے کوٹھری نما مکان میں رہتے تھے جس کا فرش بھی کچا تھا۔ ماں کمانی تھی اور ہم تین کھاتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اب کالج میں پڑھنے کے بجائے ماں کا ہاتھ بناؤں گا۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ یہاں بھی کم گوئی اور جھجک آڑے آئی۔ میں کسی سے بولتے ہوئے شرماتا تھا کہ وہ مجھے ملازمت دے دے۔ پھر قدرت نے مدد کی ماں جس گھر میں کام کرتی تھی، اس کے مالک نے مجھے اپنی دکان پر رکھ لیا۔“

گارڈ کے قدموں کی آہٹ آئی تو سلمان چپ ہو کر جلدی سے کمرے میں ہو گیا۔ اس وقت نادر کو ہوش آیا اور اس نے آتے ہوئے گارڈ کو متوجہ کرنے کے لیے جسم ہلاتا اور کلبلانا شروع کیا تھا کہ ایک ٹیکسی چیز اس کی گردن سے لگ گئی اور سلمان کی سرگوشی سنائی دی۔ ”یہ چھری ہے، ساکت ہو جاؤ ورنہ گردن میں اتر جائے گی۔“

نادر یک دم ساکت ہو گیا۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ دوسروں کو بے دروغ موت کے گھاٹ اتار دینے والے شخص کو زندگی سے کتنا پیار ہے کیونکہ اب اس کی جان پر بن آئی تھی۔ گارڈ چلا گیا تو سلمان نے اپنے اور اس کے منہ سے کمرے کے کپڑے ہٹا لیے اور اس کے پاس چھوٹی سے چھری دیکھی۔ یہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والی عام سی چھری تھی لیکن اس میں کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے کی پوری صلاحیت تھی۔ سلمان نے چھری دھار والی طرف سے اس کے منہ پر پھیری مگر اس طرح کہ اس کی کھال نہ کٹے اور وہ اس کی دھار محسوس کر لے۔ سلمان نے آگے کہنا شروع کیا۔ ”میں اس کے پاس کام کرتا تھا۔ صبح دس بجے جاتا اور رات بارہ بجے واپس ہوتی تھی۔ چودہ گھنٹے کی اس نوکری کے بدلے مجھے چھ ہزار روپے ملتے تھے۔ اس میں سے بھی ہزار روپے دوپہر کے کھانے کے کٹ جاتے تھے۔ مجھے پانچ ہزار روپے ملتے تھے مگر میں اس میں بھی خوش تھا کہ میں اب ماں سے لے نہیں رہا ہوں، اسے کچھ دے رہا ہوں۔ پھر اس روز دکان پر گیا تو حالات خراب ہونے کی وجہ سے مارکیٹ بند



## مسافر

سن ہاسلم

روشن خیالی اپنے وسیع تر مفہوم میں دراصل سوچ کی ترقی ہے... اس کا مقصد بنی نوع انسان کو خوف و دہشت اور غلامی سے آزادی دلانا ہے... اپنی ہرزیادتیوں... اور غلطیوں کو جائز قرار دے کر نفسانی جبلتوں اور وحشتوں کے اسیر سوداگروں کا گھنٹاٹونا کھیل... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وقت کی رفتار جب بدلتی ہے تو پرشے میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے...

ایک باپ اور بیٹی کے درمیان جاری حیات و موت کی رسائی...

”تم پاگل ہو گئے ہو تویر۔“ ملک فیاض نے غصے سے کہا۔ ”تم جیسے لوگوں کو یہ زندگی راس نہیں آئے گی۔“

”ملک صاحب! اب اس کی پروا ہی کس کو ہے۔“

تویر نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون اور بے خونی تھی۔ ”میں نے اپنے مالک سے نانا جوڑ لیا ہے۔ اب میں اسی کے راستے پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”مولوی بیٹے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”نہیں ملک صاحب! صرف انسان بننے کی جدوجہد“

جاسوسی ڈائجسٹ 207 مئی 2014ء

اب اس کے چہرے پر عجیب معنوں میں دہشت تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ سلمان نے سرگوشی میں کہا۔ ”وہ میری بہن تھی۔“

☆☆☆

صبح بیرک کا دروازہ کھلا اور گاڑی کا رخ کرخت لیے بیٹھ گیا۔ ”چل، تیری رہائی کا آرڈر آ گیا ہے۔“

باقی چار پڑے تھے اور لگ رہا تھا بے خبر سو رہے ہیں۔ گاڑی سلمان کو لے گیا اور آدھے گھنٹے بعد وہ جیل سے رہا ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد بیرک میں موجود افراد جاگنے لگے۔ ڈاکو اٹھا اور پھر ایک قاتل اٹھا۔ جب اس نے اپنا کیبل ہٹایا تو اچھل پڑا۔ اس کا لباس خون خون ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی۔ اسی لمحے گاڑی وہاں آ گیا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھا تو سیٹی بجائی اور ذرا سی دیر میں نصف درجن گاڑیوں کے اندر تھے۔ دوسرا قاتل بھی اٹھ گیا تھا مگر نادر لیٹا رہا اور جب اس کا کیبل ہٹایا گیا تو پیچھے سے اس کی زخموں سے چور لاش نکلے۔ اس کے بے لباس جسم کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا تھا جس پر زخم نہ ہوں۔ کیس واضح تھا۔ مقتول کے ساتھ قاتل بھی رینگے ہاتھوں موجود تھا اور آگے نقل بھی دستیاب تھا اس لیے کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا کہ یہ قاتل اس نے نہیں کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کام سلمان کا ہے لیکن یہ زیادہ ناقابل یقین بات تھی۔ سب جانتے تھے کہ سلمان چوٹی بھی نہیں مار سکتا تھا۔ انسان کا قتل اور وہ بھی اتنی سفاکی سے اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

☆☆☆

سلمان نے اخبار میں مکمل خبر دیکھی اور مسکرا دیا۔ وہ پکڑے جانے کے خوف سے گھر نہیں گیا تھا مگر اب وہ آزاد تھا۔ وہ گھر جا سکتا تھا۔ اس کا گھر خالی پڑا تھا۔ سلمان کو پتا چلا کہ ایک محلے والے نے اسے کسی کو کرائے پر دے دیا تھا مگر وہ بھی غائب ہو گیا اور تب سے یہ خالی پڑا تھا۔ جو سامان تھا، وہ چور اچھے لے گئے تھے، اب سوائے درود یوار کے وہاں کچھ نہیں تھا۔ سلمان گھر میں آیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور پھر واحد کمرے میں آیا تو چونک گیا۔ وہ برسوں یہاں رہا تھا۔ اس نے پہلی نظر میں محسوس کر لیا کہ کسی نے کونے میں کچی زمین کھودی تھی۔ لیکن کیوں؟ اس نے سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو کھود کر دیکھے گا۔ اگلے دن اس نے کوشش کی کہ فریش کھودا تو دو فٹ بعد پھاؤ ڈاکو کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک بکس تھا۔ سلمان نے اسے کھولا تو اس کے اندر رقم اور جڑاؤ زپورات موجود تھے۔

تھی۔ میں واپس آ رہا تھا کہ کالج کے سامنے سے گزرتے ہوئے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ مجھے پرفساد اور ہنگامہ آرائی کا الزام لگا۔ جو اصل قصور وار تھے، وہ تھانے سے چھوٹ کر چلے گئے اور مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا جہاں میری ماں نے پتا نہیں کہاں سے پیسے کر کے ایک سستا وکیل کیا اور اس سے وکیل کی مہربانی سے میں ایک سال کے لیے جیل آ گیا۔ ساری جمع پونجی اس مقدمے کی نذر ہو گئی۔ قرض ادھار کی نوبت آئی اور اسے اتارنے کے لیے ماں نے پہلی بار میری بہن کو کام کرنے کے لیے کہیں بھیجا۔“

سلمان چپ ہو گیا۔ وہ یوں گہرے سانس لے رہا تھا جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ بولنے لگا۔ ”میری بہن بہت محصوم تھی، صرف سولہ سال کی۔ اس نے دنیا نہیں دیکھی تھی۔ ماں نے ہمیں باہر جانے ہی نہیں دیا۔ اسکول بھی اس نے پانچویں تک پڑھا تھا۔ محسن نے زندگی میں پہلی بار کہیں کام کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی شرط تھی کہ وہ ان کے پاس رہے گی۔ ان کے دو بچے تھے اور انہوں نے ان کے لیے محسن کو رکھا تھا۔ وہ وہیں رہتی تھی۔ اگر قرض کا چکر نہ ہوتا تو ماں بھی اس سے کام نہ کرائی اور کبھی اسے کسی کے ہاں نہ چھوڑتی۔ لیکن انسان کو مجبور یاں ہی مارتی ہیں۔ وہ بھی مجبور تھی۔ روز قرض خواہوں کو اپنے دروازے پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔“

نادر کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بات سمجھ رہا ہے مگر سلمان اس کے تاثرات پر توجہ دینے بغیر بولتا رہا۔ ”جب میں گرفتار ہوا اور مجھے بے گناہ ایک سال کی سزا ہوئی تو میرے اندر بغاوت ہی آگئی۔ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا تو سزا کس بات کی؟ مجھے اوپر والے سے شکوے شکایتیں ہونے لگیں۔ میں انسانوں سے نہیں بول سکتا لیکن اس سے تو بول سکتا تھا۔ میں ہر رات اس سے پوچھتا کہ مجھے بے گناہ یہاں کیوں بھیجا اور پھر میری بہن کی خبر آئی۔ اس نے خود گوشی کر لی تھی۔ پھر ماں اس کے صدمے سے مر گئی تو میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں یہاں بے بس اور قید تھا۔ ان کو قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میرے شکوے اب گستاخی کی حد تک جا پہنچے تھے۔ میں اس سے لڑنے لگا تھا کہ سب میرے ساتھ کیوں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ لیکن اب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں کیوں بھیجا ہے۔ نادر! تجھے وہ محصوم لڑکی یاد ہے جسے تو نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے آبرو کیا تھا؟“

نادر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سب سمجھ گیا تھا اور

جاسوسی ڈائجسٹ 206 مئی 2014ء

کر رہا ہوں۔ مولوی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے تمہاری یہ کروٹ ہمارے لیے کتنے نقصان کی بات ہے؟“

”جانتا ہوں ملک صاحب! آپ کو ایک لاکھ ہفتے کا گھانا ہو جائے گا۔ میں تو مشورہ دوں گا کہ آپ بھی اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کریں۔ یہ زندگی کتنے دنوں کی ہے ملک صاحب! کچھ دنوں کے بعد تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”کس نے چابی دے دی ہے تمہیں؟“

”میں نے اپنے اندر کی آواز سن لی ہے ملک صاحب۔“ توخیر نے کہا۔ ”اور میرا خدا گواہ ہے کہ میں بہت مطمئن ہوں۔“

ملک فیاض گہری نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے توخیر کی طرف دیکھتا رہا۔

توخیر ایک کسرنی بدن کا خوب صورت شخص تھا۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی شہرت اور ہیبت نے اسے جرائم کی دنیا کا ایک افسانوی کردار بنا دیا تھا۔

لوگ اس سے خوف زدہ رہا کرتے۔ وہ اکیلا واردات کرنے کا عادی تھا۔ ڈاکے سے لے کر اغوا برائے تاوان تک۔ اس نے لاکھوں کمائے تھے اور اسی طرح پیسے لٹاتا بھی رہا تھا۔

وہ ہر ہفتے ملک فیاض کو ایک لاکھ روپے پہنچا دیا کرتا۔ ملک فیاض اس علاقے کا ایک بڑا پولیس آفیسر تھا اور اس کی وجہ سے توخیر کو کچھ آسانیاں بھی مل جاتی تھیں۔

باہمی اشتراک سے زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی کہ ایک ہفتے توخیر نے فیاض کے لیے کچھ نہیں بھیجا۔ اس وقت فیاض نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ توخیر اگر ایک ہفتے پیسے نہیں دے پاتا تھا تو اگلے ہفتے اس کی کوپورا کر دیتا۔ لیکن دوسرے کے بعد جب تیسرا ہفتہ بھی ہو گیا تو اس نے اپنے خاص آدمی راجا سے توخیر کے بارے میں دریافت کیا۔ ”راجا! یہ توخیر کہاں رہتا ہے آج کل... کئی ہفتوں سے دکھائی نہیں دیا۔“

”ملک صاحب! کیا آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟“

”کیوں، کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”اس نے تو ایک بڑی دکان میں ملازمت کر لی ہے۔“ راجا نے بتایا۔ ”کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔“

”کیا کہہ رہا ہے؟ توخیر نے ملازمت نہیں کی ہوگی۔“

وہ اس اسٹور میں لمبا ہاتھ مارنا چاہتا ہوگا۔ میں اس کی رنگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ ملازمت وغیرہ کا بندہ نہیں ہے۔“

”اب سمجھ میں آگئی جی۔ اسی لیے میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔“

”اب دیکھ لینا اسٹور کا کیا حشر ہوتا ہے۔“ فیاض اپنی مونچھوں کو تار دیتے ہوئے بولا۔

لیکن ڈیڑھ مہینا گزرنے کے بعد بھی جب نہ تو اسٹور کا کچھ ہوا اور نہ ہی توخیر اس کے پاس آیا تو ملک فیاض کا ماتھا ٹھنکا۔ کوئی نہ کوئی گزرتا ضرور تھی۔ اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے توخیر کو بلا بھیجا۔

توخیر نے آتے ہی بتایا تھا۔ ”ملک صاحب! میں نے جرم سے توبہ کر لی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”پاگل مت بنو۔“ فیاض نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نوسو چوہے کھا کر بلی جگ کو جا رہی ہے۔“

”نوسو چوہے کھا کر بلی نے توبہ کر لی ہے ملک صاحب۔ اور اوپر والا توبہ قبول کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے میری توبہ بھی قبول ہو جائے۔“

”اوائے، ایمانداری کی زندگی تم لوگوں کے لیے نہیں بنی۔“ فیاض نے کہا۔ ”یہ شریفوں کے نخرے ہیں، ان ہی کے لیے رہتے دو۔ تم یہ بتاؤ، یہ ملازمت تمہیں کیا دے رہی ہے؟“

”دس ہزار روپے مہینہ۔“

”بس؟“ فیاض ہنس پڑا۔ ”دس ہزار تو تمہارے دو دن کا خرچ ہے۔“

”خرچ ہے نہیں ملک صاحب... خرچ تھا لیکن خدا کی مہربانی سے اب سب کچھ بدل چکا ہے۔“

دفعاً ملک فیاض نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔ ”چل بھائی! مرضی ہے تیری۔ جس طرح زندہ رہنا چاہتا ہے رہ لے۔ اب کوئی تجھے مجبور تو نہیں کر سکتا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ ملک صاحب، توخیر نے کہا۔

”تو اب میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ۔“

توخیر کے جانے کے بعد ملک فیاض نے راجا کو بلا لیا۔ ”دیکھ راجا! یہ جو توخیر ہے نا، یہ بڑا ملنگ بننے کے چکر میں ہے۔ درویش ہوتا جا رہا ہے سالہا۔ نیک بننے چلا ہے۔ اب بتا اسے سیدھے راستے پر کیسے لایا جائے؟“

راجا بہت شاطر قسم کا انسان تھا۔ اس نے ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”ملک صاحب! اس

میں کون سی مشکل ہے۔ اس کے راستے بند کر دیں، خود ہی سیدھے راستے پر آجائے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”توخیر جس سپر اسٹور میں ملازم ہوا ہے، اس کے مالک کو بلا کر ذرا سمجھا دیں۔ خود ہی نوکری سے جواب دے دے گا۔ اس کے بعد بھی جہاں جہاں یہ کام کرے، وہاں ایسی ہی باتیں کر دیں جی۔ ہر طرف سے مارا کھا کر ہماری ہی طرف آئے گا۔ یہ پیٹ کی بار بہت بڑی ہوتی ہے۔“

”ہاں، یہ بات کی تو نے۔“ فیاض خوش ہو گیا۔ ”تو واقعی کام کا آدمی ہے۔“

دوسرے دن سپر اسٹور کا مالک ملک فیاض کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ ایک پولیس آفیسر کے اس طرح بلانے پر بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ ”بھائی صاحب! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ فیاض نے کہا۔ ”آپ کو ہم نے آپ کا بھلا سمجھانے کے لیے بلایا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔“

”بتائیں جناب! ایسی کیا بات ہے؟“

”آپ نے توخیر نام کے کسی بندے کو ملازمت دی ہے؟“

”جی ہاں، وہ بہت ایماندار اور محنتی آدمی ہے۔“

”اس کی ایمانداری اور محنت تو اس وقت سامنے آئے گی حاجی صاحب جب آپ کے اسٹور میں جھاڑو پھر چکی ہوگی۔“

”جی ہاں، اسٹور کے مالک نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”وہ ایک ہسٹری شیٹر ہے حاجی صاحب۔“ فیاض نے بتایا۔ ”نہ جانے کتنے کیسز ہیں اس پر۔ اغوا برائے تاوان، ڈاکے، اقدام قتل اور نہ جانے کیا کیا۔ آپ کہیں تو اس کی فائل دکھا دوں؟“

”نہیں، نہیں۔ آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ آپ نے نہیں بہت بڑے نقصان سے بچا لیا ہے۔ آپ کا احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میں آج ہی اس کم بخت کی چھٹی کر دوں گا۔“

توخیر کو اسی شام اسٹور سے فارغ کر دیا گیا۔ اب اس کے لیے آزمائش کے سلسلے شروع ہو گئے۔ اس نے یہ سنا تھا کہ جب کوئی شخص برائیاں چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ اس کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا امتحان شروع ہو گیا تھا۔

اس قسم کی باتیں اس کے حوصلے کو پست نہیں کر سکتی

تھیں۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ برائی کے راستے پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔

اسے ایک اور ملازمت مل گئی۔ یہ بہت معمولی سی ملازمت تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا لیکن اپنے بد نما ماضی کی وجہ سے محل کر سامنے نہیں آ سکتا تھا۔

یہ ملازمت ایک فیکٹری میں تھی۔ ملک بھر میں یہ ہوزری کی سب سے بڑی فیکٹری تھی۔

توخیر کو شفٹ انچارج کی ملازمت ملی تھی لیکن اس کا ماضی فیاض کی وجہ سے پھر آڑے آ گیا تھا۔ اس بار ملک فیاض خود فیکٹری کے مالک وقار خان کے پاس آیا تھا۔ کیونکہ وقار خان بہت دولت مند انسان تھا اور دولت کے ساتھ ساتھ اس نے سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے طاقت بھی حاصل کر لی تھی۔

فیاض نے جب اسے توخیر کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی آدمی ہماری فیکٹری میں آ گیا ہو۔ لیکن میں ان معاملات کو نہیں دیکھتا۔ میں نہیں جانتا کہ کس کو رکھا جاتا ہے کس کو نہیں۔ یہ کام سپروائزر کا ہوگا، اسی نے رکھا ہوگا۔“

”بس سر جی! ہم نے تو آپ کو سمجھا دیا ہے۔ توخیر ایک خطرناک آدمی ہے۔“

”چلیں جی، آپ کا شکریہ۔“ وقار خان نے کہا۔

”میں اسے ابھی ہٹا دیتا ہوں۔“

توخیر کو وہاں سے بھی ہٹا دیا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے لیے زمین تلگ ہوئی جا رہی ہو۔ اس کے ماضی کے سائے اس سے پہلے ہی پہنچ جاتے تھے اور وہ سائے اس کی نیکی کی کوششوں کو کسی عنقریب کی طرح نگل جاتے تھے۔ اس شام وہ بہت اداس تھا۔

اس کی ادا سی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ چائے پینے کے لیے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟

وہ چائے کے گھونٹ لے رہا تھا کہ ایک آدمی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ”توخیر استاد! کیسے ہوتی؟“ اس نے بے تکلفی سے توخیر کو مخاطب کیا۔

توخیر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا پھر اسے یاد آیا کہ اس کے سامنے جو شخص آ کر بیٹھا ہے اس کا نام دلدار ہے۔ وہ پولیس کے لیے خبیر کا کام کرتا ہے۔ خاص طور پر فیاض کے لیے۔

لگادی تھیں۔  
یہ دونوں بندے کندھ کوٹ ہی میں رہا کرتے تھے اور ان کا کام شہر میں ہونے والے ہر نئے واقعے کی خبر باؤل تک پہنچانا تھا۔ ویسے وہ باؤل کے لیے اس سے پہلے بھی اس قسم کے کئی کام کر چکے تھے۔

ان دونوں نے بہت ہوشیاری اور پلاننگ کے ساتھ اپنا کام پورا کیا تھا۔ جھگڑا اور فائرنگ سے چار آدمی ہلاک ہو گئے تھے لیکن بخت نواز کا کام بن گیا تھا۔

☆☆☆

افشین ایک ذہین اور خوب صورت لڑکی تھی۔ ایک دولت مند باپ کی ضدی اور خود سواد لاد۔ اس نے زندگی کا ابھی تک صرف ایک پہلو دیکھا تھا اور وہ پہلو تھا دولت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی طاقت۔

افشین نے زندگی کے دکھ بھی برداشت نہیں کیے تھے۔ وہ پھولوں کے بستے پر سونے والی اور کلیاں بچھے ہوئے راہ گزر پر چلنے والی لڑکی تھی۔

ایک شاعر گاڑی اس کے دولت مند باپ نے خرید کر اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ لانگ ڈرائیو کی شوقین تھی۔ اس ڈرائیو میں وہ کبھی کبھی ڈیٹھان کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتی تھی۔

ڈیٹھان اس کے باپ کے دوست کا بیٹا تھا اور اس کا تعلق بھی دولت مند طبقے سے تھا۔

افشین نے پہلی بار اس کو دیکھ کر پسند نہیں کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہوتی چلی گئی۔ ایک دن ڈیٹھان نے اس سے اپنی پسند یا محبت کا اظہار کر دیا۔

افشین یہ سن کر بہت دیر تک ہنستی رہی۔ ڈیٹھان جھلا کر رہ گیا۔ ”کیوں، ہنس کیوں رہی ہو؟ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنا دیا ہے؟“

”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ لطیفے سے کم نہیں ہے۔“ افشین نے کہا۔ ”اس قسم کی باتیں ہمارے طبقے کے لوگ نہیں کرتے۔ یہ تمہی پٹی رومانویت ہے۔ فلموں میں بھی اچھی نہیں لگتیں۔“

”لیکن میں کیا کروں؟ میں نے جو محسوس کیا، وہ بتا دیا ہے۔“

”کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔“ افشین نے کہا۔ ”بس ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ آئندہ سے ایسی باتیں مت کرنا۔“

ڈیٹھان نے اس کے بعد پھر اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

”ہاں جانتے ہیں ہم۔“ بخت نواز نے اپنی گردن ہلائی۔ ”اس وقت ہم نے ایک ضروری کام سے بلایا ہے بابا۔“

”آپ بس حکم دیں سائیں۔“  
”کام ذرا ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔“  
”آپ فکر نہ کریں سائیں۔“

”بابا! کل مجھے ایک جلسے میں تقریر دہرائی گئی ہے۔“ بخت نواز نے بتایا۔ ”سیاسی جلسہ ہے۔ میں ایم این اے کے لیے کھڑا ہو رہا ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہوتے؟“

”جی سائیں! سمجھ گیا ہوں۔ آپ الیکشن لڑ رہے ہیں۔“  
”ہاں بابا، یہ سیٹ مل گئی تو میرے ساتھ تمہارے بھی مزے آجائیں گے۔“ بخت نواز نے کہا۔ ”خیر، تمہارا کام یہ ہو گا بابا کہ تم مجھے تقریر نہیں کرنے دو۔ ذرا فائرنگ شارٹنگ ہونی چاہیے لیکن ہم کو بچا کر بابا... ایسا نہ ہو ہم ہی کو لڑھکا دو۔ آس پاس کے دو چار بندے چلے جائیں تو وہ چلتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا سائیں... اس سے کیا ہوگا؟“  
”بے وقوف، یہ سیاست کے کھیل ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔“ بخت نواز ہنس پڑا۔ ”میں اس کا سارا الزام اپنے مخالف پر لگا دوں گا۔ پھر تو جیت اپنی ہوگی۔“

”سمجھ گیا سائیں لیکن اتنا دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ حکم کریں تو وہ بندہ ہی نہ رہے۔“  
”نہیں، اس سے کام خراب ہو جائے گا۔“ بخت نواز نے کہا۔ ”لوگ سمجھ جائیں گے کہ یہ کام ہم نے کروایا ہے۔ ہم تو اس کو سیاسی مار مارنا چاہتے ہیں بابا۔ لیکن کام ایسا ہو کہ کسی کو چٹا نہیں چلے کہ یہ کام تم لوگوں نے کیا ہے۔ جانتے ہو بابا، آج کل یہ بی وی چینل والے بہت تیز ہو گئے ہیں۔ قبر کے مردے کو بھی بچھ لاتے ہیں۔“

”ایسا ہی ہو گا سائیں۔“ باؤل نے اطمینان دلایا۔  
”بس بابا، اب تم جاؤ۔ مہمان خانے میں آرام کرو۔ سب کچھ ہے وہاں۔“ بخت نواز نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر باؤل کی طرف پھینک دی۔  
”لو بابا، اپنا خرچہ پانی۔“

”آپ کی مہربانی سے سائیں سب کچھ ہے اپنے پاس۔“  
”رکھ لو بابا، لکھی کو انکار نہیں کرتے۔“

بخت نواز کا جلسہ دوسرے دن شام کو تھا۔ باؤل اور اس کے ساتھی منہ اندھیرے حویلی سے نکل کر اپنے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

باؤل نے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس نے کندھ کوٹ میں موجود اپنے دو ساتھیوں کی ڈیوٹیاں

لاکھ روپے۔ لیکن ابھی تک کوئی اس انتعام کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اس وقت انہیں صحرا میں بہت دور تک سفر کرنا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی منزل کندھ کوٹ تھی۔

کندھ کوٹ ایک بہت بڑی بستی تھی۔ اس پورے علاقے کا حکمران بخت نواز تھا۔

اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بہت بڑا وڈیرا۔ نہ جانے کتنے ڈاکو اس کے یہاں پرورش پایا کرتے۔ اس کی شاندار حویلی کا دور دور تک کوئی جواب نہیں تھا۔

اس حویلی میں ملازمین اور خادموں کی پوری فوج رہا کرتی۔ یہ سب بخت نواز کے خوف سے کانپتے رہتے۔ وہ جب چاہتا اس کی بندوق کی ایک گولی کسی کے سینے میں اتر جایا کرتی۔ پھر کسی کی مجال تھی کہ وہ اپنے سگے کی موت پر ماتم کرنے کی ہمت بھی کرتا۔

باؤل اپنے ساتھیوں کے ساتھ کندھ کوٹ ہی کی طرف جا رہا تھا۔ بخت نواز نے اسے طلب کیا تھا۔ باؤل اپنی سلطنت کا ویسے تو خود حکمران تھا لیکن کبھی کبھی اسے ایسے وڈیروں کی بات بھی ماننی پڑتی تھی۔

راتے بھر خاموشی رہی...۔۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ بس ایک جگہ رک کر انہوں نے ریت پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ کندھ کوٹ پہنچ گئے۔ بخت نواز کی حویلی بھی ان کی دیکھی بھالی تھی۔ ان کی جیب کو دیکھ کر بڑا گیت کھول دیا گیا۔

انہیں عالی شان قسم کی بیٹھک میں پہنچا دیا گیا۔ پھر ان کے لیے چائے ناشتے کا بندوبست کر دیا گیا۔ ابھی تک بخت نواز ان کے سامنے نہیں آیا تھا۔ باؤل کے ساتھیوں کو مہمان خانے لے جایا گیا۔ اس بیٹھک میں صرف باؤل رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد بخت نواز اندر سے برآمد ہوا۔ وہ پچاس پچاس سال کا ایک مضبوط جسم کا انسان تھا۔ اس نے ایک قیمتی شانل اوڑھ رکھی تھی۔ باؤل نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا دیا۔ ”بیٹھ جاؤ بابا۔“ بخت نواز نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”راتے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی بابا؟“

”نہیں سائیں، آپ کی دعا سے تکلیف کیا ہوئی تھی؟“ باؤل نے کہا۔ ”یہ صحرا تو ہمارا گھر ہے سائیں۔“

”کیا بات ہے تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“ دلدار نے پوچھا۔ ”ہاں پہچان گیا ہوں۔ تم دلدار ہو۔“ تنویر نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں استاد کہ تم بہت پریشان ہو۔“ دلدار ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”اور تمہاری پریشانی کی وجہ بھی جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہو؟“  
”یہی کہ تم ایک اچھا انسان بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہو رہی ہیں۔“ دلدار نے کہا۔ ”اور جانتے ہو کہ یہ رکاوٹیں کون کھڑی کر رہا ہے... ملک فیاض۔“ تنویر کو اندازہ تو تھا لیکن یقین نہیں تھا اور دلدار نے اسے یقین دلادیا تھا۔

”تنویر استاد! میں بہت بُرا انسان ہوں۔“ دلدار نے کہا۔ ”زندگی بھر جھوٹ سچ بولتا رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میرے سینے میں ایک چھوٹا سا چراغ ضرور روشن ہے۔ ملک فیاض نہیں چاہتا کہ تم سیدھے راستے پر آؤ۔ کیونکہ اس میں اس کا سراسر نقصان ہے۔“  
”ہاں یار، یہ بات تو ہے۔ اب میں اس کے لیے سوائے دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں۔“

”تنویر استاد! کیا تمہیں یہ سن کر غصہ نہیں آیا؟“  
”نہیں۔“ تنویر مسکرا دیا۔ ”بلکہ خوشی ہوئی ہے کہ میرا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا مجھے ثابت قدم رکھے۔“

صحرا سمندر جا رہا تھا۔ لیکن نہیں۔ صحرا سمندر کہاں کہاں ہے۔ حدنگاہ تک۔ صحراؤں میں چلنے والی خاص طرح کی گاڑی بہت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ اس جیب میں چار افراد سوار تھے۔ باؤل، منہار، کرم اور ساگر۔ یہ چاروں انتہائی خطرناک ڈاکو تھے۔ باؤل ان کا سردار تھا۔ اٹھائیس تیس برس کا ایک کڑیل انسان۔ گھنی موچھیں، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور کسرتی بدن کا ایک ایسا شخص جسے صحرائی طوفان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا سناٹا ہو جاتا۔ اس کا نام دور دور تک دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے ڈاکے مارے ہوں گے۔ کتنے خون کیے ہوں گے۔ باؤل کے پاس ایسی باتوں کا کوئی حساب نہیں تھا اور وہ حساب کرتا بھی نہیں تھا۔ حکام نے اس کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ بیس

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆



اندرو داخل ہو گئے۔ اس دوران میں محلے والے بھی گھر کے باہر جمع ہو چکے تھے۔

تویر، رحمت صاحب کے گھر میں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد ملک فیاض گھر سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلاشکوف دبی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ہیروئن کے پیکیٹس سے بھرا ہوا سا پر تھا۔ اس نے دونوں چیزیں محلے والوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھیں جناب! اس بد معاش کے گھر سے یہ ہیروئن اور یہ کلاشکوف ملی ہے اور خود بھاگا ہوا ہے۔“

اب محلے والوں کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ تویر نے محلے والوں سے اپنے گھر کی تلاشی کے لیے کیوں کہا تھا۔ اس کے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن پولیس نے برآمدگی دکھا دی تھی۔

”یہ غلط ہے جناب۔“ رحمت صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”تویر کے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم؟“ ملک فیاض نے چیکھی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ محلے کا بچہ ابھی کچھ دیر پہلے پورے گھر کی تلاشی لے چکا ہے۔“ رحمت صاحب نے بتایا۔

”تویر کو شبہ ہو گیا تھا کہ آپ یہ ڈرایا کرنے والے ہیں اس لیے اس نے یہ احتیاطی تدبیر کر لی تھی۔ اب اگر آپ نے جھوٹا الزام لگایا تو یہ پورا محلہ اس کے حق میں گواہی دینے کو

جہ بلیاں آئی ہیں۔“

”بس تو آپ میرے حق میں گواہی دیجیے گا۔“ تویر نے کہا۔ ”میں ذرا خورشید صاحب اور نیاز علی کو بھی اٹھا دیتا ہوں۔“

”لیکن بات کیا ہے؟“

”یہ میں ابھی بتاتا ہوں۔“

تویر نے خورشید اور نیاز علی کے ساتھ محلے کے اور بھی دو چار آدمیوں کو جگا دیا تھا۔ وہ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگ میری بات سنیں۔“ تویر نے کہا۔ ”جس وقت میں جرم کے راستے پر تھا، اس وقت کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میرے دروازے پر بھی آسکے۔ لیکن میں نے جب سے نیکی کے راستے پر چلنے کی کوشش کی ہے، مجھ پر عذاب نازل کیے جا رہے ہیں۔ یہ عذاب انسانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اب میں آپ لوگوں کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ میں نے اپنے گھر میں ہیروئن اور کلاشکوف چھپا رکھی ہے آپ لوگ وہ برآمد کر کے مجھ پر احسان کریں۔“

”یہ کیا مذاق ہے؟“ محلے کے ایک صاحب ناراض ہونے لگے۔ ”اس وقت تمہیں یہ کیا سوچھی؟“

”پلیز، آپ لوگ میرا یہ بوجھ ہلکا کر دیں۔“ تویر نے کہا۔ ”لیکن ذرا جلدی۔ کیونکہ وقت ختم ہوتا جا رہا ہے اور ایک ایک چیز پر دھیان دیجیے گا۔ کچن سے لے کر ہاتھ روم تک کھنگال ڈالیں۔“

محلے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر تویر کے مکان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پورے مکان کو چھان ڈالا لیکن کچھ بھی نہیں مل سکا۔

”نہیں بھئی، تمہارے مکان میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ محلے والوں نے کہا۔

”اب مجھے اجازت دیں کہ میں آپ میں سے کسی کے مکان میں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤں۔“ تویر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر کے بعد یہ ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔“

رحمت اللہ صاحب نے تویر کو اپنے گھر میں بٹھالیا۔ دلدار کی اطلاع درست ثابت ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ملک فیاض کی سربراہی میں پولیس کی دو گاڑیاں شور مچاتی ہوئی پہنچ گئیں۔

تویر کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پولیس والے

اس کے لیے بہت معمولی رقم تھی لیکن اس نے روکھا سا مہیلا کر جواب دیا۔ ”تویر بھائی! تم تو جانتے ہو کہ آج کل کاروبار کی کیا پوزیشن ہے۔“

”ہاں، یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔“ تویر معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ”مجھے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسی قسم کی باتیں کرو گے۔ خیر، میرا خدا مالک ہے۔ تم خوش رہو۔“

اس کی طبیعت بہت پوجیل ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لیے اس قسم کی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس نے جس راہ کا انتخاب کیا ہے، اس پر چلنا کوئی اتنا آسان نہیں۔

اس وقت رات کے بارہ یا ساڑھے بارہ بجے تھے جب دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت کون آسکتا تھا؟ پہلے بھی رات کے وقت اس کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ لیکن اب کون آیا تھا؟

دروازے پر دلدار کھڑا تھا۔ پولیس کا خبر... جو پھولی ہوئی سانسوں سے کہہ رہا تھا۔ ”تویر بھائی! جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل لو۔“

”وہ کیوں؟“

”ملک فیاض چھاپا مارنے آرہا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہارے گھر سے ہیروئن نکلے گی اور دو کلاشکوف برآمد کی جائیں گی۔ وہ پوری پلاننگ کر چکا ہے۔“

”اوہ، اب سمجھا۔“ تویر نے گردن ہلا دی۔ ”کتی دیر میں آرہے ہیں وہ لوگ؟“

”دو گھنٹوں میں۔“ دلدار نے بتایا۔ ”تم اپنا کوئی بندوبست کر لو۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی۔ میں کچھ ایسا بندوبست کروں گا کہ ملک فیاض کے ہوش اڑ جائیں گے۔ تم اب جاؤ، میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا۔“

دلدار کے جانے کے بعد تویر نے برابر والے پڑوسی رحمت اللہ کا دروازہ بجا دیا۔ رحمت اللہ صاحب کسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ انتہائی نیک اور مقبول آدمی تھے۔

”رحمت صاحب! میں آپ کو اس وقت ایک زحمت دینے آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“

”آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے، سچ بتائیں... کیا میں خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں؟“

”ہاں میاں، یہ بات تو ہے۔ تم میں حیرت انگیز

ایک شام لاگ ڈرائیو ہی کے دوران میں ان دونوں کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ گاڑی تو افشین ہی چلا رہی تھی۔ ذیشان اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار جیب اس طرح ان کے سامنے آ کر رک گئی کہ افشین کے بریک لگاتے لگاتے ان کی گاڑی اس جیب سے ٹکرائی تھی۔

نقصان تو کوئی خاص نہیں ہوا تھا لیکن یہ بہت انہونی سی بات تھی۔ ذیشان نے جیب والوں کو بڑا بھلا کہنا شروع کر دیا جس کے جواب میں جیب سے تین آدمی اتر کر گاڑی کے پاس آ گئے۔

وہ تینوں مسلح تھے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھا رہا۔ افشین اور ذیشان خوف زدہ ہو کر آنے والوں کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سب تہہ آؤر اور خطرناک قسم کے لوگ تھے۔ ”چلو جیب میں بیٹھو، جلدی۔“ آگے والے نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

”لگ... کون ہو تم...؟“ ذیشان نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”واہ، ابھی بھی نہیں سمجھے۔“ آنے والا ہنس پڑا۔

”ہم تمہیں اغوا کر رہے ہیں۔“

”نہیں۔“ افشین چیخ اٹھی۔

”خاموش۔“ ریوالور کی نال افشین کی کپٹی سے لگا دی گئی تھی۔ ”آواز نکلے گی تو پھر گولی چل جائے گی۔“

ان دونوں کو جیب میں بٹھا دیا گیا۔

پھر انہیں اندازہ نہیں ہوسکا کہ کتنی دیر کے سفر کے بعد وہ جیب ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئی تھی اور کس طرح انہیں جیب سے اتار کر ایک کونھری میں بند کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

تویر کے لیے وہ رات بہت بھاری تھی۔

شام کے وقت اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو اس زمانے میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا جب تویر اپنی برائیوں کے راستے پر چل رہا تھا۔

اس شخص کی تجوری تویر کے ایک اشارے پر کھل جاتی۔ وہ تویر کے قدموں میں ٹوٹوں کے ڈھیر لگا دیتا تھا لیکن اس شام اس نے تویر کو کچھ رقم دینے سے معذرت کر لی تھی کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تویر اب اس کے کسی کام نہیں آسکتا۔

تویر نے اس سے صرف پچاس ہزار مانگے تھے جو

تیار ہے۔“

ملک فیاض کی بہت سکی ہوئی۔ وہ غیظ اور جھلٹا ہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنویر، رحمت صاحب کے گھر سے نکل کر ان لوگوں کے سامنے آ گیا۔ وہ بہت اداس تھا۔

”آپ لوگوں نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے اس کے لیے میں زندگی بھر آپ لوگوں کا احسان نہیں بھلا سکتا۔ لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرے لیے اس شہر میں رہنا ناممکن ہے۔ اسی لیے مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔“

”لیکن کہاں جاؤ گے؟“ کسی نے پوچھا۔

”کسی ایسی جگہ جہاں میرا بدنام ماضی میرے ساتھ نہ ہو۔“ اس نے کہا۔ ”جب میں غلط راستوں پر چل رہا تھا، اس وقت زندگی مجھ پر ہر طرح مہربان تھی اور جب میں نے سیدھی راہ اختیار کی تو دنیا بھر کے عذاب مجھ پر ٹوٹنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب میری آزمائشیں ہیں۔ بہر حال جو خدا کی مرضی۔“

”تنویر! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“ محلے والوں نے کہا۔ ”ہم تمہارے لیے احتجاج کریں گے۔ تمہارے لیے آواز اٹھائیں گے۔“

”مجھ جیسے بدنام زمانہ انسان کے لیے بہت بڑی بات ہے کہ آپ جیسے لوگ میرا ساتھ دے رہے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی پر کوئی آج آئے۔ اسی لیے مجھے سکون کی زندگی گزارنے کے لیے کسی طرف چلے جانا چاہیے۔“

☆ ☆ ☆

افشین اور ذیشان کو باڈل کے اڈے پر پہنچا دیا گیا تھا۔

ان دونوں کو انخوا کرنے والے باڈل ہی کے آدی تھے۔ راستے بھر خوف سے افشین کی حالت خراب رہی تھی۔ ذیشان اسے تسلیاں دیتا رہا لیکن خود اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

اس نے ایسے واقعات صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب خود اس کے ساتھ بھی ہوگا۔ شہر کی آرام دہ زندگی گزارنے والے ذیشان کے لیے یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا لیکن ایسا خواب جس کا تسلسل ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

ان دونوں کو باڈل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ باڈل بہت دلچسپی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ پھر اس نے افشین کے پاس جا کر اس کی طرف دیکھنے ہوئے کہا۔ ”لڑکی! تو بہت خوب صورت ہے لیکن مجھے تیری خوب صورتی سے کچھ نہیں لیتا۔“

”تو پھر یہ بتاؤ، ہمیں کیوں اٹھایا ہے؟“ ذیشان نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”تادان کے لیے۔ تم دونوں دولت مند باپ کی اولادیں ہو۔“ باڈل نے کہا۔ ”دس بیس کروڑ تو مل ہی جائیں گے... کیوں ساتھیو؟“ اس نے یہ بات اپنے ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھی۔

سب ایک ساتھ خوشی کے نعرے لگانے لگے۔

”لیکن ہمارے والدین کے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے دس بیس کروڑ دے سکیں۔“ ذیشان نے کہا۔

”جھوٹ بولتے ہو تم۔“ باڈل دہاڑا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمارے بندے تم دونوں کو یونہی اٹھا کر لائے ہیں؟ نہیں... ہمارے بندوں نے تم دونوں کی پوری خبر نکالی ہے۔“

افشین کی آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں۔ ذیشان نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ باڈل نے دمکلی دی۔ ”خبردار! جو اس کو ہاتھ لگایا۔“

اس نے اپنی بندوق کارخ ذیشان کی طرف کر دیا۔ ذیشان دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”جاؤ، اس چھو کری کو الگ کوٹھری میں بند کر دو۔“

باڈل نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

افشین میں اب احتجاج کرنے کی بھی ہمت اور طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ ایک سنانے کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، وہ ایک المناک اور گہرے خواب کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

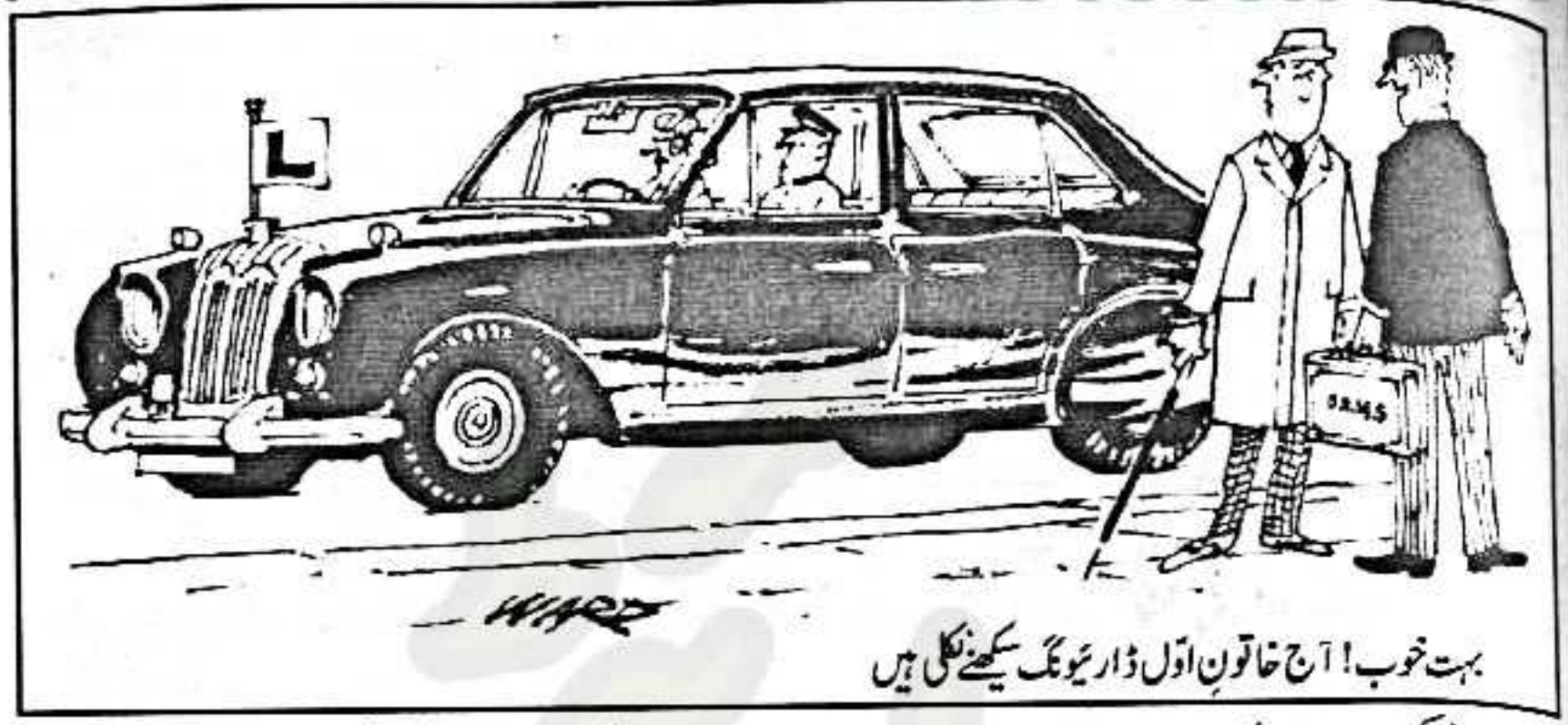
وہ اسے ایک طرف لے گئے جبکہ ذیشان وہیں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کسی کو روکنے کی کوشش کرتا۔

پھر بھی اس نے ہمت کر کے باڈل سے کہا۔ ”دیکھو، تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں دونوں گھروں کے فون نمبر دے دیتا ہوں۔ ان سے بات کر کے اپنا معاملہ طے کر لو۔“

”معاملہ تو تیرے گھروالوں سے طے ہوگا۔“

”اور لڑکی؟“

”اس کے لیے ہم نے دوسری بات سوچ رکھی ہے۔“



بہت خوب! آج خاتون اول ڈائریٹنگ سیکھنے نکلے ہیں

”بھائی! کیا آس پاس کوئی ایسی بستی نہیں ہے جہاں مکینک مل سکے؟“ تنویر نے بس کے ڈرائیور سے پوچھا۔

”بابا! یہاں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بڑی بستی ہے کندھ کوٹ۔“ ڈرائیور نے بتایا۔

”کیا وہاں مکینک ہوتا ہے؟“

”ہاں ہوتا ہے۔“ ڈرائیور نے بتایا۔ ”لیکن وہاں جاؤ گے؟ دو چار کلومیٹر کی بات تو نہیں ہے نا۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہوگا۔“

”راستہ ایک ہی ہے۔ اگر کوئی دوسری گاڑی ادھر سے گزرے تو اس سے بولا جائے۔ شاید وہ کندھ کوٹ تک لے جائے۔ پھر وہاں سے مکینک کولانا آسان ہو جائے گا۔“

اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ کندھ کوٹ تک کیسے جایا جائے؟ مسافروں پر خوف طاری تھا۔ انہوں نے ان علاقوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہاں ڈاکوؤں کی حکمرانی ہو آ کر تھی۔

مسافر ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔ تنویر کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ اس طرف بالکل اندھیرا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر بس کھڑی ہوئی تھی۔ بس کی روشنیاں سڑک پر دوڑے ڈال رہی تھیں۔ تنویر اندھیرے میں بیٹھ کر اندھیرے ہی کا حصہ بن گیا تھا۔

پھر اچانک کچھ ہوا۔

دو گاڑیاں نہ جانے کس طرف سے نکل کر بس کی طرف آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے لگیں۔ شاید گاڑی والوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔

بس کی طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ تنویر اندھیرے میں چھپا ہوا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا

باڈل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

تنویر کے لیے اپنے شہر کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ صرف ملک فیاض ہی نہیں بلکہ دوسرے جرائم پیشہ افراد بھی اس کے پیچھے بڑ گئے تھے۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس شہر ہی سے کوچ کر جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اس کا جاننے والا نہ ہو جہاں اس کا ماضی اس کے ساتھ نہ چلتا ہو۔

اس نے طویل فاصلے کی بس پکڑ لی۔ اس کے ذہن میں کسی خاص مقام کا تعین نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ جہاں اسے سکون ملے گا، وہ وہیں بسر کر لے گا۔ چھوٹا موٹا کام تو ہر جگہ مل ہی سکتا ہے۔

لیکن بس کسی خاص منزل پر بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک دیرانے میں آ کر اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اسے کچے میں اتار کر روک دیا گیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور سڑک کے دونوں طرف سوائے گہری تاریکی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں طرف سپاٹ میدان ہیں یا گھنے جنگل۔

بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں ہی شامل تھے۔ بچے بھی تھے۔ بس کے اس طرح اچانک رک جانے پر دہشت سی پھیل گئی۔ ہر ایک نے یہ سن رکھا تھا کہ ایسے ویرانوں میں مسافروں کو لوٹ لیا جاتا ہے۔

ہر شخص ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے صورت حال معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ ان کے پاس اس کے علاوہ اور کیا جواب ہو سکتا تھا کہ بس میں اچانک کوئی خرابی ہو گئی ہے جو ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ 215 مئی 2014ء



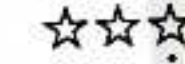
جو بدھوں بہاڑے ہوئے کاریوں سے اور برسوں پریشان کر دینے والا گھب اندھیرا اور اچھے ہوئے راستے۔

اندھیرے میں انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اچانک سڑک کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لڑکی چیخ کر تویر سے لپٹ گئی۔

”گھبراؤ نہیں۔“ تویر نے اسے تسلی دی۔ ”مشاہدہ نہیں تمہارے فرار کا پتا چل گیا ہے اسی لیے وہ خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کر رہے ہیں۔“

اس نے لڑکی کے رونے کی آواز سنی۔ وہ آہستہ آہستہ روئے جا رہی تھی۔ ”خدا کے لیے رونا بند کرو۔“ تویر نے کہا۔ ”ہم ابھی خطرے سے دور نہیں ہوئے۔ وہ تمہارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔“

لڑکی نے اپنی سانسیں تک روک لی تھیں۔ وہ دوڑتے چلے گئے۔ جھاڑیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں۔ انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں بس جان بچانے کی فکر انہیں دوڑائے۔ جارہی تھی۔



بازل کے سامنے افشین ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی معصوم سی فاختہ۔

بازل اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”چھو کر رہو! کیا تجھے اندازہ ہے کہ میں تیرے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟“

افشین تھوک نکل کر رہ گئی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ”پھل اٹھ، کونے میں کیوں پڑی ہے؟ تیرے ناخن تو بہت بڑے بڑے ہیں۔ حملہ کر جھ پر۔ وہ دیکھ... وہ کونے میں ایک بندوق پڑی ہوئی ہے۔ اسے اٹھا کر گولی چلا دے مجھ پر۔“

”خدا... خدا کے لیے معاف کر دو۔“ افشین روتے ہوئے بولی۔

”تو حملہ کیوں نہیں کرتی؟ مجھے ایسی عورت پسند نہیں ہے جو اپنی عزت بچانے کے لیے شور بھی نہ کر سکے۔ مجھے شیرنیاں پسند ہیں۔ پھاڑ دے مجھ کو۔ مار مجھے۔ ناخنوں سے میرا چہرہ لگاڑ دے۔“

لیکن افشین اپنی جگہ پر کھڑی کاپٹی رہی۔

”تف ہے تجھ پر۔“ بازل غصے سے بولا۔ ”میں نے تجھے کیا سمجھا تھا اور تو کیا لگی۔ خیر، اب تو آرام کر۔ مجھے تجھ سے ابھی کچھ نہیں لینا دینا۔“

”مجھے جانے دو۔“ افشین روتے ہوئے بولی۔

”ہاں، ہاں چھوڑ دوں گا تجھے۔ تیرا چار نہیں بناؤں گا۔“ بازل نے کہا۔ ”یہ لے اپنا موبائل۔“ اس نے موبائل افشین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نمبر ملا اپنے باپ کا اور اسے بتادے کہ تیرے ساتھ کیا گزری ہے۔“

افشین نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے پاپا کا نمبر ملا یا۔ ”پاپا! ہم... میں یہاں ہوں...“ وہ اس سے آگے کچھ نہیں بول پارہی تھی۔

بازل نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھٹ لیا۔ ”سنو سینڈ صاحب! تمہاری بیٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ میرا نام سنو گے تو بخار آ جائے گا۔ بازل نام ہے میرا... بازل۔ چلو تم سے پھر بات کروں گا۔“

اس نے موبائل آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا پھر اس نے افشین کی طرف دیکھا۔ ”آرام کر۔ کل صبح تجھ سے بات ہوگی۔“

بازل کے جانے کے بعد بھی اس کی دہشت اس کرے میں رہی تھی۔

افشین ایک کونے میں بیٹھی کانب رہی تھی۔ زندگی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کل تک اس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں دینے والے نہ جانے کہاں رہ گئے تھے۔

اب اس کے سامنے جو کچھ بھی تھا، وہ بہت بھیا تک تھا۔ ایک خطرناک آدمی نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے کی تبدیلی تھی اور یہ لمحہ بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔

ایک بار پھر قدموں کی آہٹ گونجی۔ افشین بھڑک کر کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے ڈیٹان کو بھی اس کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کی حالت شاید افشین سے بھی زیادہ خراب تھی۔

افشین جلدی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔ ”بتاؤ، کیا ہوا؟ تمہیں کیسے آنے دیا؟ اس نے تو تمہیں الگ رکھا ہوا تھا؟“

”افشین! ہم بہت خطرناک آدمی کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔“ ڈیٹان نے کہا۔ ”یہاں سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہمارے والدین ان کا مطالبہ پورا کر دیں۔“

”میرے پاپا سے اس نے بات تو کی ہے۔“ افشین نے بتایا۔ ”لیکن ابھی اپنا مطالبہ نہیں بتایا ہے۔“

”میرے گھر والوں سے رابطہ نہیں ہو پارہا۔“ ڈیٹان نے بتایا۔ ”شاید سکنل کی خرابی ہے۔“

اسی وقت باہر سے ڈھول پیٹنے جانے کی آوازیں

آنے لگیں۔ یہ ڈھول ایک ترتیب اور آہنگ کے ساتھ بجائے جا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

اسی وقت کوٹھڑی میں ایک ڈاکو داخل ہوا... ”باہر نکلو، تم دونوں۔ سردار بلا رہا ہے۔“

”نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔“ افشین نے خوف زدہ ہو کر ڈیٹان کا بازو تھام لیا تھا۔

”جانا پڑے گا افشین۔“ ڈیٹان نے کہا۔ ”یہ خطرناک لوگ ہیں۔“

چھوٹے سے میدان میں بازل ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے الاؤ روشن تھے۔ اس جنگل کی خاموشی کو ڈھول کی آوازیں توڑ رہی تھیں۔ کچھ عجیب، پراسرار اور بھانک سا ماحول تھا۔

گھٹنا جنگل، خطرناک صورتوں والے ڈاکو۔ ڈھول بجاتے ہوئے لوگ اور الاؤ کی روشنی۔ ان دونوں کو بازل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے اشارے پر ڈھول پیٹنے والوں نے ڈھول بجانے بند کر دیے۔

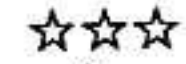
ایک اعصاب شکن سانسنا در آیا تھا۔ دونوں کو اپنی دھڑکنیں تک صاف سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا؟

”کیوں، بہت محبت ہے تم دونوں میں؟“ بازل نے گہری سانس لی۔ ”ایک دوسرے کے عاشق معشوق ہو؟“

”نہیں سردار! ہم صرف دوست ہیں۔“ ڈیٹان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا۔

”دوست!“ بازل ہنس پڑا۔ ”واہ، کیا دوستی ہے۔ خیر، آج جشن کی رات ہے۔ آج دوست ایک طرف چپ چاپ بیٹھے گا اور دوستی ٹاپے گی۔ چلو ناچو۔“ یہ اس نے افشین سے کہا تھا۔

اس کے اشارے پر دوبارہ ڈھول بجنے لگے اور افشین کونائج کا آغاز کرنا پڑا۔



جنگل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس طرف نکل آئے تھے۔ لڑکی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے کئی بار لڑکھڑا کر گر پڑی لیکن تویر اسے سہارا دیے ہوئے چلنے پر مجبور کرتا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ ڈاکو ان کی تلاش میں پورا جنگل چھان ماریں گے۔ اسی لیے انہیں کسی محفوظ جگہ پہنچانا ضروری تھا

میں اب نہیں چل سکتی۔“ لڑکی ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ تنویر بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اس کے اندازے کے مطابق دونوں نے اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ پھر چانک ان دونوں کو کچھ محسوس ہوا۔ یہ ڈھول پینے کی آوازیں تھیں۔ اس جنگل میں وہ آوازیں کسی عفریت کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ ”یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ لڑکی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”شاید، آس پاس کوئی بستی ہے۔“ تنویر نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہاں کوئی جشن ہو رہا ہو۔“

”چلو، وہیں چلتے ہیں۔“ لڑکی جلدی سے بولی۔

”اس طرح نہیں۔“ تنویر نے سرگوشی کی۔ ”ہم دور سے دیکھیں گے۔ اس کے بعد بستی میں جائیں گے۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں۔“

کچھ دیر آرام کے بعد وہ پھر چلنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ڈھول کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ وہ انہی آوازوں کی طرف چل پڑے۔ بہت آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے۔

ابھی تک انہیں ایک دوسرے کے نام بھی نہیں معلوم ہو سکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن جان بچانے کے بے پناہ خوف نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے جا رہے تھے، ڈھول کی آوازیں اور واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ بالآخر انہیں درختوں کے ایک سلسلے کی دوسری طرف روشنی بھی دکھائی دے گئی۔ یہ شاید الاؤ کی روشنی تھی۔ زرد اور تھر تھراتی کانپتی ہوئی۔ ”سنو۔“ تنویر نے سرگوشی کی۔ ”اس وقت تمہارا روشنی کے پاس جانا مناسب نہیں ہے۔ تم یہیں رہنا۔ میں جائزہ لے کر آتا ہوں۔“

”نہیں۔“ لڑکی نے خوف زدہ ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں اکیلی نہیں رہ سکوں گی۔“

”سمجھا کرو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ تنویر نے کہا۔ ”میں بس پانچ منٹ میں واپس آ رہا ہوں۔“

تنویر کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔

لڑکی ایک درخت کے تنے سے چبٹی بیٹھی تھی۔ تنویر نے پہلے اسے آواز دی۔ پھر اس کے پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ ”یہ لوگ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”شاید شہر

کی ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو پھڑلائے ہیں۔“

”میرے خدا! لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔

”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے بہت قریب سے جائزہ لیا ہے۔“ تنویر نے بتایا۔

”اور یہ ڈھول پینے کی آوازیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”یہ کیوں آرہی ہیں؟“

”وہ ڈاکو اس بے چاری سے زبردستی ڈانس کروا رہے ہیں۔“ تنویر نے بتایا۔

لڑکی سہم کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

ملک فیاض کے لیے یہ شہر تھا کہ وہ ایک بہادر اور بے خوف قسم کا پولیس آفیسر ہے۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ظالم اور راشی انسان تھا اس لیے اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی جبکہ اندر سے وہ بہت بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ مجرموں کے خلاف سازشیں تو کر سکتا تھا لیکن انہیں لکارتا ہوا ان کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ اسی لیے جب اعلیٰ حکام نے اسے طلب کیا تو وہ بہت گوگولی کیفیت میں ان کے سامنے پہنچا تھا۔

وہاں پولیس، آرمی، انٹیلی جنس کے لوگوں کے علاوہ دو اور سولین بھی تھے جن میں سے ایک کو وہ اچھی طرح جانتا تھا جبکہ دوسرا اس کے لیے اجنبی تھا۔

”ملک فیاض! معاملہ بہت گمبیر ہے۔“ اس سے کہا گیا۔ ”اور تمہارے شانوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے۔“

”حاضر ہوں جناب۔“

”یہ صاحب ابراہیم بھائی ہیں۔“ ایک آفیسر نے ایک سولین کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کی بیٹی کو بازل ڈاکو نے اغوا کر لیا ہے۔“

”جی جناب! معلوم ہے مجھے۔“

”اور یہ شاہ صاحب ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اسی لڑکی کے ساتھ اغوا ہوا ہے۔ بازل ڈاکو سے دونوں کی بات ہو چکی ہے۔ اس نے دس دس کروڑ روپے مانگے ہیں۔“

”یہ تو بہت بڑی رقم ہے جناب۔“

”ہاں ہے تو بڑی رقم... لیکن اولاد کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ ابراہیم بھائی نے کہا۔ ”ان لوگوں سے میرا رابطہ ہو چکا ہے۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ وہ علاقہ جنگلوں کا ہے۔ اگر یہ واردات شہر میں ہوتی تو ہم کسی نہ کسی طرح ان ڈاکوؤں سے نمٹ لیتے لیکن وہاں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پہلے بھی ہم نے کئی کارروائیاں کی ہیں لیکن سب ناکام ہو گئیں۔ کیونکہ وہ پورا علاقہ درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ میلوں میل تک کچھ پتا نہیں چلتا۔“

”سمجھ گیا جناب! یہ تو واقعی بہت خطرناک صورت حال ہے۔“

”اسی لیے ہم یہ ذمہ داری تمہیں دے رہے ہیں کہ تم ایک بہادر انسان ہو۔“

”جی۔“ ملک فیاض حیران رہ گیا۔ ”میں نہیں سمجھا جناب! مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تم بیس کروڑ روپے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“ اس سے کہا گیا۔ ”وہ جگہ بھی طے ہو گئی ہے جہاں تمہیں پیسے لے کر پہنچنا ہے۔ دوسری طرف سے وہ ڈاکو ان دونوں کو لے کر پہنچیں گے۔ تم پیسے ان کے حوالے کرو گے اور ان دونوں کو لے کر واپس آ جاؤ گے۔“

”لیکن جناب! ملک فیاض کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

”یہ تو بہت ذمہ داری کی بات ہے۔“

”اسی لیے تو تمہارا انتخاب ہوا ہے۔“

”لیکن میں اکیلا۔“

”اکیلے نہیں۔ تمہارے ساتھ دوسرے پولیس والے بھی ہوں گے لیکن یہ قافلہ کندھ کوٹ میں رک جائے گا۔ کندھ کوٹ سے تم جیب لے کر اکیلے جنگل کی طرف جاؤ گے۔“

”آپ لوگوں نے مجھے بہت بڑی ذمہ داری دے دی ہے جناب۔“ ملک فیاض پریشان ہو رہا تھا۔

”اس کا اندازہ ہے ہمیں۔ لیکن یہ کام تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ بس اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہمارے پاس صرف دو دنوں کی مہلت ہے۔“

☆☆☆

جنگل کی صبح بہت خوب صورت تھی۔

پرندوں کی آوازوں نے ایک ایسا خوشگوار اثر مرتب کیا تھا کہ وہ دونوں مبہوت ہو کر رہ گئے۔ اس لڑکی کا نام فرزین تھا۔ وہ ایک عام سے تاجر کی بیٹی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ لاہور جا رہی تھی کہ اس کے ساتھ راستے میں یہ سانحہ پیش آ گیا تھا۔

تنویر نے اسے کھل کر اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ رات بھر میں فرزین کو اس کے کردار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تنویر کسی محافظوں کی طرح اس کی دیکھ

بھال کرتا رہا تھا۔

وہ دونوں الاؤ والی بستی سے کچھ دور نکل آئے تھے۔ یہ جنگل کسی طرح محفوظ تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ انہوں نے سکون سے رات گزار لی تھی۔

صبح ان کے لیے کئی مسائل لے کر آئی تھی۔ تنویر نے فرزین سے کہا۔ ”دیکھو، ہمیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔ جنگل جا بے لاکھ وسیع سہمی لیکن ہمیں نہ کہیں تو ختم ہونا ہے۔“

”لیکن ہم کس طرف جائیں گے؟“

”یہ تو خود میں بھی نہیں بتا سکتا۔“ تنویر نے کہا۔ ”لیکن نکلنے کی کوشش تو کرنی ہے نا۔ یہاں تو ویسے بھی بھوکے پیاسے مرجائیں گے۔“

رات بھر کے آرام نے انہیں تازہ دم کر دیا تھا۔ دونوں پھر چل پڑے۔ دن کی روشنی نے جنگل کی بہت تازی کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا پھر بھی دیکھ لیے جانے کا خوف تو لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بہت احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔

”نہ جانے وہ لڑکی کون ہوگی جس کو یہ کم بخت اٹھا کر لے آئے ہیں۔“ فرزین نے چلتے چلتے کہا۔ ”اور اس سے زبردستی رقص بھی کروا رہے ہیں۔“

”خدا جانے کون ہے۔ ویسے میں اگر اکیلا ہوتا تو شاید اسے نکال لے جانے کی کوشش ضرور کرتا۔“ تنویر نے کہا۔ فرزین نے گزشتہ رات تنویر کی بہادری دیکھی تھی۔ وہ اسی قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

پھر اچانک درختوں کے سلیٹے ختم ہو گئے اور ایک بستی سامنے آ گئی۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ بے شمار کچے پکے مکانات اور سڑکیں۔ دور سے کسی مل کی چنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ فرزین نے تنویر سے پوچھا۔

”پتا نہیں، میں خود پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“ تنویر نے جواب دیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد دکھانوں پر لگے ہوئے بورڈز سے اندازہ ہو گیا کہ یہ کندھ کوٹ تھا اور اچانک تنویر کو ایک ایسا آدمی دکھائی دے گیا جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

بلکہ اس کی ساری پریشانیاں اس آدمی کی وجہ سے ہی تھیں۔ وہ ملک فیاض تھا۔ وہ اس وقت ایک دکان کے باہر دو تین پولیس والوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

تنویر اس لڑکی کا ہاتھ تھام کر ایک آڑ میں ہو گیا۔

# سرگزشت

ماہنامہ

کی ایک اور قابلِ فخر پیش کش

# خطانمبر

انسان خطا کا پتلا ہے غلطی ہماری سرشت میں داخل ہے  
بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھوٹے آدمیوں کی ایسی بڑی غلطیاں  
جنہوں نے تاریخ، وقت، زندگی اور حالات کا دھار ابدل دیا  
دلوں کو چھو لینے والی سچ بیابیاں دلچسپ قصے اور انوکھی  
وارداتیں ہر تحریر آپ کو حیرت زدہ کر دے گی

یہ ایک ایسا خاص شمارہ ہے جسے آپ مجلد کر کے محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

بہت جلد آپ تک پہنچ رہا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

تو میں ہوئی بابا... آؤ۔  
فرزین نے تویر کا ہاتھ تمام کر اسے اس طرح دبا دیا  
جیسے وہ تویر کو روکنا چاہتی ہو۔  
”چلو بابا، کیا سوچ رہے ہو؟“

تویر اس وقت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اندازہ  
ہو گیا تھا کہ یہ شخص صرف مہمان بنانے کے لیے ساتھ نہیں  
لے جا رہا بلکہ اس کی نگاہیں فرزین پر ہیں۔ اگر فرزین ساتھ  
نہ ہوتی تو شاید وہ بہت کچھ کر گزرتا لیکن فرزین کی وجہ سے  
بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے فرزین کو تسلی دی۔ ”گھبراؤ نہیں۔ یہ صاحب  
بہت مہمان نواز معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ایک دودن ان کے  
مہمان بن کر واپس چلے جائیں گے۔“

☆☆☆

بازل ایک بار پھر بخت نواز کے سامنے تھا۔  
بخت نواز کا موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔ ”تم نے  
سارے معاملات خود ہی طے کر لیے۔ مجھے ہوا بھی نہیں گنتے  
دی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سائیں۔“ بازل جلدی سے بولا۔  
”میں تو خود آپ کو بتانے والا تھا۔“

”وہ لڑکی کیسی ہے؟“  
”بہت خوب صورت ہے۔“ بازل نے بتایا۔  
”کتنے میں بات ہوئی ہے؟“

”میں کروڑ سائیں۔ میں کروڑ بہت ہوتے ہیں۔“  
”وہ میں کروڑ یہاں آچکے ہیں۔“ بخت نواز مسکرا کر

بولی۔ ”ایک بے وقوف پولیس والا لے کر آیا ہے۔ اس کے  
ساتھ دو اور پولیس والے بھی ہیں۔ اسی حویلی میں رقم اور ان  
دونوں کا تبادلہ ہوگا۔ میں نے ہی اعلیٰ آفیسروں کو اس بات  
پر راضی کیا تھا۔“

”جی سائیں، آپ حکم دیں۔“  
”تم ان دونوں کو پولیس والوں کے حوالے کر کے ان  
سے رقم وصول کرو گے اور جب وہ واپس جانے لگیں تو راستے  
میں گھیر کر پولیس والوں کو مار دینا اور ساتھ میں اس نوجوان کو  
بھی۔ اور لڑکی کو غائب کر دینا۔۔۔ پھر یہی سمجھا جائے گا کہ  
ڈاکوؤں نے ایسا کیا ہے۔ سارا الزام تم پر آ جائے گا۔“

”الزام کی تو کوئی پروا نہیں ہے سائیں، بس آپ کا  
سایہ سلامت رہے۔“

”میں میں سے پانچ تم رکھ لینا پھر اس لڑکی اور پندرہ  
کروڑ کو میرے پاس پہنچا دینا۔“

فرزین بہت عورتوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کیا تم اس  
پولیس والے سے خوف زدہ ہو؟“ اس نے پوچھا۔  
”ہاں۔“ تویر نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں جانتا  
ہوں اس کو اور میری ساری پریشیاں اسی آدمی کی وجہ سے  
ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ یہاں کیوں دکھائی دے  
رہا ہے؟“

فرزین کچھ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
”اوہ، شاید تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں کوئی جرائم پیشہ شخص  
ہوں۔“ تویر نے کہا۔ ”کسی حد تک تم صحیح بھی ہو۔ اب  
تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری کہانی کیا ہے تاکہ میری طرف  
سے تمہارا دل صاف ہو جائے اور تم مجھ پر اعتبار کرنے لگو۔“

”تو پھر بتاؤ۔“  
”یہاں نہیں۔ پہلے رہنے کا کوئی ٹھکانا تلاش کر لیں۔  
ہمیں واپسی کے سفر کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ ساری زندگی تو  
ہم نہیں رہ سکتے۔“ ملک فیاض اپنے ساتھی پولیس والوں  
کے ساتھ جیب میں بیٹھ کر کسی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دونوں آڑ  
سے نکل کر پھر ایک طرف چل پڑے۔

اچانک ایک جیب ان کے پاس آ کر رک گئی۔  
اس جیب میں محافظوں کے ساتھ بخت نواز بیٹھا ہوا  
تھا۔ اس علاقے کا بادشاہ۔ بخت نواز کی نگاہیں بڑی طرح  
فرزین پر مرکوز تھیں۔ تویر نے فرزین کو اپنی آڑ میں کر لیا  
تھا۔

بخت نواز جیب سے اتر کر ان دونوں کے پاس  
آ گیا۔ اس کے دونوں محافظ بھی اتر آئے تھے۔ ”کون ہو تم  
دونوں؟“ بخت نواز نے پوچھا۔

”مسافر۔“ تویر نے مختصر سا جواب دیا۔  
”اوہ، میری حویلی مسافروں کے لیے کھلی رہتی ہے۔  
مہمان تو اوپر والے کی رحمت ہوتے ہیں۔ ویسے کہاں جانا  
ہے تم دونوں کو؟“

”سائیں! ہماری بس کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔“  
تویر نے بتایا۔ ”ہم بڑی مشکلوں سے بھاگے ہیں۔“

”یہ تو بہت ظلم ہے بابا۔ یہ ڈاکو بہت سرائے لگے  
ہیں۔“ بخت نواز نے کہا۔ ”خیر، آؤ ہمارے ساتھ۔ دو چار  
دن مہمان رہ کر چلے جانا۔“

”نہیں جناب! ہمارے گھر والے پریشان ہو رہے  
ہوں گے۔“ تویر نے کہا۔ ”آپ ہمیں جانے دیں۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ بخت نواز فرزین کو گھورتے  
ہوئے بولا۔ ”اگر تم مہمان بنے بغیر چلے گئے تو یہ ہماری

جاسوسی ڈائجسٹ

”ایسا ہی ہوگا سائیں۔“

”بس اب جاؤ اور اپنے آدمیوں کو پولیس والوں کی واپسی کے راستے میں بٹھا دو۔ اور ہاں، وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”انہیں یہیں کندھ کوٹ کے ایک گھر میں رکھا ہے سائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آدھ گھنٹے بعد ان دونوں کو یہیں لے کر آجاتا۔“ بخت نواز نے کہا۔ ”لیکن دین نہیں ہوگی۔“

بازل کو ہدایت دینے کے بعد وہ ایک دوسرے بڑے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں تنویر اور فرزین بیٹھے ہوئے تھے۔

”تم لوگوں نے کچھ کھایا؟“ بخت نواز نے پوچھا۔

”جی جناب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ تنویر نے کہا۔ ”لیکن اچھا ہوتا آپ اگر جانے کی اجازت دے دیتے۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ بخت نواز غرا کر بولا۔

”یہاں کوئی ہماری مرضی کے خلاف باہر نہیں جا سکتا۔“ اس نے اپنے تیور اچانک بدل لیے تھے۔

پھر وہ اس کمرے سے باہر چلا گیا۔

فرزین بری طرح کانپنے لگی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔“ تنویر نے کہا۔ ”لیکن تم پریشان مت ہو۔ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔ جس طرح اس نے اب تک سلامت رکھا ہے، اسی طرح آئندہ بھی ہماری حفاظت فرمائے گا۔“

”ایسا لگتا ہے جیسے پورا معاشرہ ہی ظالم اور ڈاکو ہو گیا ہے۔“

”ہاں، اب تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ تنویر نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہر حال میں ذرا باہر کے حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“

”نہیں، مجھے ڈر لگے گا۔“

”تم دروازہ اندر سے بند کر لینا اور جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ نہیں کھولنا۔“

اس کمرے سے باہر ایک طویل برآمدہ تھا۔ ایک کونے میں ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا۔ برآمدے سے اتر کر ایک باغ تھا۔ اونچے اونچے درخت۔ فوارے لگے ہوئے تھے۔ ایک راستہ ان درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا باہر

گیت تک چلا گیا تھا۔

اچانک گیت کی طرف سے ملک فیاض اور پولیس والے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے بریف گیس اٹھار کے تھے۔ تنویر فوری طور پر آڑ میں ہو گیا۔

وہ لوگ کونے والے بڑے کمرے میں چلے گئے تھے۔

یہاں ملک فیاض کی موجودگی تنویر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پولیس والوں سے ذرا پیچھے دو اور آدمی بھی تھے۔ تنویر انہیں بھی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ان میں ایک کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ اسی فیکٹری کا مالک تھا جہاں تنویر نے ملازمت کی تھی اور ملک فیاض کے کہنے پر اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔

ان سبھوں کا یہاں جمع ہونا یونہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔

اچانک کوئی ٹھنڈی چیز اس کی گردن سے آگئی۔

”اوئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

کسی نے اس کی گردن پر ریو اور کی نال رکھ دی تھی۔ یہ ایک لمحے کی کہانی تھی۔ اس ایک لمحے نے پرانے تنویر کو بیدار کر دیا تھا۔

اس نے بجلی کی سرعت سے جھکائی دے کر ریو اور پر نہ صرف ہاتھ ڈال دیا بلکہ اس کا بھر پور وار اس محافظ کی کینٹی پر بھی پڑا تھا جس نے اسے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔

ایک طویل کراہ کے ساتھ وہ ایک طرف لڑھک چکا تھا۔

برآمدہ ابھی تک سنان تھا۔ سب لوگ کونے والے بڑے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ تنویر نے بے ہوش محافظ کو اٹھا کر سیدھیوں کے نیچے ڈال دیا اور پھر ایک دوسرا گروپ آتا ہوا دکھائی دے گیا۔

چند خطرناک صورت طویل قامت لوگ اور ان کے آگے آگے چلتے ہوئے ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا۔ یہ دونوں قیدی معلوم ہوتے تھے۔

تنویر نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھی جس کو تانچنے کے لیے مجبور کیا جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اس کی سمجھ میں آچکا تھا۔

وہ برآمدے سے اتر کر حویلی کے درختوں کے درمیان چکر لگاتا ہوا کونے والے کمرے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس سے اندر کے حالات دیکھے جاسکتے تھے۔ اس وقت وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی

کے پاس بھی ایک درخت تھا۔

وہ درخت کے درمیان چھپ کر اندر کے حالات دیکھ اور سن رہا تھا۔

اندر بہت سے لوگ تھے۔ بخت نواز، ڈاکو، فیکٹری کا مالک، لڑکا اور لڑکی، ملک فیاض اور اس کے ساتھ آنے والے پولیس کے سپاہی۔

باتوں سے پتا چل گیا تھا کہ پولیس والے اور دونوں سولیلین اپنے ساتھ جو رقم لے کر آئے تھے، وہ ڈاکوؤں کے حوالے کر دی گئی تھی اور ڈاکوؤں کو دونوں یرغمالی واپس کرنے تھے۔

معاملات طے پا چکے تھے۔

اب انہیں چلنے کی تیاری کرنی تھی کہ اچانک کچھ اور ہو گیا۔

ایک ڈاکو جو بریف کیس کھول کر دیکھ رہا تھا، اس نے اچانک اعلان کیا۔ ”بات سنو، اس میں روپے کم ہیں۔ یہ بیس کروڑ نہیں ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ملک فیاض دباڑا۔

”سائیں! ہمارا یہ بندہ نوٹوں کو سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنی کمی ہوگی۔“

”سر دار! کم از کم پانچ کروڑ کم لگتے ہیں۔“

بازل نے اپنی جیب سے ریو اور نکال کر اس کا رخ ملک فیاض کی طرف کر دیا۔ ”اب بتاؤ کہاں گئے پانچ کروڑ؟ ورنہ یہیں دفن کر دیے جاؤ گے۔“

ملک فیاض نے بے بسی سے اپنی گردن جھکا لی۔

”ہاں، وہ ہم نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔“

”بس تو اب یہ دونوں اس وقت تک ہمارے پاس رہیں گے جب تک کی پوری نہیں ہوتی۔۔۔ اور اب اس دھوکے کے لیے دس کروڑ اوپر سے دینے پڑیں گے۔“

بازل نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ لڑکی نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ کمرے میں عجیب قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

”سائیں! آپ کیا کہتے ہیں؟“ بازل نے بخت نواز کی طرف دیکھا۔

”بابا! جو تمہاری مرضی ہے وہ کرو۔“ بخت نواز غصے سے بولا۔ ”ان لوگوں نے دھوکا دیا ہے۔ اس کی سزا تو ملی چاہیے نا۔“

بازل لڑکی کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ اسی وقت ایک گولی چلی اور بازل

ایک چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔ دوسری گولی نے دوسرے ڈاکو کو ڈھیر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑکی کے ذریعے کمرے میں کود آیا۔ یہ تنویر تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بخت نواز کے پیچھے جا کر اس کی گردن سے ریو اور لگا کر اسے بے بس کر دیا تھا۔

”اب تم ہم سب کو خیر و خوبی کے ساتھ یہاں سے باہر نکالو گے۔“ تنویر نے کہا۔

ملک فیاض اور فیکٹری کے مالک پر سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔

”جلدی کرو۔“ تنویر غرایا۔ ”ورنہ تم بھی یہاں تڑپتے ہوئے دکھائی دو گے اور ہم تمہیں یرغمالی بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کیونکہ تم لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔“

☆☆☆

شہر کے قریب لاکر بخت نواز کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

تنویر ان سب کو اس علاقے سے باہر نکال لایا تھا۔ ملک فیاض نے بتا دیا تھا کہ اس نے وہ پانچ کروڑ کہاں نکال کر رکھے تھے۔

تنویر نے بھی اپنی کہانی سنا دی تھی۔ بخت نواز کو رخصت کر دینے کے بعد تنویر اور فرزین گاڑی سے اتر آئے تھے۔

”تنویر! تم اب ہمارے ساتھ چلو۔“ ملک فیاض نے کہا۔ ”ہم نے تمہیں بہت غلط سمجھا تھا۔“

”میری فیکٹری کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔“ انشین کے باپ نے کہا۔

”آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔۔۔ لیکن اب میری منزل کچھ اور ہے۔“ تنویر دھیرے سے بولا۔ ”اب مجھے وہیں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جہاں سے ختم ہوا تھا۔“

”اور میں اس سفر میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

فرزین بول پڑی۔ ”میری برادری اب مجھے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرے گی کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے بہت دن ڈاکوؤں کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں ناپاک ہو چکی ہوں۔“

تنویر نے آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی گردن جھکا لی۔ اسے زندگی گزارنے کا وسیلہ فراہم ہو گیا تھا۔

دین کے بندھن میں بندھ کے ہر بندھن سے آزاد ہو جانے والے ہوں پرست کا چشم کشا سانس

سلیم فاروقی

## قرض جاں

ہیو کی لامبری ری اینڈ فریمنگ پوائنٹ  
ساؤتھ بسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے  
منے اور پانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے  
دوکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

انسان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے... جو پانی کی سطح پر تیر رہا ہو... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں... اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے... اس کے باوجود انسان اس حقیقت سے نظریں بچا کے ایسے کام کرتا ہے... جس سے انسانیت شرما جائے... ایک ایسے ہی نوجوان کی زندگی کے پیچ و خم... جو ہر موز پر ایک نیا رخ اختیار کر رہے تھے... ایک پل کی لغزش بعض اوقات زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے... وہ بھی غلطی کر کے تمام عمر کے لیے قرضی جاں کا مقروض بن چکا تھا...

## سورق کی پہلی کہانی



مسعود صاحب کی وجہ سے کبھی وقت کے پابند ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کمپیوٹر آن کر لیا۔ دفتر میں آنے والی تمام ای میلز چیک کرنا بھی میری ذمے داری تھی۔ اس کے بعد میں آفس کے دوسرے کام دیکھتا تھا۔

ابو ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ زندگی بھر انہوں نے اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کی تھی تو کہیں جا کر ان کی ترقی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں مجھ سمیت صرف چار افراد تھے۔ امی، ابو، مجھ سے چھوٹی سیما اور میں۔ میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا تھا اور کئی مہینے تک ملازمت کے لیے دھکے کھانے کے بعد گریڈ گیارہ کی یہ کلر کی تھی۔ میں تو شاید انکار کر دیتا لیکن ابو کی انتھک محنت دیکھ کر مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ میں ان کا ہاتھ بنا چاہتا تھا۔ یوں میں نے کلر کی بھی قبول کر لی۔

دفتر میں زیادہ کام نہیں ہوتا تھا، چار بجے تک چھٹی بھی ہو جاتی تھی۔ بس دفتر آنے جانے کی اذیت مار ڈالتی تھی۔

اس دن بھی حسب معمول کام ختم کرنے کے بعد میں کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ پہلے میں نے اپنی ذاتی ای میلز چیک کیں پھر فیس بک کھول کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا روزانہ کا

معمول تھا۔ گھر میں پرانا سا ایک کمپیوٹر تھا لیکن انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی۔

چھٹی کے بعد میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو پھر اسی اذیت کا سامنا تھا۔

میں گھر پہنچا تو شدید تھکن غالب تھی۔ جاتے ہی میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر، تازہ دم ہو کر نکلا تو کچھ جان میں جاں آئی۔

میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال سنوار رہا تھا کہ سیما آگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے سیما... بہت دانت نکل رہے ہیں؟“ ”بھائی! بات ہی ایسی ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”آپ سنیں گے بلکہ دیکھیں گے تو آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔“

”میں دیکھوں گا... کسے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”آئیے، میں آپ کو سر پر اتار دوں۔“ وہ مجھے پختی ہوئی کریم سے باہر لے گئی۔ میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”یہ... یہ... کس... کی ہے یہ... کون لایا ہے؟“ میں نے پوچھائی ہوئی موٹرسائیکل کو دیکھ کر کہا۔ اس کی سیٹ اور ہینڈل پر ابھی تک پلاسٹک چڑھا ہوا تھا اور نمبر پلیٹ تک نہیں تھی۔

”ہو گئے نا حیران!“ سیما چمک کر بولی۔ ”یہ آپ کی ہے۔ امی نے اس مقصد کے لیے کئی ڈالی تھی۔ احسن بھائی ابھی شوروم سے لے کر آئے ہیں۔“

”احسن!“ میں نے کہا۔ ”کہاں ہے احسن؟“ احسن میرا بچپن کا دوست تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔

”وہ تو خود آپ کو سر پر اتار دینا چاہتے تھے لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کسی کا ٹیلی فون آ گیا تو وہ چلے گئے۔ کہہ رہے تھے کہ ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔“

موٹرسائیکل دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میری بھوک پیاس سب ہوا ہو گئی۔

میں دوبارہ لاؤنج میں آیا تو وہاں امی اور ابو بھی موجود تھے۔ میں بے اختیار امی سے لپٹ گیا اور بولا۔

”تھینک یو امی...“

ابو کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی دیر بعد احسن بھی آ گیا اور مجھے خریداری کی رسید دے کر بولا۔ ”بانک کارڈ جسٹیشن نمبر تمہیں پرسوں تک مل جائے گا۔ اس وقت تک رسید جیب میں رکھو اور اس

بانک پر جا کر سب کے لیے مشافی لے کر آؤ۔“  
میں نے اپنے دوستوں کی موٹر سائیکل میں بہت چلائی  
تھیں لیکن یہ احساس ہی عجیب تھا کہ اب میں خود ایک عددنی  
بانک کا مالک تھا۔

میں دوسرے دن وقت سے کافی پہلے دفتر پہنچ گیا۔  
اس وقت صرف چاچا نور دین موجود تھا۔ وہ جھاڑ پونچھ میں  
مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے بولا۔ ”علی بیٹے! کیا  
بات ہے، کیا رات بھر سوئے نہیں ہو یا فجر کے فوراً بعد گھر  
سے نکل گئے تھے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے چاچا۔“ میں نے ہنس کر  
کہا۔ ”میں نے بانک لے لی ہے۔ میں گھر سے تو روزانہ کی  
طرح نکلتا تھا لیکن آفس پہنچنے میں مجھے صرف بائیس منٹ لگے  
ہیں۔“

”ارے بیٹا! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اللہ  
مبارک کرے۔“  
نور دین کی طرح مسعود صاحب بھی مجھے دفتر میں دیکھ  
کر حیران ہوئے تھے۔

میں نے حسب معمول سرکاری ڈاک دیکھی پھر دفتر  
کے دوسرے کام نمٹائے اور کمپیوٹر پر اپنی میل چیک کرنے  
لگا۔ مجھے بھی کوئی اہم ای میل موصول نہیں ہوئی تھی۔ میں  
نے سرسری نظر اپنے ان باکس پر ڈالی پھر چونک اٹھا۔ وہاں  
کسی ایسا نامی لڑکی کی میل تھی۔ میں نے اچھ کر سوچا، یہ ایسا  
کون ہے؟

میں نے اس کی میل کھول لی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ڈیئر  
فرینڈ! میں نے کل آپ کی پروفائل دیکھی تو بہت پسند آئی۔  
میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور مجھے آپ سے ایک  
کام بھی ہے۔ کام میں اسی وقت بتاؤں گی جب آپ میری  
اس میل کا جواب دیں گے، ایٹا۔“

میں نے وہ چند سطریں دوبارہ پڑھیں پھر کئی بار  
پڑھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ ایسا کون ہے  
اور اسے میری پروفائل میں کیا نظر آیا ہے کہ یہ مجھ سے دوستی  
کرنا چاہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے یہ کسی  
دوست کی شرارت ہو۔ وہ ایسا بن کر مجھے بے وقوف بنا رہا  
ہو۔ میں نے سر جھٹک کر سوچا، دیکھا جائے گا۔

پھر میں نے ایسا کو لکھا۔ ”مس ایٹا! میری سمجھ میں نہیں  
آ رہا ہے کہ میری پروفائل میں ایسی کیا بات ہے جو آپ کو  
پسند آئی ہے۔ آپ میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ آپ پہلے  
اپنا تعارف کرا دیں۔“

میں نے اسے جواب دے کر کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا  
کیونکہ دفتر میں چھٹی ہو چکی تھی اور سب لوگ جا چکے تھے۔  
واپسی کا سفر بہت خوش گوار تھا۔ اب نہ لوگوں کے  
دھکوں کا خطرہ تھا، نہ کپڑے خراب ہونے کا خوف۔ میں  
اطمینان سے گھر پہنچ گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے انٹرنیٹ کی  
کئی محسوس ہوئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کسی نیٹ کینے میں  
چلا جاؤں، پھر خیال آیا کہ ایسا کیا جو کوئی بھی وہ تھی، کون سا  
میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ میرا جواب ملنے ہی مجھے میل  
کر دیتی۔

میں نے جیسے تیسے رات گزار دی۔ اس دن معمول کے  
مطابق میں صبح سویرے جو گنگ کے لیے بھی نہیں گیا۔ وقت  
تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔  
اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔  
دروازہ کھولا تو ٹریک سوٹ میں احسن کھڑا تھا۔ وہ پسینے میں  
شرابور تھا۔

”یار علی! تو آج جو گنگ کے لیے کیوں نہیں آیا؟“  
اس نے پوچھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟“  
”طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”بس آج آنکھ ہی ابھی کھلی ہے۔“ پھر میں خفیف ہو کر بولا۔  
”تواند تو آ۔“

”نہیں یار! احسن نے کہا۔“ مجھے بھی آفس کا کچھ  
کام کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے اطمینان سے ناشا کیا۔ اب مجھے ایسی کوئی  
جلدی نہیں تھی۔ سیما کالج جانے لگی تو میں نے اسے بھی  
روک لیا۔ اس کا کالج میرے آفس کے راستے میں تھا۔  
میں آفس پہنچا تو آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے۔

روزمرہ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنی میل  
چیک کی تو میرا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ وہاں ایٹا کا  
جواب موجود تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا لیکن کوئی میری  
طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے ای میل کھولی۔ جواب میں  
ایٹا نے لکھا تھا۔ ”مسٹر علی! آپ شاید مجھے کوئی ایسی ویسی  
لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ میرا پورا نام ایٹا اینڈرسن ہے اور میں  
لاس ویگاس کے ایک بینک میں آفیسر ہوں۔ میں آپ کو اپنی  
دو تصویریں بھیج رہی ہوں تاکہ آپ کو کسی قسم کا کوئی شبہ نہ  
رہے۔ مجھے آپ سے جو کام ہے، وہ میں آپ کا جواب  
موصول ہونے پر بتاؤں گی۔ ہاں، جواب کے ساتھ اپنی  
تصاویر ضرور بھیجئے گا۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ آپ  
نے میری دوستی کو قبول کر لیا ہے۔ آپ کی ایٹا۔“

میرے ہاتھ ہیر لڑنے لگے۔ یونورسٹی کے زمانے  
میں ہی لڑکیوں سے میری دوستی رہی تھی لیکن کسی لڑکی نے آج  
مجھے خط نہیں لکھا تھا۔ اتنی اپنایت سے ایس ایم ایس  
نہیں کیا تھا کہ ”آپ کی ایٹا۔“

میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ میں نے پھر ارد گرد کا  
بازرہ لیا اور اس کی تصویریں ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ وہ بلا کی  
خوب صورت تھی۔ ایک تصویر میں وہ کسی پارک میں کھڑی  
تھی۔ جسم پر نیلے رنگ کی چست جینز اور چست اورنج ٹی  
شرٹ میں اس کا سرایا قیامت ڈھا رہا تھا۔ دوسری تصویر  
میں وہ ایک شان دار آفس میں بیٹھی تھی۔ اس نے کوٹ پہن  
رکھا تھا۔ بڑی سی میز پر ایک طرف کئی ٹیلی فون سیٹ رکھے  
تھے۔ اس کے سامنے لیپ ٹاپ تھا اور وہ کیمرے کی طرف  
دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی  
ہو۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اچانک مسعود صاحب کی آواز میرے کانوں سے  
نکرائی۔ ”علی صاحب!“

”جی سر... وہ... میں ذرا...“  
”ارے آپ تو پریشان ہو گئے۔“ مسعود صاحب  
ہنس کر بولے۔ ”میں صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ میں نے  
سیکرٹری ایٹ کو جو جواب لکھوایا تھا، وہ آپ نے میل کر  
دیا؟“

”جی سر! وہ تو میں نے لٹج سے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔“

میں نے جواب دیا۔  
میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے چوری کرتے  
ہوئے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ کمپیوٹر کی ایل سی ڈی پر  
اس وقت بھی ایٹا کی مسکرائی ہوئی تصویر موجود تھی۔

میں نے جیب سے یو ایس لی نکالی اور ایٹا کی ای میل  
اور دونوں تصویریں یو ایس لی میں محفوظ کرنے کے بعد اس  
کی میل اور تصویریں ڈیلیٹ کر دیں۔ آفس کا کمپیوٹر تو کوئی  
بھی استعمال کر سکتا تھا۔ وہاں ایسے ایسے لوگ موجود تھے جو  
تھوڑی سی کوشش کے بعد کوئی بھی آئی ڈی کھول سکتے تھے۔

میں نے گھر آ کر یو ایس لی اپنی الماری میں حفاظت  
سے رکھ دی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایٹا کی تصویروں کا پرنٹ  
نکلوا لوں گا۔

پھر میں نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا۔  
شام کی چائے میں ابو اور امی کے ساتھ لاؤنج میں  
پینا تھا۔

چائے پیتے ہوئے ابو نے کہا۔ ”علی! میرا ایک شاگرد

مکتبہ خارجہ میں اعلیٰ عہدے پر ہے۔ کل اتفاقاً اس سے  
ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو  
اس نے کہا کہ علی کو مقابلے کا امتحان پاس کرا دیں۔ میں  
اسے فوراً ہی اپنے جگھے میں اپائنٹ کر لوں گا۔“  
”ابو! مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تو مجھے کسی  
سفارش کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“

”خام خیالی ہے تمہاری۔“ ابو نے کہا۔ ”بہت سے  
امیدوار امتحان پاس کرنے کے باوجود وینڈنگ لسٹ پر رہتے  
ہیں۔ اس انتظار میں کئی سال گزر جاتے ہیں لیکن کہیں ان کی  
تعیناتی نہیں ہوتی۔ تم کل سی ایس ایس کا فارم تولے کر آؤ،  
پھر دیکھتے ہیں۔ کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

ابو تو یوں کہہ رہے تھے جیسے سی ایس ایس کا امتحان  
پاس کرنا کوئی مذاق ہو۔ ہاں، کوشش کرنے میں کوئی حرج  
نہیں تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں  
آ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے سیما بھی کمرے میں آئی اور  
بولی۔ ”بھائی! آپ کو کوئی پریشانی ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟“  
”مجھے... نہیں... کوئی پرابلیم نہیں۔“ میں نے  
جواب دیا۔

”پھر آپ اتنے پریشان پریشان سے کیوں ہیں؟  
میں کئی دن سے آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔“  
سیمانے دو دن کو ”کئی دن“ بنا دیا تھا۔ میں نے ہنس  
کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے سیما۔“

”شیور؟“ سیمانے پوچھا۔  
”شیور۔“ میں نے جواب دیا۔  
وہ میرے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی لیکن اس  
نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے البم سے اپنی  
دو تین تصویریں نکالیں اور ان کا جائزہ لیا۔ ایک تصویر گھر  
کے باہر کی دیوار کے ساتھ تھی۔ میں نے اس تصویر میں  
پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، چہرے پر ”رے بن“ کا چشمہ  
تھا۔ پس منظر میں گھر کی دیوار تھی جس پر خوب صورت سی  
ایک تیل بھی لگئی ہوئی تھی۔ اس تیل کی وجہ سے ایسا لگ رہا  
تھا جیسے میں کسی پارک میں کھڑا ہوں۔ دوسری تصویر ٹریک  
سوٹ میں تھی۔ میرے دوستوں اور کزنز کا خیال تھا کہ میں  
بہت وجہیہ و خوب رو ہوں۔ دراز قد، ورزشی جسم، گندی  
رنگت اور براؤن بال۔

میری یہ دونوں تصویریں بہترین تھیں۔ میں ایٹا کو

یہی تصویریں بھیجا جاتا تھا۔  
میں تصویریں لے کر کمپوزنگ ایک دکان میں چلا گیا۔  
وہاں نہ صرف ٹائپنگ کا بندوبست تھا بلکہ وہاں تصویریں اور  
دوسرے کاغذات اسٹیکن بھی ہوتے تھے۔  
اب یہ میری بد قسمتی تھی کہ وہاں کا اسٹیکر ہی خراب تھا۔  
اس کے علاوہ ہمارے علاقے میں کوئی دوسری دکان بھی نہیں  
تھی جہاں سے تصویریں اسٹیکن ہو سکتیں۔ اس کے لیے مجھے  
بہت دور جانا پڑتا۔ میں شاید وہاں بھی چلا جاتا لیکن اچانک  
مجھے خیال آیا کہ میں یو ایس بی لانا تو بھول ہی گیا۔ میں نے  
سوچا کہ اب اگلی دفعہ اپنی تصویریں بھیجوں گا لیکن فی الحال  
اینا کو جواب دینا ضروری تھا۔

میں وہاں سے ایک نیٹ کیفے پر پہنچا اور ایک کین  
میں بیٹھ گیا۔ میں نے جواب میں اپنا کو لکھا۔ "ڈیزر اینا!  
تمہاری تصویریں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور یقین بھی  
آ گیا کہ کوئی میرے ساتھ شرارت نہیں کر رہا۔ میرا پورا نام  
علی عرفان ہے۔ میں ایک سرکاری ادارے میں ملازم  
ہوں۔ میری پہلی چھوٹی سی ہے۔ میرے علاوہ صرف ایک  
بہن ہے اور امی ابو ہیں۔ میں نے آئی آر میں ماسٹرز کیا  
ہے۔ اپنی تصویریں فوری طور پر میں اس لیے نہیں بھیج سکا  
کہ وہ فوری طور پر اسٹیکن نہیں ہو سکیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں  
کہ مجھے تمہاری دوستی قبول نہیں۔ مجھے تمہاری دوستی قبول کر  
کے فخر ہوگا۔ تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا، صرف تمہارا  
علی" میں نے جواب دوبارہ پڑھا اور اسے اپنا کی آئی ڈی  
پر بھیج دیا۔

رہ رہ کر اپنا کا پرکشش چہرہ اور خوب صورت سراپا یاد  
آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سے بہت سی باتیں کروں۔  
اس کی آواز سنوں۔

میرا اندازہ تھا کہ اس کی طرح اس کی آواز بھی خوب  
صورت ہوگی۔ میں اپنا کے تصور میں اتنا کم تھا کہ دو دفعہ  
بانک ایک کار اور وہ مین سے ٹکراتے ٹکراتے بنی۔ وہ مین والا  
مجھے برا بھلا کہتا ہوا چلا گیا۔

میں گھر پہنچا تو ابوکھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔  
وہاں غیر متوقع طور پر احسن کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت  
ہوئی۔

"یار! تم ہو کہاں؟" احسن نے پوچھا۔ "اور سیل فون  
رکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ تم نے میری کال بھی ریسپونڈ نہیں کی۔"  
"میرا سیل فون سائینٹ پر تھا۔" میں نے جھوٹ گا  
سہارا لیا۔ "چلو، تم کھانا تو کھاؤ۔"

جاسوسی ڈائجسٹ - 228 - مئی 2014ء

کھانے کے بعد میں نے سیمہ کو چائے کے لیے کہا  
اور احسن کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ پہلے میں نے  
سوچا کہ احسن کو سب کچھ بتا دوں لیکن یہ سوچ کر یہ خیال  
ترک کر دیا کہ احسن فضول میں نہ صرف میرا مذاق اڑائے گا  
بلکہ ممکن ہے وہ یہ بات دوسروں کو بھی بتا دے۔ وہ اس بات  
کو کبھی سنجیدگی سے نہ لیتا کہ امریکا کی ایک ٹیکسٹ سینٹر مجھ سے  
دوستی کی خواہش مند ہے۔ میں نے احسن کو ادھر ادھر کی  
باتیں کر کے ٹال دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ احسن میرے ساتھ  
تخلص نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ اپنا سے دوستی کی اس کے  
نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی  
اس دوستی کو اہمیت نہ دیتا۔

احسن کے جانے کے بعد میں دوبارہ لاؤنج میں آ گیا  
اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب مجھے  
انٹرنیٹ ڈیوائس لگوانا چاہیے۔

☆☆☆

میں نے اپنی سیل کھولی تو اپنا کا جواب موجود تھا۔ اس  
کے علاوہ میرے دو دوستوں کی امی میلو بھی موجود تھیں۔ اور  
انگلیش میں تھا اور سعید امریکا میں۔ میں نے سب سے پہلے  
اپنا کی سیل دیکھی۔ جیسے جیسے میں اس کی سیل پڑھتا گیا، میرا  
دوران خون تیز ہوتا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرا چہرہ  
بھی سرخ ہو رہا ہوگا۔ اپنا نے لکھا تھا۔ "ڈیزر فرینڈ! مجھے خوشی  
ہوئی کہ تم نے میری دوستی کی آفر قبول کر لی۔ میں تم سے  
انتہائی اہم کام لینا چاہتی ہوں۔ معاملہ کروڑوں ڈالرز کا  
ہے۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں؟ مجھے نہ جانے کیوں لگتا  
ہے کہ تم قابل اعتبار آدمی ہو۔ میرے پاس خطیر رقم ہے۔  
میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس رقم کو کس منافع بخش  
کاروبار میں لگاؤں؟ آج کے دور میں کسی پر اعتبار کرنا کتنا  
مشکل ہے، یہ تم بھی جانتے ہو گے۔ میرے اردگرد بھی لاپٹی  
اور ہوس کے مارے لوگ ہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل تنہا  
ہوں۔ والدین، بہن بھائی، کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تم  
خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کتنی بڑی مصیبت میں مبتلا  
ہوں۔ یہاں کے لوگوں پر تو مجھے بالکل اعتبار نہیں ہے۔ تم پہ  
اعتماد کر کے میں ایک جو اٹھیل رہی ہوں۔ اس کے باوجود نہ  
جانے مجھے کیوں یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں  
پہنچاؤ گے۔ ہم پاکستان میں جو بھی کاروبار کریں گے، اس  
میں تم فنڈ پر سنٹ کے حصے دار ہو گے۔ اب اگر تم راضی ہو تو  
مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ بھیج دو تا کہ رقم میں تمہارے اکاؤنٹ  
میں منتقل کر سکوں۔ اگر تمام امور طے پائے تو میں اس ماہ

میں ہفتے میں پاکستان آؤں گی... تمہاری اپنی اپنا۔"  
اس کی امی سیل کو میں نے کئی دفعہ پڑھا لیکن میری  
سمجھ میں نہ آ سکا کہ اپنا آخر چاہتی کیا ہے۔ امی سیل کے  
ساتھ اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔  
میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کوئی کروڑ پتی لڑکی  
اپنی بھولی یا اتنی تنہا ہو سکتی ہے کہ اسے پوری دنیا میں کوئی ایسا  
آدمی نہیں ملا جس پر وہ اعتبار کر سکے۔ پھر اسے سرمایہ کاری یا  
پرز کا چکر چلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ خود ٹیکسٹ تھی تو  
اسے محفوظ سرمایہ کاری کے طریقے بھی معلوم ہوں گے۔ پھر  
وہ امریکا چھوڑ کر پاکستان ہی میں سرمایہ کاری کیوں کرنا  
چاہتی تھی؟

میں نے سوچا کہ اپنا اکاؤنٹ نمبر اسے بھیج دیتا  
ہوں۔ بھلا اس سے مجھے کیا فرق پڑے گا؟ میرے  
اکاؤنٹ میں کون سے لاکھوں روپے تھے۔ اس میں مشکل  
سے ڈیڑھ دو ہزار روپے ہوں گے۔ وہ مجھے مالی طور پر کیا  
نقصان پہنچا سکتی تھی۔

میری چیک بک میز کی دراز ہی میں ہوتی تھی۔ میں  
نے اپنا اکاؤنٹ نمبر نوٹ کر لیا، پھر اپنا کو لکھا۔ "ڈیزر اینا! دو  
ہی دن میں تم سے عجیب سا اپنایت کا رشتہ استوار ہو گیا ہے۔  
میری طرف سے تم بے فکر ہو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد  
کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ تمہاری آمد کا  
میں نے ابھی سے انتظار شروع کر دیا ہے، مجھے تمہارے  
جواب کا شدت سے انتظار رہے گا، تمہارا اور صرف تمہارا  
علی۔"

اپنا کو امی سیل کرنے کے بعد میں نے کمپوزنگ  
ڈاؤن کیا اور اردگرد دیکھا۔ ایک دو کے علاوہ دفتر کے تمام  
لوگ جا چکے تھے۔ صرف مسعود صاحب موجود تھے۔ وہ بھی  
اب اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ اب میں اپنا کے بارے میں احسن  
کو سب کچھ بتا دوں گا۔ رات کو کھانے کے بعد میں بانک  
لے کر احسن کی طرف چلا گیا۔ احسن ناتھ ناظم آباد میں رہتا  
تھا۔ مجھے دیکھ کر احسن کی والدہ اور بہنیں خوش ہو گئیں۔

"بہت دن بعد چکر لگایا علی بیٹا!" خالہ نے کہا۔ میں  
احسن کی امی کو خالہ کہتا تھا۔

"بس خالہ..."  
"اب یہ مت کہیے گا علی بھائی کہ وقت نہیں ملتا۔ یہ  
جملہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔" احسن کی بہن سعدیہ منہ بنا کر  
بولی۔ وہ سیمہ کی ہم عمر تھی۔

جاسوسی ڈائجسٹ - 229 - مئی 2014ء

"نہیں، وقت تو ملتا ہے لیکن آفس سے واپس آنے  
کے بعد اتنی تھکن ہوجاتی ہے کہ..."  
"میں بل کر پانی بھی نہیں پیتا۔" سعدیہ نے ٹکڑا  
لگایا۔

اسی وقت احسن آ گیا اور بولا۔ "تو کب آیا؟ میں تو  
ابھی تیری ہی طرف جانے والا تھا۔"  
میں کچھ دیر خالہ کے پاس بیٹھا پھر احسن کے ساتھ  
لان میں جا بیٹھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے احسن کو اپنا اور  
اس کی امی میلو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔  
احسن بے ساختہ ہنسنے لگا۔ پھر وہ ہنسی ضبط کر کے بولا۔  
"واہ یار! یہ تو "جوک آف دی ایئر" ہے۔"

"یار! میں تجھ سے مشورہ مانگ رہا ہوں اور توبات کو  
مذاق میں اڑا رہا ہے۔"

"گو یا آپ سنجیدہ ہیں؟" احسن نے طنزیہ لہجے میں  
کہا۔ "یار! تو کیا عقل سے بالکل ہی پیدل ہو گیا ہے؟"  
احسن پھر ہنسنے لگا۔ "ایک کروڑ پتی دوشیزہ، حسن و جمال میں  
یکتا، امریکی بینک کی ایک افسر امریکا اور یورپ چھوڑ کے  
پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا چاہتی ہے؟ وہ بھی ایک ایسے  
تخصص کے ساتھ جسے وہ جانتی بھی نہیں ہے، کیا بکواس ہے  
یار؟"

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ "یار!  
میں نے اس پر کب اعتبار کر لیا ہے؟"  
"میں تجھے اتنا گھماڑ سمجھتا بھی نہیں۔" احسن نے منہ  
بنا کر کہا۔

"یار! اگر اپنا فراڈ بھی ہے تو اس ایڈوچر میں حرج ہی  
کیا ہے؟"

"یعنی اب بھی آپ کے دل میں کہیں یہ خواہش  
خواہیدہ ہے کہ ممکن ہے وہ سینہ فراڈ نہ ہو؟" احسن نے  
تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ "اور کیا ضروری ہے کہ وہ کوئی  
حسینہ ہی ہو، اپنا کے پردے میں کوئی ٹیکرو بھی تو ہو سکتا  
ہے؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ اپنا زیادہ جو کوئی بھی ہے، سچ  
بول رہی ہے مگر میں نے اسے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیا ہے۔"  
"کیا؟" احسن چونک کر بولا۔ "پہلے تو مجھے صرف  
شبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ تیری عقل واقعی خطہ ہو گئی  
ہے۔ گھماڑ آدمی، اس فراڈ کو اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر دینے کی  
کیا ضرورت تھی؟" پھر احسن چڑ کر بولا۔ "اب یہ مت کہنا  
کہ میں بھی اپنا سے مذاق کر رہا ہوں۔"

”یار! بات تو یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یوں بھی میرے اکاؤنٹ میں مشکل سے ڈیڑھ دو ہزار روپے ہی ہوں گے۔ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا ہی نہیں سکتی۔“

”پھر تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہا ہے؟“ احسن نے سرد لہجے میں کہا۔

”تو مرچیں کیوں چہار ہا ہے؟“ میں نے کہا۔

”تیرے اس کارنامے کے بعد کیا میں خوشی سے ناچوں؟“ احسن نے مجھے گھورا۔ ”بس اب اس کی کسی اور ای میل کا جواب مت دینا۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میں احسن سے مزید بات کرتا تو وہ مزید طنز کرتا، میرا مذاق اڑاتا۔

دوسرے دن بھی میں وقت سے کچھ پہلے آفس پہنچ گیا اور جاتے ہی اپنا کمپیوٹر سسٹم آن کر دیا۔ توقع کے مطابق ایٹا کی ای میل موجود تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ مجھے تمہارا اکاؤنٹ نمبر مل گیا ہے۔ مجھے چند روز کے لیے اٹنی جانا ہے اس لیے کچھ دن تم سے رابطہ نہ ہو سکے گا۔ میں نے تمہارے ملک میں برنس کرنے کا پلان تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسلام آباد میں اپنا ہیڈ آفس قائم کریں۔ میں پاکستان میں ایک ٹی وی چینل اور موبائل کمپنی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے جگہ کا بندوبست تمہیں کرنا ہوگا۔ یہ تو ہمارے برنس کا ایک خاکہ سا ہے۔ میں اٹنی سے واپس آنے کے بعد یہ منصوبہ تقریباً مکمل کر لوں گی۔ اس دوران میں تم اچھی طرح سوچ سچھ لو۔ اب ایک ہفتے بعد رابطہ ہوگا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔“ آخر میں اس نے لکھا تھا۔ ”تمہاری اور صرف تمہاری ایٹا۔“

ای میل پڑھ کر مجھے عجیب سا لگا کہ کوئی حسین امریکی دو شیزہ مجھے اس انداز میں بھی مخاطب کر سکتی ہے۔ اب مجھے احسن کا خیال درست ہی لگ رہا تھا کہ ایٹا کے پردے میں کوئی ضیاع مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ میں بھی اسے ایسا جواب دوں گا کہ وہ تھملا کر رہ جائے گی، یا رہ جائے گا۔

تین دن کی اعصابی کشیدگی کے بعد اس دن مجھے خاصا سکون ملا۔ اس دن میں نے پہلے کی طرح دل لگا کر کام کیا اور ایٹا کے آسیب کوڈ ہن سے جھٹک دیا۔

دوسرے دن صبح جو گنگ کرتے ہوئے احسن سے ملاقات ہوئی لیکن میں نے ایٹا کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

جب ہم جو گنگ کر کے واپس جا رہے تھے تو احسن

نے پوچھ ہی لیا۔ ”علی! اس بینکر حسین کی کوئی ای میل آئی؟“ میں نے چونک کر احسن کی طرف دیکھا۔ احسن کے چہرے پر تضحیک یا طنز کا کوئی اثر نہیں تھا۔

”آئی ہے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ احسن نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا تو میں بولا۔

”یار! اس مرتبہ تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ پاکستان میں ایک ٹی وی چینل اور موبائل فون سروس کمپنی قائم کرنا چاہتی ہے۔ کچھ دن مجھ سے رابطے میں نہیں رہے گی کیونکہ وہ اٹنی جا رہی ہے۔“

احسن بے اختیار قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یار! یہ گورے ہم لوگوں کو پتھر کے زمانے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ ٹی وی چینل یا موبائل فون کمپنی کوئی دو چار لاکھ میں قائم ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے اربوں روپیا چاہیے۔۔۔ اربوں۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”یہ بھی کتنی احمقانہ بات ہے کہ وہ اٹنی جا رہی ہے اس لیے رابطے میں نہیں رہے گی، یار! بقول تیرے وہ بینک میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے اپنے آفس سے بلکہ دنیا بھر سے رابطے میں رہنا بہت ضروری ہے۔ اب تو لپ ٹاپ اتنے عام ہو گئے ہیں کہ وہ عام آدمی کی دسترس میں ہیں۔ کیا ایٹا کے پاس لپ ٹاپ نہیں ہوگا؟ اب تو ایسے میل فون بھی مارکیٹ میں آگئے ہیں جن پر ہر قسم کی سہولت میسر ہے۔“

پھر کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ میں نے ایٹا کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

چھ دن بعد میں نے اپنے کام نمٹا کر اپنا میل بکس چیک کیا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہاں ایٹا کی ای میل موجود تھی۔ میں نے اس میل کو کھولا تو میری سانسوں کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”پیارے علی! میں اٹنی کے کامیاب دورے کے بعد ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچی ہوں۔ میں نے یہ دن جس کرب میں گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ شاید تم بھی بے چین ہو گے۔ اب میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس بات کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کرو گے۔ میں بینکر تو ضرور ہوں لیکن اتنی دولت مند نہیں ہوں لیکن تمہاری مدد سے ہم دونوں کروڑ پتی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے بینک میں عراق کے ایک کروڑ پتی شخص کا اکاؤنٹ تھا۔ امریکا، عراق جنگ میں وہ عراقی کروڑ پتی اپنے خاندان سمیت مارا گیا۔ بینک نے کئی مرتبہ اس سے رابطے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل

کیں تو اس کی موت کا انکشاف ہوا۔ اکاؤنٹ کے وارثوں میں اس کی بیوی اور بیٹے کا نام تھا لیکن وہ دونوں بھی اس جنگ میں مارے گئے۔ عراقی کے اکاؤنٹ میں چار کروڑ سے زائد کی رقم ہے۔ وہ اکاؤنٹ لاوارث ہے۔ اب تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اس عراقی عباد المصطفیٰ کی وراثت کا دعویٰ کرنا ہوگا۔ میں نے تمہیں اس کام کے لیے یوں منتخب کیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ تم مجھے میل کرو گے کہ میں عباد المصطفیٰ کا وارث ہوں۔ اس قسم کے تمام اکاؤنٹس میں ہی ڈیل کرتی ہوں۔ ہر بینک بینکنس کا کوئی نہ کوئی وارث نکل ہی آتا ہے لیکن کئی ماہ کے باوجود اس عراقی کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا۔ تمہاری میل ملتے ہی میں رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گی۔ میں یہاں کا کام سمیٹنے کے بعد ہی پاکستان آؤں گی۔ اس دوران میں تم ایک مرتبہ پھر میری آفر پر اچھی طرح غور کر لو۔ بس اتنا دھیان رکھنا کہ جب تک کام شروع نہ ہو جائے، کسی کو ہرگز نہ بتانا، صرف تمہاری ایٹا۔“

یہ میل پڑھ کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب یہ معاملہ کچھ سنجیدہ بلکہ خطرناک رخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ مجھے فوری طور پر اس معاملے سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ مجھے اس تمام معاملے میں بددیانتی اور جرم کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میں گھر جا کر بھی مسلسل اسی معاملے پر غور کرتا رہا۔ میں نے لاکھ اس معاملے کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ایٹا سے کہہ دوں گا کہ میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے دوسرے دن میں جو گنگ کے لیے بھی نہ جا سکا۔ اس دن آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن آفس میں ایک اہم میٹنگ تھی اس لیے جانا ضروری تھا۔

میں ناشا کر ہی رہا تھا کہ احسن آگیا۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ ”علی! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہار یار! طبیعت ٹھیک ہے، بس صبح آنکھ دیر سے کھلی۔۔۔“

”احسن بیٹا! ناشا کر لو۔“ امی نے کہا۔

”ناشا تو میں نے کر لیا ہے، بس ایک کپ چائے پیوں گا۔“ احسن نے کہا۔

چائے پیتے ہوئے میں بالکل خاموش تھا۔ پہلے میں

نے سوچا کہ احسن کو ایٹا کی میل کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر مجھے ایٹا کی ہدایت یاد آگئی۔

”کن سوچوں میں گم ہے علی؟“ احسن نے اچانک پوچھا۔ ”کیا اب کوئی نئی ای میل موصول ہوئی ہے؟“

ای میل کے نام پر میں بُری طرح چونکا اور جلدی سے کہا۔ ”نہیں یار! اس کی طرف سے کوئی ای میل نہیں ملی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ابو اور سیمادوں جاچکے تھے اور امی کچن میں مصروف تھیں۔

پھر احسن نے مجھے ایٹا کے بارے میں کریدنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

اس کے رخصت ہونے کے بعد میں بھی آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔ پھر آفس کے کاموں اور میٹنگ کی وجہ سے سچ تک مصروف رہا۔ سچ کے بعد میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی میل چیک کر لی۔ آج ایٹا کی کوئی میل نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

پانچویں دن مجھے ایٹا کی ایک اور ای میل ملی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ڈیزر علی! مجھے یقین ہے کہ تم نے اب تک فیصلہ کر لیا ہوگا کہ تم میرے ساتھ کام کرو گے۔ عباد المصطفیٰ کا بینک بینکنس چار کروڑ ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھری تو میں دوسرے ہی دن تمام رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گی۔ تمہارے جواب کا بے تابی سے انتظار کروں گی، تمہاری اور صرف تمہاری ایٹا۔“

ای میل پڑھ کر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اس کی دھمک مجھے اپنے کانوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ سرد موسم کے باوجود میرا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا تھا اور سانس بُری طرح پھول گیا تھا۔ میں نے رومال سے چہرے کا پسینا خشک کیا اور سامنے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

”علی صاحب! مسعود صاحب کی آواز سن کر میں بُری طرح چونکا اور گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

”سر! آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بوجھل تھی۔“ میں نے کہا۔ مسعود صاحب نے جانے کب سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ ”اب شاید مجھے بخار بھی ہو گیا ہے۔“

”او ہو، آپ آج چھٹی کر لیتے۔“ مسعود صاحب کے لہجے میں ہمدردی تھی۔





بھی اسی بینک میں تھا۔ بینک بند ہونے ہی والا تھا۔ میں نے چیک دیا تو یہ کہہ کر مجھے چیک لوٹا دیا گیا کہ دستخط میں فرق ہے۔ مجھے اس روز شدید ضرورت تھی۔ اس دوست سے دوبارہ دستخط کرانے یا دوسرا چیک لینے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے فیچر کی خوشامد کی کہ آپ ان صاحب سے ٹیلی فون پر بات کر لیں، کوئی مسئلہ ہے تو میرے سیل فون سے کال کر لیں یا میں خود اس دوست کا نمبر ملا دیتا ہوں۔ آپ اس سے تصدیق کر لیں لیکن میری طرح میرا دوست بھی چھوٹا سا اکاؤنٹ ہولڈر تھا اس لیے فیچر نے رعوت سے انکار کر دیا۔ مجھے اپنی وہ بے بسی اور توہین آج تک یاد تھی بلکہ میں جب بھی اس بینک فیچر کا منہوں چہرہ دیکھتا تھا، مجھے وہ وقت یاد آجاتا تھا۔

”فرمائیے علی صاحب! کیسے زحمت کی؟“ فیچر نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

”میں اپنا اکاؤنٹ بند کرنے آیا ہوں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”آ... آپ... کا مطلب ہے کہ... آپ...“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سر! ہم سے کوئی کوتاہی ہو گئی یا آپ کو بینک کی سروس سے کوئی شکایت ہے؟“ فیچر بوکھلا کر بولا۔ کوئی پندرہ بیس لاکھ کا اکاؤنٹ بھی بند ہو جائے تو فیچر سے جواب طلب کر لیا جاتا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں تو چار کروڑ تھے۔

”مجھے بینک سے جو بھی شکایت ہے، وہ میں لکھ دوں گا۔“ میرا لہجہ پہلے کی طرح سرد تھا۔

اسی وقت بیون چائے لے کر آ گیا۔ فیچر نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ”اچھا، پہلے آپ چائے تو پی لیں۔“

”چائے پینے میں وقت ضائع مت کریں۔“ میں نے اس مرتبہ درشت لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اتنی رقم بینک میں موجود نہیں ہوگی۔ آپ کو بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ فیچر کا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔ ”اصولاً تو آپ کو کم سے کم چوبیس گھنٹے پہلے اطلاع دینا چاہیے تھی۔“

”وحاٹ ڈویوٹن مسٹر فیچر؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”سر! آپ کو کوئی شکایت ہے تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کو...“

”پلیز!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ میرا اکاؤنٹ بند کر دیں۔“ پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ”اوکے، آپ مجھے لکھ دیں کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے آپ ادائیگی نہیں کریں گے۔“ اب میرا انداز جارحانہ تھا۔ ”میں ابھی آپ کے ہیڈ آفس بات کرتا ہوں۔“

”میں آپ کو بارہ گھنٹے میں ادائیگی کر دوں گا۔“ فیچر نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اکاؤنٹ بند مت کریں۔ دو چار لاکھ اس میں چھوڑ دیں۔“

”اوکے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں اکاؤنٹ بند نہیں کروں گا لیکن مجھے پانچ بجے سے پہلے کیش چاہیے۔ اس وقت دس بجے ہیں۔ سات گھنٹے بہت ہیں۔“

فیچر کچھ سوچتا رہا، پھر اسی طرح مرے مرے انداز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔“

”کوشش نہیں، مجھے کیش چاہیے۔“ میں نے درشتی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ ساڑھے چار بجے تک آجائیں۔“

خطرہ تو میں نے مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چار کروڑ روپے کا تصور بھی سحر انگیز تھا۔ اتنی رقم میں زندگی بھر تو کیا، دو زندگیوں میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ میں نے تو اس سے پہلے ایک مشٹ صرف ایک لاکھ روپے دیکھے تھے۔ وہ بھی میرے اپنے نہیں تھے۔

یہی سوچتا ہوا میں گھر آ گیا۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ باہر سے بھی کھلتا تھا۔ اس لیے میں اس دروازے سے گھر میں داخل ہوتا تو کسی کوکانوں کان خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی دن کے وقت گھر میں سوائے امی کے اور ہوتا بھی کون تھا۔

میں باہر والے دروازے سے گھر میں داخل ہوا تاکہ امی زیادہ سوال جواب نہ کریں۔

میں یکسو ہو کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے فیچر سے کیش کے لیے کہا تھا۔ مجھے تو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ چار کروڑ کی رقم کتنی جگہ گھیر لے گی؟ میں بینک سے اسے کیسے لاؤں گا؟ پہلے میں نے اپنا بریف کیس خالی کیا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بریف کیس اتنے کیش کے لیے ناکافی ہوگا۔ مجھے اس کا کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔

اس دوران میں میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں بھی کرسی نوٹ دیکھے۔ نوٹ برف کے گالوں کی طرح

آسمان سے گر رہے تھے اور میرے ارد گرد اٹھتے ہوتے جا رہے تھے۔ میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سوا چار بج رہی تھی۔

میں نے اپنی بانک وہیں چھوڑی اور دونوں سوٹ کیس لے کر مین روڈ تک آ گیا۔ جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں ٹیکسی کے ذریعے چارج کر چالیس منٹ پر بینک پہنچ گیا۔

فیچر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ”علی صاحب! ایک مرتبہ پھر سوچ لیں۔ آج کل حالات ٹھیک

**قارئین متوجہ ہوں**

**پرچا نہیں ملتا**

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خدایا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **ممکن ہونے پر بک اسٹال کا PTCL یا سہولت فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

**نعر عباس**

03012454188

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**

**سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرت**

63-ف 63-35804200

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو پیو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم وائٹ، نارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کو اتنی خطیر رقم دے دی۔ ہاں، مجھ سے یہ ضرور پوچھا جاسکتا تھا کہ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ سب سے بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ میرے پاس اس رقم کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ سوچے سوچے اچانک مجھے اپنے ایک دوست شہباز خان کا خیال آیا۔ وہ پشاور کا رہنے والا تھا اور تعلیم کے لیے کراچی آیا تھا۔ یونیورسٹی ہی میں اس سے میری دوستی ہوئی تھی۔ پھر یہ دوستی نے نظمی میں بدل گئی تھی۔ شہباز خان شکار کا دلدادہ تھا۔ میں اکثر اس کے ساتھ شکار پر اندرون سندھ بھی چلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان حالات میں شہباز خان ضرور میری مدد کرے گا۔ میں نے دوسرے دن پشاور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور دوسرے دروازے سے گھر میں داخل ہوا۔ امی کو بالکل علم نہیں ہوا تھا کہ میں سارا دن گھر میں رہا ہوں۔

کھانے کے بعد میں نے امی سے کہا۔ ”امی! میں اپنے ایک دوست کی شادی میں لاہور جا رہا ہوں۔“

امی نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ”کس دوست کی شادی ہے؟“

میں امی کے سوال پر کچھ بولہلا سا گیا۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی امی نے کہا۔ ”اچھا... اچھا، میں سمجھ گئی۔ تم اختیار کی شادی میں جا رہے ہو۔“

”جی امی!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”بھائی! اختیار بھائی نے ہم لوگوں کو شادی میں نہیں بلایا؟“ سیمانے منہ بنا کر کہا۔

”اس نے تو پوری فیملی کو بلا یا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ امی نہیں جائیں گی اس لیے...“

”ہاں بیٹا،“ امی نے کہا۔ ”میں اتنا لباسز کبھی نہیں سکتی۔“

اختیار اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا پھر میٹرک کے بعد اس کے والد کا ٹرانسفر پنجاب کی طرف ہو گیا تھا۔ اس سے ٹیلی فون پر رابطہ رہتا تھا۔ آجسن سے بھی اس کی دوستی تھی لیکن مجھ سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی۔ میں نے اختیار کا نام لے تو دیا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ امی کے پاس بھی اس کا نمبر تھا۔ وہ اسے شادی کی مبارک باد دینے کے لیے ٹیلی فون بھی کر سکتی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون پر لاہور جانے

نہیں ہیں۔ آپ اتنا کیش لے کر...“

”مجھے صاحب!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے خود ہی کسی کو اطلاع دے دی ہو کہ...“

”آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں؟“ منجر نے میری بات کاٹ دی۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا درشت تھا۔

”میں الزام نہیں لگا رہا ہوں بلکہ... خیر چھوڑیں...“

آپ کیش منگوائیں۔“ میں نے چیک لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

”میں وعدے کے مطابق اکاؤنٹ بند نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے چھوڑ دیے ہیں۔“

”تھینک یو علی صاحب!“ منجر نے کہا۔

پھر جب تک میں نے چائے گم کی، بینک کا ایک ملازم کیش لے آیا۔

میں نے نوٹوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب استعمال شدہ نوٹ تھے۔ ابھی میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ بینک کا وہی ملازم ایک دفعہ پھر مزید کیش لے کر آ گیا۔

میں نے دل ہی دل میں خود کو سراہا کہ میں رقم کے لیے دوسوٹ کیس لایا تھا۔

تمام رقم آرام سے ان دونوں سوٹ کیسوں میں سما سکتی تھی۔

”سر! آپ نے کوئی بزنس شروع کر دیا ہے؟“ منجر اپنے تجسس سے مجبور ہو کر بولا۔

”ابھی تو نہیں کیا ہے لیکن جلد ہی اپنا کاروبار شروع کر دوں گا۔“ میں نے کہا اور رقم دونوں سوٹ کیسوں میں رکھ کر انہیں لاک کر دیا۔

میں دونوں سوٹ کیس لے کر بینک سے باہر نکلا تو آنے جانے والا ہر شخص مجھے مشتربگ رہا تھا۔ دونوں سوٹ کیسوں کا وزن بھی اچھا خاصا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وزن میرے ذہن پر تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔

میں باہر کے دروازے سے گھر میں داخل ہوا اور دونوں سوٹ کیس بیڈ کے نیچے رکھ دے۔

میں نے یہ قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن اب مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ جب اپنا پاکستان پہنچے تو اس کا رول کیا ہوگا؟ وہ قانونی طور پر تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ دنیا کی کوئی عدالت اس کے اس بیان کو تسلیم نہ کرتی کہ اس نے مجھ اجنبی

والی فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا۔ لاہور کے لیے ایک فلائٹ صبح نو بجے اور دوسری دوپہر ساڑھے بارہ بجے تھی۔ میں نے صبح کی فلائٹ سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے سوٹ کیس میں نوٹوں کے ساتھ اپنے کپڑوں کے دو تین جوڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی رکھ لیا تھا۔ میں نے ایک سوٹ کیس سے نوٹوں کی ایک گڈی بھی نکال لی تھی۔ میں نے رات ہی کو ایک ٹریولنگ ایجنسی سے لاہور کا ٹکٹ خریدا تھا اور اپنی سیٹ کنفرم کرائی تھی۔

یہ تو قسمت ہے کہ اس دن احسن نہیں آیا ورنہ وہ مجھ سے افتخار کے بارے میں ہزاروں سوالات کرتا اور اسے مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔

دوسرے دن علی الصباح میں امی اور سیمہ سے مل کر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میں لاہور پہنچا تو دن کے گیارہ بجے تھے۔ ایئر پورٹ سے میں سیدھا ہوٹل پہنچا۔ یہ صاف ستر ہوٹل تھا۔ میں جان بوجھ کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں ٹھہرا تھا۔

میں نے نہا دھو کر ہوٹل کی روم سروس سے کھانا منگوا لیا۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ افتخار لاہور ہی میں تو رہتا ہے، مجھے اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اس کا سیل نمبر میرے پاس موجود تھا۔

میں نے کھانے کے بعد افتخار کا نمبر ملا لیا۔ چند لمبے بعد افتخار کی آواز میرے کانوں سے گرائی۔ ہاں بھی علی! کیسے فون کیا؟

”یار! میں لاہور آیا ہوا ہوں اور ہوٹل ڈی کس میں ٹھہرا ہوں۔“

”کیا، جب یہاں گھر موجود ہے تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا تک ہے؟“ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”افتخار... میری بات...“ لیکن وہ سلسلہ منقطع کر چکا تھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔

”پہلے تو بغیر اطلاع کے لاہور آیا پھر ہوٹل میں ٹھہر گیا۔“ افتخار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”یار! حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں...“

”کیسے حالات؟“ افتخار نے میری بات کاٹی۔

”میں آج کل بہت پریشانی میں مبتلا ہوں یار۔“

میں نے کہا۔ ”پولیس میرے پیچھے ہے اور وہ کسی بھی وقت

مجھے گرفتار کر سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تجھے یا اکل کو کسی قسم کی پریشانی ہو۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

”او بھائی! تو نے کوئی قتل کر دیا ہے؟ کسی بڑی شخصیت یا اس کے بچے کو اغوا کر لیا ہے؟ ایسی کیا آفت آئی ہے؟“

”کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو نے اگر دس قتل بھی کیے ہیں تو فکرمات کر، میں تجھ پر آج نہیں آنے دوں گا۔“ افتخار نے کہا۔ ”تو یہاں سے تو چل۔“

”یار! مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے امی کو بتایا تھا کہ میں افتخار کی شادی میں لاہور جا رہا ہوں۔“

”میری شادی میں؟“ افتخار خوش دلی سے ہنسا۔

”ہاں یار! امی کو ابھی ان معاملات کا علم نہیں ہے۔ میں قبل از وقت انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

افتخار کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے پرخیاں انداز میں کہا۔ ”یار! آنٹی تو پولیس کو بتا دیں گی کہ تو میرے پاس آیا ہے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تجھے ایسی جگہ بھجوادوں گا کہ کسی کو تیرا سراغ نہیں ملے گا۔ چل اب اپنا سامان اٹھا اور یہاں سے نکل۔“

ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے کے بعد میں افتخار کے ساتھ اس کے بیٹکے پر گلبرگ آ گیا۔ اس کا آبائی گاؤں تو جہلم کے قریب تھا لیکن وہ خود کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں رہتا تھا۔

وہ دن میں نے افتخار کے بیٹکے پر گزارا۔ شام کو میں نے احسن کو کال کی۔

احسن نے فوراً کہا۔ ”علی! تم کہاں ہو... یوں اچانک کیوں غائب ہو گئے؟“

”یار! میں افتخار کی شادی میں آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور امی کو بتا کر آیا ہوں، اچانک تو غائب نہیں ہوا۔“

”دیکھ علی! احسن نے کہا۔“ تو اپنے جھوٹ سے آنٹی کو تو مطمئن کر سکتا ہے لیکن مجھے نہیں۔ مجھے سچ بتا دے کہ کیا بات ہے؟“

”میں سچ ہی کہہ رہا ہوں... میں افتخار...“

”افتخار کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔“ احسن نے میری

اس نے مجھ سے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ مجھے کراچی سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بس وہ میری مدد کو تیار ہو گیا تھا۔

شام کو میں افتخار کے ساتھ باہر نکلا۔ ابھی میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ تو اس وقت پیدا ہوتا جب اپنا پاکستان آجاتی۔ ابھی اس کی آمد میں تین دن باقی تھے۔

میں نے باہر نکلنے سے پہلے سوٹ کیس سے نوٹوں کی ایک اور گڈی نکال لی تھی۔ میں نے اپنے لیے ڈھیروں شاپنگ کر ڈالی۔ اپنے لیے پینٹ شرٹس اور بہترین قسم کے کرتہ شلوار کے علاوہ پرفیومز، شیونگ کی بیش قیمت کٹ، کلائی کی قیمتی گھڑی، مہنگا ترین سیل فون، جوتے، تھری پیس سوٹ اور اعلیٰ قسم کی ٹائیاں خریدیں۔ میں نے زبردستی افتخار کو بھی شاپنگ کرا دی۔

افتخار بھی حیران تھا کہ میں اتنی شاپنگ کیسے کر رہا ہوں؟ لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

شاپنگ کے بعد ہم لوگ لاہور کی سڑکیں نا پتے رہے۔ واپسی پر ہم نے بہترین سے ایک ریستورانٹ میں کھانا کھایا اور گھروٹ آئے۔

ڈرائنگ روم میں خوب روسا ایک نوجوان موجود تھا۔ اس نے افتخار کو سلام کیا۔ سرکی جنبش سے افتخار نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”یار بالے! تجھ سے ایک کام ہے۔“

”عالم کریں ملک صاحب!“ اس نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”ابھی الیکشن تو دور ہیں سرکار۔“

”یہ میرے دوست علی ہیں۔“ افتخار نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”کراچی سے آئے ہیں۔“

بالے نے مجھے بھی سلام کیا اور بولا۔ ”ملک صاحب! آپ کے دوست ہیں تو ہمارے لیے بھی قابل احترام ہیں۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔

”ان کے لیے کسی محفوظ جگہ کا بندوبست کرنا ہے۔ ایسی جگہ جہاں پرنڈہ بھی پر نہ مار سکے...“ افتخار نے تھکمانہ انداز میں کہا۔

”مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے ملک صاحب!“ بالے نے کہا۔

”علی!“ افتخار نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ اقبال ہے، بالے کے نام سے مشہور ہے۔ تم اس پر بھی اتنا ہی اعتماد اور بھروسہ کر سکتے ہو جتنا مجھ پر۔“ وہ بالے سے بولا۔ ”تم جا کر کسی جگہ کا بندوبست کرو۔ میں بعد میں تمہیں بلا لوں گا۔“

بات کاٹ دی۔ ”تو شاید بھول گیا کہ افتخار کا ایک بھائی وقار بھی ہے۔ ہمارے اس سے بھی تعلقات تھے۔ اس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔ افتخار کی شادی کی خبر پر وہ بھی حیران تھا۔“ پھر وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”علی! اب مجھے سچ سچ بتا دے۔ کہیں تو نے اپنے اکاؤنٹ سے کیش تو نہیں نکال لیا؟“

”ہاں یار!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے اپنے اکاؤنٹ سے تمام کیش نکال لیا ہے۔“

”ٹٹ!“ احسن نے کہا۔ ”یہ تو نے کیا حماقت کی ہے؟“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”اب تو پہلی فرصت میں اپنی سم بدل دے اور وہ نمبر مجھے ضرور بتا دیتا۔“

”کیوں، کوئی براہم ہو گیا ہے کیا؟“

”ابھی تو براہم نہیں ہوا ہے۔ میں احتیاطاً ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔“

افتخار کمرے میں آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”یار! مجھے موبائل فون کی کوئی سم منگوا دے۔“

”پہلے میں تجھے کسی محفوظ مقام پر بھیج دوں۔“ افتخار نے کہا۔ ”ہمارا ایک کارندہ ہے اقبال۔“ افتخار نے کہا۔

”اب تجھ سے کیا چھپانا، وہ ہمارے لیے قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کے کام کرتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی کھڑی فصلوں میں آگ لگاتا ہے، ان کے آدمیوں کو اغوا کرتا ہے، الیکشن کے دوران ہمارے مخالفین کے جلسے درہم برہم کرتا ہے اور ہمارے اشارے پر کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔“

میں نے غور سے افتخار کو دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے اس افتخار سے بالکل مختلف نظر آیا جو میرا دوست تھا۔ میرے سامنے ایک سفاک اور ظالم جاگیردار اور صنعت کار بیٹھا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اس کے پاس کیوں آ گیا؟

”کیا سوچ رہا ہے علی؟“ افتخار نے مجھے چونکا دیا۔

”میں نے اقبال کو بلا لیا ہے۔ تو اس کے ساتھ بالکل محفوظ رہے گا۔ میں بھی تجھ سے رابطے میں رہوں گا اور ملاقات بھی کرتا رہوں گا۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”اقبال میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ وہ مر جائے گا لیکن تجھ پر آج نہیں آنے دے گا۔“

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اب تو میں افتخار کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے ملازم سے موبائل کے دو تین سم کارڈز بھی منگوا لیے تھے۔

”یار! تو تو بالکل گم سم ہو کر رہ گیا ہے۔“ افتخار نے کہا۔ ”او یار! اب تجھے کوئی خطرہ نہیں ہے، بے فکر ہو جا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ اقبال نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ملک صاحب! پرانے شہر میں میرا ایک مکان ہے۔ وہ علاقہ تو اچھا نہیں ہے لیکن مکان میں ہر طرح کی سہولت ہے۔ علی صاحب کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

افخار نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”یار! مکان پرانے لاہور میں ہو یا ڈیفنس میں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ٹھیک ہے سرجی۔“ اقبال نے جواب دیا۔ میں اس مکان کو ٹھیک ٹھاک کرتا ہوں۔ صرف دس منٹ کے نوٹس پر علی صاحب کو اس مکان میں شفٹ کر سکتا ہوں۔“

میں نے اب تک اقبال کو یہ غور نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے لباس اور بات چیت سے شریف اور مصوم لگ رہا تھا۔ اس کا قدر میا نہ لیکن جسم کسرتی اور مضبوط تھا۔ جلد کی رنگت سرخ و سفید تھی اور سر کے بال تقریباً غائب تھے۔ اس نے اومیگا کی قیمتی گھڑی باندھ رکھی تھی اور وہ سفید کلف دار شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔

”ٹھیک ہے بالے۔“ افخار نے کہا۔ ”تم اپنا سائل نمبر علی کو دے دو۔ اگر میں موجود نہ بھی ہوا تو یہ تم سے رابطہ کر لے گا۔“

اقبال نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور میرا سائل نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرنے کے بعد چلا گیا۔

”مجھے ابھی گاؤں جانا ہے۔ یہاں چاچا غلام حسین موجود ہے۔ تمہیں کوئی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا۔ ویسے تمہارے بیڈ روم میں ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر اور کمپیوٹر موجود ہے۔ فرنج میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو چاچا غلام حسین سے کہہ دینا۔ میں اب چلتا ہوں۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار روپے کے کئی نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ ”یہ رکھ لو۔“

”نہیں افخار۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”رکھ لے یار۔“ افخار نے زبردستی نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔ ”تجھے پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ چاچا غلام حسین بھی وہاں موجود تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے چاچا سے بولا۔ ”چاچا! مہمان کا خیال رکھنا۔“

”آپ فکر مت کریں ملک صاحب! میں علی صاحب

کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے غلام حسین سے کافی لانا کو کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ چاچا غلام حسین فوراً ہی کافی لے آیا۔

میں نے ٹی وی کھول کر مختلف نیوز چینلز دیکھے لیکن وہاں کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ پھر میں کمپیوٹر پر جا بیٹھا۔ میں نے اپنی میل کھولی تو ایک میل دیکھ کر میرا دل بے اختیار بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ اپنا کی میل تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ میل پڑھنا شروع کی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ڈیئر علی! میں نے تمہیں اس سے بل بھی ایک میل بھیجی تھی لیکن تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ میرا کام خلاف توقع چند دن پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ میں کل رات کی فلائٹ سے پاکستان آ رہی ہوں۔ یعنی پاکستان میں اس وقت رات بلکہ صبح کے چار بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ریسیو کرنے اور رپورٹ ضرور آؤ گے۔ ہاں، اپنا سائل نمبر مجھے بھیج دو۔“

میرے ہاتھ پیروں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گویا وہ گھڑی آگئی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔

میں نے فوراً اپنی نئی سم سے احسن کا نمبر ملا یا۔ کئی گھنٹیاں بچتے کے بعد احسن کی بھاری آواز سنائی دی۔ ”ہیلو!“

”احسن! میں...“

”ہاں علی! احسن نے کہا۔ ”سب خیریت ہے نا؟“

”یار وہ اپنا وقت سے پہلے ہی یعنی کل صبح چار بجے کراچی پہنچ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”آنے دے۔“ احسن نے کہا۔ ”تو ہے کہاں؟“

”میں لاہور میں ہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو مجھے وہاں کے حالات سے آگاہ رکھنا اور امی ابو اور سیمہ کا خیال رکھنا۔ ہاں، تو میرا ایک اور نمبر بھی نوٹ کر لے۔ ممکن ہے میں یہ نمبر بھی آف کر دوں۔“

”اتنا پریشان مت ہو یار! علی نے کہا۔ ”تو نے تو قبل از مرگ ہی واویلا شروع کر دیا۔“

”میں واویلا نہیں کر رہا ہوں اور تو ذرا آسان اور سلیس اردو میں بات کیا کر۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ قبل از مرگ کیا ہوتا ہے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تو کچھ زیادہ ہی ٹینشن میں ہے۔“ احسن ہنس کر بولا۔ ”قبل از مرگ کا مطلب ہے موت سے پہلے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”یار علی! کیا میں

صبح از رپورٹ چلا جاؤں؟ میں بھی ایک نظر دیکھ لوں گا کہ وہ اپنا ہے یا ہارلم کا کوئی جوزف؟“

”تو اپنا کو بیچانے کا کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اندازے سے اسے پہچان لوں گا۔ کوئی خوب صورت امریکن دو شیزہ اگر کسی کو تلاش کر رہی ہو تو وہ زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔“

”جیسے تیری مرضی۔“ میں نے کہا پھر رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب مجھے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ زیادہ امکانات تو یہی تھے کہ اپنا میری تلاش میں دھکے کھا کر واپس چلی جاتی۔ میں نے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ لے دے کر اس کے پاس صرف میری امی مل سکتی تھیں۔ ان سے میری لوکیشن کے بارے میں معلوم ہونا ممکن نہیں تھا۔ نہ میں نے اسے اپنا سائل نمبر دیا تھا، نہ گھر کا ایڈریس۔ اس کے پاس تو میری تصویر بھی نہیں تھی۔ میں فضول میں اس سے خوف زدہ تھا۔

میں کچھ دیر بیٹھائی وی کے چینلز بدلتا رہا پھر میں نے ٹی وی آف کر دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور چاچا غلام حسین اندر داخل ہوا۔ ”صاحب جی!“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کھانا آپ یہیں کھائیں گے یا ڈائننگ روم میں لگا دوں؟“

”ڈائننگ روم میں لگا دو چاچا۔“ میں نے کہا۔ ”میں بس ابھی آرہا ہوں۔“

قوض جاں

فون اٹھالیا۔ سائل فون کی اسکرین پر احسن کا نام دیکھ کر میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

”ہاں احسن!“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”یار! میں اس وقت از رپورٹ پر موجود ہوں۔ ابھی تک مجھے اپنا دکھا ہی نہیں دی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی امریکن دو شیزہ جس پر اپنا کا شبہ کیا جائے۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”تیرے سائل فون میں کریڈٹ ہے تو آن لائن رہ۔ میں آنے والے مسافروں کو دیکھتا ہوں۔“

”میرے کریڈٹ کی فکر مت کر۔“ میں نے کہا۔

”میرے سائل فون میں بہت کریڈٹ ہے اور اضافی کارڈز بھی ہیں۔“

احسن خاموش ہو گیا لیکن مجھے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

”اجانک احسن کی آواز آئی۔“ خوب صورت سی ایک امریکن لڑکی باہر نکلی ہے۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی ہے۔ ”احسن گویا رنگ گنٹری کر رہا تھا۔“ ارے...“

”کیا ہوا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”اس خوب صورت دو شیزہ کے ساتھ ایک دراز قد امریکن بھی ہے۔ اس نے بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ لگتا ہے وہ امریکن کوئی نیور کیریٹ ہے یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا بڑا عہدے دار... عام امریکی عموماً جینز یا جیکٹ پہنتے ہیں۔“

”یہ تم نے فرض کر لیا ہے کہ...“

”میں نے فرض نہیں کیا ہے بلکہ میرا مشاہدہ ہے۔“

احسن نے جواب دیا۔ ”عام امریکی لباس کے سلسلے میں اتنا اہتمام نہیں کرتا ہے۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”ہم اس پر کیوں بحث کر رہے ہیں؟ آنے والی دو شیزہ اپنا نہیں ہو سکتی۔ اپنا تو تنہا آنے والی تھی۔“

میں پھر ملی جلی آوازوں کا شور سننے لگا۔ شاید کوئی فلائٹ اسی وقت جانے والی بھی تھی۔

”اچانک پھر احسن کی آواز آئی۔“ علی! اسی وقت ایک اور دراز قد حسینہ ارا بیول لاؤنج سے باہر آئی ہے... لیکن... یہ کیا... اس کے ساتھ بھی ایک خوش لباس اور دراز قد امریکن ہے۔ وہ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں خاص طور پر نوجوانوں کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے...“

میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ احسن بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔

میں نے جھنجھلا کر سائل فون بستر پر اچھال دیا۔ بستر پر گرتے ہی سائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے لپک کر سائل

☆☆☆

ساری رات میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ میں سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند نہیں آئی۔ گھڑی نے چار بجائے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچا اب تک اپنا کی فلائٹ آچکی ہوگی۔ نہ جانے احسن از رپورٹ پہنچا یا نہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ پہنچا ہوگا تو از رپورٹ پر ہوگا۔

میں نے بے اختیار احسن کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ مجھے یہ سوچ کر مایوسی ہوئی کہ احسن از رپورٹ نہیں پہنچا ورنہ فوراً میری کال ریسیو کر لیتا۔ سائل فون کی بیل بج بج کر بند ہو گئی اور ریکارڈنگ سنائی دی۔ ”آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کال کریں، شکریہ۔“

میں نے جھنجھلا کر سائل فون بستر پر اچھال دیا۔ بستر پر گرتے ہی سائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے لپک کر سائل

جاسوسی ڈائجسٹ

اچانک وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ”وہ لڑکی میری ہی طرف آرہی ہے... وہ...“  
 پھر میرے کانوں میں مترنم سی ایک آواز آئی۔  
 ”میکسیوزی!“  
 ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا میڈم؟“ احسن نے انگلیوں میں پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔“ لڑکی کی آواز آئی۔ ”کیا... آپ...“  
 علی ہیں؟“

میرادل کنٹیپوں میں دھڑکنے لگا۔  
 احسن بھی کچھ بوکھلا گیا تھا۔ ”میں... آپ کا مطلب ہے کہ میں... علی... نہیں میڈم! میں علی نہیں ہوں۔“ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”ویسے آپ علی کا حلیہ بتائیں، ممکن ہے میں اسے تلاش کر سکوں۔“  
 ”میں نہیں جانتی۔“ لڑکی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس سے نیٹ پر میرا رابطہ تھا۔“  
 ”ویسے ایک علی کو میں بھی جانتا ہوں۔“ احسن نے کہا۔ ”وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“  
 ”اس طرح تو اس ملک میں لاکھوں علی ہوں گے۔“ غراتی ہوئی سی ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”یہاں تو ہر دوسرے آدمی کے نام کے ساتھ علی لگا ہوتا ہے۔“  
 ”آپ...“ احسن نے کچھ کہنا چاہا۔  
 ”یہ میرے دوست ہیں آسٹن۔“  
 لڑکی نے جلدی سے کہا۔

”اینا!“ مرد کی درشت آواز سنائی دی۔ ”تم نے علی کا سیل نمبر یا ایڈریس کیوں نہیں لیا... اب اگر وہ نہ آیا تو تم اسے کہاں تلاش کرو گی؟“  
 میرے خون کی گردش پھر تیز ہو گئی۔ آنے والی اپنا ہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بے بی آسٹن کو میں کہاں فٹ کروں۔

پھر اپنا کی آواز سنائی دی۔ ”سوری مسٹر! میں نے فضول میں آپ کو ڈسٹرب کیا۔“  
 ”سوری کی ضرورت نہیں ہے میڈم!“ احسن نے کہا۔ ”مجھے تو آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔“  
 میں سیل فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ مسلسل کان سے لگانے کی وجہ سے سیل فون گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد احسن کی آواز ابھری۔ ”علی... کیا تو موجود ہے؟“  
 ”ہاں، میں موجود ہوں لیکن میرا نام مت لے۔“  
 ”وہ لوگ اب جا چکے ہیں۔“ احسن نے کہا۔

”تو نے اس سے یہ کیوں کہا کہ تیرا ایک دوست بھی علی ہے؟“  
 ”یار! بات کو سمجھا کر۔ کل کلاں کو اگر وہ کسی نہ کسی طرح تیرے گھر تک پہنچ جاتی ہے جس کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، تو وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گی۔ اس وقت میں اس سے یہ تو کہہ سکوں گا کہ میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔“ پھر وہ بولا۔ ”یار! پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ اب تو بھی سواور میں بھی گھر جا رہا ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے یار!“ میں نے کہا۔ ”مجھے حالات سے باخبر رکھنا، خدا حافظ۔“

احسن نے بھی خدا حافظ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ جسم سے زیادہ میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اپنا کارڈ عمل کیا ہوگا؟ مجھے امی، ابو اور سیما کا خیال آیا۔ جب ابو کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا بیٹا کروڑوں کی رقم لے کر فرار ہو گیا ہے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟ امی کیا سوچیں گی اور سب سے بڑھ کر سیما کا کیا حال ہوگا؟  
 یہی ساری باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی ساڑھے بارہ بج رہی تھی۔ میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا اور مجھے چکر سے آرہے تھے۔

اسی وقت چاچا غلام حسین نے دروازہ کھول کر میرے کمرے میں جھانکا۔ مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر وہ جھجکتا ہوا میرے کمرے میں آ گیا اور بولا۔ ”صاحب جی! صبح سے میں چار پانچ چکر لگا چکا ہوں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے۔“ پھر بولتے بولتے اس نے غور سے میری شکل دیکھی اور پرتکڑے لہجے میں بولا۔ ”صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے چاچا!“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے ایک کپ کافی اور پینا ڈول کی دو ٹیمبلٹس لا دو۔“  
 اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی تھامی پھر چونک کر بولا۔ ”آپ کو تو بہت تیز بخار ہے جی۔“  
 ”ہاں، میں بخار کی گولیاں کھا لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”دوا خالی پیٹ نہیں کھانی چاہیے صاحب۔“ چاچا ہمدردی سے بولا۔ ”میں پہلے آپ کے لیے جوس اور ڈبل

باہر نکل گیا۔  
 کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں جوس کا گلاس، کچھ سلاٹس اور ایلے ہوئے انڈے لے کر آ گیا۔ پھر اس نے زبردستی مجھے سلاٹس کھانے پر مجبور کر دیا اور جوس کا گلاس میرے ہاتھ میں پکڑا دیا پھر بس کر بولا۔ ”صاحب جی! کبھی بھی ملک صاحب کے ساتھ بھی زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ انہیں تو میں نے گودوں میں کھلایا ہے اس لیے وہ میری بات مان لیتے ہیں ورنہ دوسرے نوکروں کا تو دم نکلتا ہے انہیں دیکھ کر۔“ اس کے لہجے میں فخر تھا۔ اس کے لیے یہ بھی اعزاز کی بات تھی کہ چھوٹے ملک صاحب کو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔

”چاچا! اب تو مجھے ٹیلیٹ لادو۔“ میں نے جوس کا گھونٹ زبردستی گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔  
 ”ابھی لایا صاحب جی۔“ چاچا نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ فوراً ہی وہ ایک خوش پوش شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ چاچا نے اس کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ چاچا نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا تھا۔ ملک صاحب بیمار ہوتے ہیں، تب بھی میں ایسا ہی کرتا ہوں۔“

اس بوڑھے کی ساری زندگی جاگیرداروں کی ٹھوکریں اور جھڑکیاں کھاتے گزر گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔  
 ڈاکٹر نے میرے نزدیک کرسی پر بیٹھ کر اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے تھرما میٹر نکال کر میرے منہ میں لگا دیا۔ پھر اس نے اسٹیٹھو اسکوپ سے میرا معائنہ کیا، میری نبض دیکھی اور تھرما میٹر منہ سے نکال کر بخار دیکھنے لگا۔ پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”علی صاحب! آپ کو تو اچھا خاصا بخار ہے۔“

”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”آپ شاید بھول گئے کہ آپ کی دیکھ بھال چاچا غلام حسین کے ذمے ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے آپ کا نام بتایا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کراچی سے آئے ہیں۔“  
 ایک لمحے کو مجھے چاچا غلام حسین سے خوف سا محسوس ہوا۔ ابھی اس نے ڈاکٹر کو میرے بارے میں بتایا تھا۔ بعد میں محلے کے دوسرے گھروں کے نوکروں کو بھی بتا سکتا تھا۔  
 ڈاکٹر نے مجھے فوری طور پر ایک انجکشن دیا اور ایک پرسچے پر کچھ دوا لکھ کر چاچا غلام حسین کو دیں اور بولا۔

”چاچا! میرے ساتھ آؤ۔ میں دوا لیں گی دنواروں کا اور استعمال کا طریقہ بھی بتا دوں گا۔“  
 ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تو کسلمندی سے لینا رہا پھر میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ دوبارہ کھلی تو چاچا میرے بیڈ کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں چھ سات گھنٹے تک سو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے جو انجکشن دیا تھا، اس میں کوئی مسکن دوا تھی جس کے زیر اثر میں سو رہا تھا۔  
 ”اب کیسی طبیعت ہے صاحب؟“ چاچا نے بہت انہایت سے پوچھا۔

”اب تو میری طبیعت بہت بہتر ہے۔“ میں نے اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ میں نے سونے سے پہلے صرف دو سلاٹس اور ایک گلاس جوس لیا تھا۔ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے چاچا سے کہا ٹالانے کو کہا اور خود دواش روم میں بس گیا۔

میں کھانا کھا کر چائے پی رہا تھا کہ میرے سل فون کی ٹھنکی بجی۔ اسکرین پر احسن کا نام تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کر لی اور بولا۔ ”بولو احسن! کوئی خاص خبر؟“  
 ”خاص خبر یہ ہے کہ اپنا آج کافی دیر تک بینک میں گزارنے کے بعد وہاں سے نکلے۔ شاید اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔“ احسن نے کہا۔

”کیسا مقصد؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا اپنا تمہیں بتایا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟“  
 ”اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن اس کے چہرے کی مایوسی دیکھ کر میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔“ احسن نے کہا۔  
 ”اور وہ بے بی آسن کہاں تھا؟“  
 ”بے بی آسن! احسن نے حیرانی سے دہرایا۔  
 ”اچھا وہ آسن... وہ آج اپنا کے ساتھ نہیں تھا۔“  
 ”تو کس طرح بینک فیچر یا وہاں کے کسی اور شخص سے معلوم کر کے اپنا وہاں کیوں آئی تھی؟“

”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ احسن نے اچانک پوچھا۔

”ہاں یار!“ میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی خاص بات نہیں، بس ہلکا سا بخار آ گیا تھا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے، اب میں تجھے نکل کال کروں گا۔“ احسن نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دواؤں میں کوئی ٹرکولائزر بھی تھی۔ دوا لیتے ہی مجھے پھر نیند آنے لگی۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی کھولا اور ایک نیوز

چینل لگا لیا۔ وہاں سے ہمیشہ کی طرح سیاست داں آپس میں کالج کے لڑکوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ میں نے دوسرا چینل لگا لیا، وہاں سے بھی اسی قسم کا واہیات پروگرام آرہا تھا۔ میں چینل بدلتے ہی بدلتے بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ رات کو تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو شدید سردی کا احساس ہوا۔ میں نے ٹی وی آف کیا اور بیڈ پر لیٹ کر پھر سو گیا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو میری طبیعت بہت بہتر تھی۔ حسب معمول چاچا غلام حسین نے کمرے میں جھانکا، پھر ہنس کر بولا۔ ”آج تو بہت سویرے اٹھ گئے ہو صاحب جی؟“

”ہاں چاچا! رات کو نیند بھی اچھی آئی۔ اب طبیعت بھی ٹھیک ہے۔“  
 ”ملک صاحب آپ کو پوچھ رہے تھے۔“  
 ”انفار کب آیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔  
 ”ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں۔“ چاچا غلام حسین نے بتایا۔

میں جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا اور سننگ روم کی طرف بڑھا۔ انفخار وہیں بیٹھا تھا۔ ابھی میں لاؤنج ہی میں تھا کہ اچانک میں نے فائر کی آواز سنی۔ میں نے چونک کر لان میں کھٹنے والی گھڑی سے باہر دیکھا۔ وہاں کا منظر عجیب تھا۔ گیٹ کے پاس چوکیدار غیر فطری انداز میں آڑا تر چھا پڑا ہوا تھا اور کئی سخ افراد گیٹ سے اندر کی طرف آرہے تھے۔ میں جلدی سے نیچے جھک گیا اور جھکے جھکے چکن کی طرف بڑھا۔ وہاں سے سننگ روم قریب تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور انہیں اتنی جلدی میری یہاں موجودگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟ میرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ میں نے ہزاروں روپے کی شاپنگ کر ڈالی لیکن کوئی چھوٹا موٹا ماؤزر نہیں خریدا۔ پیسا خرچ کیا جائے تو ماؤزر یا رائفل کیا رکٹ لا چر بھی مل جاتا ہے۔

چاچا غلام حسین سراسیمگی کی حالت میں وہاں آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”چاچا! گھر میں کوئی ہتھیار ہے؟“  
 ”چاچا غلام حسین نے تھوک نٹکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، ایک رائفل ہے اور ریوالور تو ملک صاحب کے کمرے میں بھی ہے۔“

میں یہ سنتے ہی کوریڈور میں نکل آیا۔ چاچا غلام حسین نے برآمدے کا داخلی دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ آنے والے دروازے پر زوردار ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر انہوں نے

بند دروازے پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ فائر شاید سیون ایم ایم کا تھا۔ گولیاں لکڑی کے موٹے دروازے سے گزر کر اندر کی دیوار سے ٹکرائی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر پیٹ کے تل رینگتا ہوا انفخار کے کمرے کی طرف بڑھا۔ انفخار نہ جانے خود کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟ مجھے شرمندگی اس بات کی تھی کہ میری وجہ سے وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں کرائنگ کرتا ہوا کسی نہ کسی طرح انفخار کے کمرے میں پہنچ گیا۔ رائفل تو مجھے دیوار پر لٹکی نظر آگئی۔ میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر اس کے میگزین کی تلاش میں انفخار کی الماری کھولی تو مجھے میگزینز کے ساتھ ساتھ مشین پستل اور اس کے میگزینز بھی مل گئے۔ میں نے مشین پستل کو لوڈ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی لوڈ ہے۔ مشین پستل اور اس کے میگزینز جیکٹ کی جیب میں ڈال کر میں نے رائفل لوڈ کی اور پھرتی سے کمرے کے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔

دروازے پر اس وقت ایک زوردار ضرب لگی اور وہ کھل گیا۔ میں کمرے کے دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ باہر والے کچھ دیر ریزل کا انتظار کرتے رہے پھر وہ چاروں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ ہی کرب ناک انسانی چیخ مچ گئی۔ میں نے دوسرا فائر ہوا میں کیا۔

آنے والے دہشت زدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور برآمدے کے دروازے سے بھاگنے والوں پر پھر ایک فائر کر دیا۔ پھر اذیت بھری چیخ بلند ہوئی اور آنے والے حواس باختہ ہو کر گیٹ سے باہر نکل گئے۔

میں دوڑتا ہوا لان میں آیا اور مزید دو ہوائی فائر کر دیے۔ فوراً ہی گاڑی کا انجن اشارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور ایک دم وہاں سکوت چھا گیا۔  
 فائرنگ کی آواز سن کر انفخار بھی سننگ روم سے باہر آ گیا تھا۔

میں رائفل لے کر واپس پلٹا تو انفخار برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”سوری یار! میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانا پڑی۔ بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔“

لیے آئے تھے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید اس وقت میں بھی زندہ نہ ہوتا۔“ افتخار نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔

”او بھائی! زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہو؟“

پھر اس کے استفسار پر میں نے اسے بتایا کہ میں نے کیسے حملہ آوروں کو اندر داخل ہوتے دیکھا اور ہتھیاروں تک رسائی کیسے حاصل کی۔

”یار! تم نے تو کمال کر دیا۔“ افتخار نے کہا۔ ”میں اس اچانک افتاد سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ سنگ روم سے میرے کمرے کا فاصلہ بھی زیادہ ہے۔ میں بھی باہر نکلتا تو کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتا۔“

”اپنی باتوں میں ہمیں چوکیدار کا تو خیال ہی نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بے چارہ نہ جانے زندہ ہے یا...“

”چوکیدار کو ہوش آ گیا ہے۔“ چاچا غلام حسین نے بتایا۔

اچانک مجھے حملہ آوروں کے اس سامنی کا خیال آیا جسے میں نے برآمدے میں زخمی کیا تھا۔ نہ جانے وہ زندہ بھی تھا یا۔ مر گیا تھا؟ میں برآمدے میں آیا تو وہ شخص آزار تو چھاپا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ زندگی سے ناتا توڑ چکا تھا۔

افتخار نے یہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر آہستہ سے بولا۔ ”یہ تو رحم ہے۔“

میں نے گھوم کر استفسار طلب نظروں سے افتخار کو دیکھا۔ ”یہ چودھری امانت کا کارندہ ہے۔ کئی افراد کے قتل کا الزام ہے اس پر... دودھ نہ چیل بھی جا چکا ہے۔ مجھے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ افتخار نے کہا۔

پھر اس نے گاؤں ٹیلی فون کر کے اپنے باپ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد مختلف جگہ ٹیلی فون کرتا رہا۔

اس نے مجھ سے وہ رائل لے لی جس سے رجسٹر ہلاک ہوا تھا۔ اس نے رائل سے میرے فنگر پرنٹ اچھی طرح صاف کیے اور اس پر اپنے فنگر پرنٹ ثبت کر دیے۔ پھر اس نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ”پولیس کے آنے پر تم اندر چلے جانا۔“

پولیس کی کارروائی میں دو تین گھنٹے ضائع ہو گئے۔ ابھی پولیس والے موجود ہی تھے کہ افتخار کے والد ملک اللہ داد خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ خاصی بھاری بھر کم اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اس عمر میں بھی ان کی صحت قابل رشک تھی اور وہ افتخار سے زیادہ جوان اور توانا لگ رہے تھے۔

ضابطے کی کارروائی کے بعد پولیس چلی گئی تو چاچا غلام حسین بڑے ملک صاحب کے لیے حقہ لے آیا۔ وہ لاؤنج میں پڑی کرسی پر بیٹھ کے حقہ گڑ گزارنے لگے۔

”ابا جی کو معلوم نہ ہو کہ تو کراچی سے فرار ہو کر آیا ہے۔“ افتخار نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ان سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کسی کا ٹیلی فون آیا تو وہ اچانک ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور افتخار سے دو چار ضروری باتیں کر کے عجلت میں روانہ ہو گئے۔

افتخار انہیں گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ اچانک میری نظر ایک پرس پر پڑی جو کرسی کے پاس گرا ہوا تھا۔ میں نے وہ پرس اٹھالیا۔ پرس کھلتے ہی مجھے بڑے ملک صاحب کی تصویر نظر آئی۔ ان کا شناختی کارڈ اوپر ہی کے فلیپ میں لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے شفاف پلاسٹک کے کئی فلیپ تھے۔ ان میں سے ایک فلیپ میں ملک صاحب کے جاننے والوں کے وزینگ کارڈز تھے۔ اگلا فلیپ کھولتے ہی میرا ذہن بھگ سے اڑ گیا۔ وہاں اپنا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہی اپنا جس نے میرے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم منتقل کی تھی۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

اسی وقت افتخار لوٹ آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

”انکل اپنا پرس یہیں بھول گئے۔“

”یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ افتخار نے پرس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”یہ نہیں فرس پر پڑا تھا۔“

”یار! اس میں تو ابا جی کا آئی ڈی کارڈ بھی ہے اور کریڈٹ کارڈ بھی ہیں۔“ اس نے فوراً سیل فون پر نمبر ملا لیا اور بولا۔ ”ابا جی! آپ اپنا پرس یہیں بھول گئے ہیں... جی ابا جی... وہ اس وقت... میرے پاس ہے... ٹھیک ہے۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ”ابا جی کسی کوریسیو کرنے پتھی جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اپنا پرس واپسی میں لے لوں گا۔“

”یار! افتخار! میں نے کہا۔“ اگر تو... برانہ مانے تو میں ایک بات پوچھوں؟“

افتخار نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ”علی! تجھے یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”یار... وہ... میں نے... انکل... کے پرس میں کسی امریکن لڑکی کی تصویر دیکھی ہے... وہ...“

”وہ ابا جی کی بزنس پارٹنر کلارا ہے۔“ افتخار ہنس کر

بولا۔ اب اس نے یہاں ابیل این بی اوقافم کرنے کا ارادہ بھی کیا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں پاکستان آرہی ہے۔“

افتخار کی بات سن کر میرے ذہن میں ساکس ساکس ہونے لگی۔ گویا اپنا یہاں آرہی تھی۔

”وہ یہاں لاہور آئے گی؟“ میں نے پوچھا۔

”امریکا سے وہ کراچی پہنچے گی۔ این جی او کا ہیڈ آفس کراچی ہی میں ہوگا۔ کراچی ہی سے وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اندرون سندھ میں بھی کام کرے گی۔ پھر وقت ملا تو اسلام آباد بھی آئے گی۔“

”یار! پارٹنر وہ انکل کی ہے اور تفصیلات تو بتا رہا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس این جی او میں مجھے بھی کام کرنا ہے۔“ افتخار ہنس کر بولا۔ ”لیکن تجھے کلارہ کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی؟“

”یار! میں نے انکل کے پرس میں اس کی تصویر دیکھی تو پوچھ لیا۔“ میں نے جواب دیا۔

افتخار کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ ”ہاں رحیم! کوئی خاص بات؟ نہیں ابا جی تو پتھی گئے ہیں... کیا ہوا ہے؟... اچھا میں پہنچ رہا ہوں۔“ وہ سلسلہ منقطع کر کے مجھ سے بولا۔ ”یار! دشمنوں نے ہمارے ایک گاؤں پر حملہ کر کے کئی افراد کو زخمی کر دیا ہے۔ رحیم خان ہمارا منبر ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ہم جو ابی کارروائی کریں یا بڑے ملک صاحب کا انتظار کریں۔ ابا جی کا موبائل فون آف ہے۔ مجھے ہی گاؤں جانا پڑے گا۔“

”تیرے دشمن یہاں دوبارہ بھی تو حملہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”اب وہ یہاں آئیں گے تو مارے جائیں گے۔“ افتخار نے کہا۔ ”میں نے گاؤں سے چار آدمی بلائے ہیں۔ وہ یہاں موجود رہیں گے۔“

”او بھائی! ان سے مجھے تو ملو اڈے۔“ میں نے کہا۔

”یہ نہ ہو کہ وہ شبے میں مجھ ہی کو گولی مار دیں۔“ افتخار نے روائگی سے پہلے اقبال کو بلایا تھا اور چاروں گاؤں سے میرا تعارف کرایا تھا۔

میں نے سوچا، افتخار کروڑ پتی شخص ہے۔ دنیا کی ہر چیز ہر نعمت اسے میسر ہے لیکن وہ سکون سے محروم ہے۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ کہ انسان سکون کو ترس جائے۔ تم خود بھی تو اب اسی عشقی کے سوار ہو علی صاحب! میرے اندر سے آواز آئی۔ واقعی جب سے میرے پاس دولت آئی تھی، میں

سکون کی سانس کو ترس گیا تھا۔

میرے خیالات کے تسلسل کو سیل فون کی بیل نے توڑ دیا۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر احسن کا نام تھا۔ میں نے دوسری ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی۔

”ہاں، احسن! خیریت؟“

”خیریت نہیں ہے علی! اپنا کونہ جانے کہاں سے تیرا ہتھل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے تیرا ہتھلنگ سے حاصل کیا ہے۔“

”پھر... پھر کیا ہوا؟“ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”وہ تیرے گھر آئی تھی۔ اس نے انکل اور آئیٹی سے بہت بڑی طرح بات کی۔ اس نے تجھ پر الزام لگایا کہ تو اس کے کروڑوں روپے لے کر بھاگ گیا ہے۔“

”پھر؟“ میں نے بمشکل خود پر قابو پا کر کہا۔

”تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی لوگوں اور ایک غیر ملکی کو بھی لے آئی۔ وہ لوگ گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے انکل کے ساتھ اتنی بدتمیزی کی کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔“

”اب ایو کی طبیعت کیسی ہے؟“ میرے دل میں درد کی ایک لہریں اٹھی۔

”انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے اور ان کی حالت نازک ہے۔“

”میں آ رہا ہوں احسن۔“ میں نے جواب دیا۔

”تیرے آنے سے معاملات مزید بگڑ جائیں گے۔“ احسن نے کہا۔ ”میں انکل کے پاس ہوں تو ان کی فکرمت کر۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اپنا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں صوفے پر گر گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ صرف میری وجہ سے میرا باپ ان حالوں کو پہنچا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ابھی اڑ کر کراچی پہنچ جاؤں۔ پھر میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اگر وہاں میرے ساتھ کچھ ہوا تو ایو کو مزید صدمہ ہوگا۔ میں دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ گیا۔

پھر ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں نے کئی دفعہ احسن کو ٹیلی فون کرنا چاہا لیکن اس کا سیل آف تھا۔

صبح پانچ بجے کے قریب احسن کی کال آئی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”ہاں، احسن! کیسی طبیعت ہے ایو کی؟“

”اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ احسن نے کہا۔ ”انہیں آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کل تک انہیں گھر



جانے کی اجازت مل جائے گی۔“ اور امی اور سیمیا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ بھی ٹھیک ہیں مگر تجھ سے بہت ناراض ہیں۔“  
 ”ان کی ناراضی تو میں وہاں آ کر دور کر دوں گا۔“  
 ”تو اپنا خیال رکھنا علی۔“ احسن نے کہا۔  
 ”تو بھی سوچنا ہوگا کہ کتنا خود غرض بیٹا اور بھائی ہے کہ دولت کی خاطر اپنے پیاروں کو خطرات میں دھکیل دیا۔“  
 ”میں کچھ نہیں سوچتا علی! سوچنا تو تجھے ہے۔“  
 احسن نے کہا۔ ”میرے منع کرنے کے باوجود تو نے اپنی من مانی کی۔ ہر غلطی اور بھول کی کوئی نہ کوئی قیمت تو چکانا ہی پڑتی ہے۔“  
 میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ تو گھر والوں کی فکر مت کر۔  
 احسن سے فون پر بات ہونے کے بعد میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ پھر میں لمبی تان کر سو گیا۔  
 میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی ہی سے کھلی۔ دیوار گیر گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، وہ احسن کی کال تھی۔  
 ”ہیلو۔“ میں نے کہا۔  
 ”علی!“ احسن نے جلدی سے کہا۔ ”تو اس وقت کہاں ہے؟“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“  
 ”ایتانے آنٹی سے معلوم کر لیا ہے کہ تو افتخار کے پاس ہے۔ وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی ہے۔ تو اگر واقعی افتخار کے پاس ہے تو وہاں سے کہیں اور چلا جا۔“  
 ”میں واقعی افتخار کے پاس ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔  
 ”تو پھر فوری طور پر وہ ٹھکانا چھوڑ دے۔“ احسن نے کہا۔ ”جلدی کر علی۔ تو شدید خطرے میں ہے۔“  
 ایسی نہ جانے کیا بات تھی کہ احسن اتنا بوکھلا یا ہوا تھا۔ میں نے اسی وقت افتخار کو ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن افتخار نے ٹیلی فون نہیں اٹھایا۔ میں نے مایوس ہو کر لائن کاٹ دی۔  
 فوراً ہی افتخار کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ بولا۔ ”سوری یارا! میں کچھ مصروف تھا۔ تو مجھے کال کر رہا تھا؟“  
 ”ہاں یارا! مجھے یہاں خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونا چاہتا ہوں۔“  
 ”ایسی کیا بات ہو گئی؟“ افتخار نے کہا۔ ”تو فکر مت

کر، میں اقبال کو بھیجتا ہوں۔“  
 ”اقبال تو تیرے ساتھ ہی تھا۔“ میں نے کہا۔  
 ”نہیں یارا! وہ رات میں واپس لاہور آ گیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تیرے پاس ہوگا۔“  
 واقعی پھر آدھا گھنٹا گزرنے سے پہلے ہی اقبال وہاں موجود تھا۔ وہ گاڑی لے کر آیا تھا۔ وہ بغیر کسی سوال جواب کے مجھے گاڑی میں بٹھا کر پرانے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک گنجان آبادی میں لے گیا لیکن جس مکان میں لے گیا، وہ بہت صاف ستھرا تھا۔  
 اس نے مجھ سے کہا۔ ”علی صاحب! یہ مکان ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ بھیجتا ہوں۔“  
 میں آرام تو خیر کیا کرتا، مجھے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ پریشان کن خیال بھی موجود تھا کہ میں نے کراچی سے فرار ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پھر میں خود ہی اپنی بات کا جواب دیتا کہ خطرہ تو فرار نہ ہونے میں بھی تھا۔ اب تو ایک غلطی کر ہی لی ہے۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔  
 مجھے یوں ہی بیٹھے نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھے اپنی بے پروائی پر بھی شدید غصہ آیا کہ اقبال کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے لاک نہیں کیا تھا۔ آنے والا دشمن نہیں تھا۔ وہ خطرہ تو اس وقت پیدا ہوتا جب ایٹا لاہور پہنچ جاتی۔  
 دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی تو میں دروازے کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”کون ہے؟“  
 ”میں آپ کے لیے چائے لے کر آئی ہوں۔“ باہر سے ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی۔  
 میں نے دروازہ کھول دیا۔ میں اسے دیکھ کر سانس نہ رہ گیا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس نے سستا سا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے دلکش اور متناسب سراپا پر اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی سنہری رنگت اور سیاہ گھنے بال اس کی شخصیت کی دلکشی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔  
 میں ایک ننگ نظریں جمائے اسے تک رہا تھا۔  
 ”چائے... لے لیں۔“ اس کی پُرکشش آواز میرے کانوں سے گرائی۔  
 ”ہاں... آئیے۔“ میں نے چونک کر کہا اور ایک طرف ہو کر اسے راستہ دے دیا۔ وہ چائے کی ٹرے تھامے

ہوئے قیامت میرا چال چلی ہوئی کمرے کی طرف بڑی۔  
 مجھے شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟  
 اس نے چائے کی ٹرے ایک چھوٹی میز پر رکھ دی۔  
 اس ٹرے میں چائے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک پلیٹ میں سموسے، دوسری پلیٹ میں سینڈویچز، فرنیچ فرائز اور پکڑے تھے۔  
 وہ لڑکی ابھی تک سبھی سبھی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پُرکشش چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ... کون ہیں... اور یہ... چائے؟“  
 ”میرا نام مریم ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں برابر والے مکان میں رہتی ہوں۔ اقبال صاحب نے یہاں چائے لانے کو کہا تھا اس لیے...“  
 ”مریم! آپ نے تو بہت زیادہ اہتمام کر لیا۔ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے ہنس کر کہا۔  
 ”اس میں زحمت کیسی؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہاں، آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، بلا تکلف برابر والے دروازے پر دستک دے دیجیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لہرائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔  
 مجھے ایسا لگا جیسے کراخالی اور بے رنگ ہو گیا ہو۔ میں نے تو اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اقبال سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ پھر میں سموسوں کی پلیٹ لے کر بیٹھ گیا۔  
 کچھ دیر بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی تو میں دستک کے انداز ہی سے سمجھ گیا کہ مریم آئی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی اور برتن اٹھانے لگی۔ اچانک وہ کچھ سوچ کر بولی۔  
 ”آپ ٹی وی ہی کھول لیں۔ کم سے کم یہ سنا نا تو کم ہوگا۔“  
 میں اس سے کیا کہتا کہ سنا نا تو تمہارے آتے ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرے دل میں تو جلتنگ سے بج رہے ہیں لیکن میں اس سے یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔  
 وہ برتن اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھیے... کوئی تکلف مت کیجیے گا اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مانگ لیجیے گا۔“  
 ”مریم!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اقبال سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“  
 ”بظاہر تو کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ ہمارے محسن ہیں۔ ابو کے انتقال کے بعد انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے، ہر طرح سے ہماری مدد کی ہے۔“

میں نے مریم سے یہ نہیں پوچھا کہ اقبال نے کیا مدد کی ہے؟ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”تمہارا بار بار یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔ تم اپنے کسی بھائی کو بھیج دیا کرو۔“  
 میری بات سن کر وہ اچانک افسردہ ہو گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”بھائی... میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ گھر میں صرف میں ہوں یا امی ہیں۔“ پھر وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ اس محلے میں، کسی کی اتنی جرأت نہیں ہے کہ مجھے غلط نظروں سے دیکھ بھی سکے۔ اقبال صاحب اس کی آنکھیں نکال لیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ پہلے کی طرح اچانک لہرائی ہوئی چلی گئی۔  
 میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر مریم کون ہے اور اقبال ان ماں بیٹی پر اتنا مہربان کیوں ہے؟ کیا اس میں بھی مریم کے حسن کا کمال ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بالکل حیرت نہ ہوتی۔ وہ ایسے ہی حسن بلا خیز کی مالک تھی کہ اس کے لیے کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا۔  
 سناٹا اچانک گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے ٹی وی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن اس کمرے میں ٹی وی نہیں تھا۔ ممکن ہے دوسرے کمرے میں ہو۔ میں نے تو ابھی تک اس مکان کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس مکان میں کتنے کمرے ہیں، باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے یا نہیں... چھت پر کیا ہے؟  
 میں نے مکان کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں جس کمرے میں تھا، وہ بیڈ روم تھا۔ اس میں مقبول سا ایک بیڈ اور دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں میرے سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو برآمدہ تھا۔ برآمدے کی دوسری طرف دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ موقوف تھا، دوسرا کرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں پرانا سا ایک قالین، ایک صوفہ سیٹ، ایک سیٹی اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے میں ایک طرف ٹرائی پر ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ دوسرے موقوف کمرے میں شاید مالک مکان یا اقبال کا کچھ سامان تھا۔ برآمدے سے آگے چھوٹا سا مچن تھا۔ اس میں ایک طرف مچن اور ہاتھ روم تھے۔ ان کے ساتھ ہی زینہ تھا۔  
 میں زینے کے ذریعے چھت پر چلا گیا۔ چھت پر بھی بغیر پلاسٹر کا ایک کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ نہیں تھا۔ کمرے میں پرانا فرنیچر، ڈبے، بوتلیں اور اسی طرح کا کٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ چھت کے گرد تقریباً چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ وہاں ایک طرف جھنگا سی ایک چار پائی اور ایک چوکی بھی

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

## WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کھانے لگی۔

”تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”میرے بارے میں سن کر کیا کریں گے علی صاحب؟“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”اگر بتانا چاہو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

”ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے جو آپ سے چھپاؤں گی۔“

مریم نے کہا پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ”میرے ابو... اقبال کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں

رہتے تھے۔ کافی عرصے تک مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ ابو کیا کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہفتوں کے لیے غائب ہو جاتے

پھر لوٹتے تو میرے لیے بہت سے تحفے لے کر آتے۔

”میں بی اے فائنل میں تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ اس دن پہلی دفعہ میں نے ابو کو گھر پر دیکھا۔ اس دن اقبال

صاحب کو بھی دیکھا۔ وہ امی کی موت پر آئے تھے پھر وہ اکثر آنے لگے۔

ایک دن وہ بہت گھبرائے ہوئے آئے اور بولے۔

”مریم...! اٹھو، میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ وقت باتوں کا نہیں ہے۔ اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں رکھو اور جلدی نکلو یہاں سے۔“

”لیکن ابو... میں ابو کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

”ابو بھی آجائیں گے۔“ اقبال سخت لہجے میں بولے۔

”وقت ضائع مت کرو مریم! موت ہمارے تعاقب میں ہے۔“

”میں نے جلدی جلدی اپنے کچھ کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں ایک بیگ میں بھریں اور چلنے کو تیار ہو گئی۔“

”تمہاری امی کا انتقال ہو چکا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر یہ کون ہے جسے تم اپنی امی کہہ رہی تھیں؟“

”یہ بھی اقبال کے لیے کام کرتی ہے۔“ مریم نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”اقبال مجھے یہاں لے آئے۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ابو کو قتل کر دیا ہے۔ پہلے امی، پھر ابو کی موت سے میں بالکل ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس وقت زینت خالہ نے مجھے بہت تسلی دی، میرا غم بانٹا اور مجھے ایک مرتبہ پھر جینے پر مجبور کر دیا۔ اقبال بھی میری دل جوئی کرتے تھے۔ انہوں نے میرا بہت خیال

پڑی ہوئی تھی۔

میں پورے مکان کا جائزہ لینے کے بعد بیڈروم میں لوٹ آیا۔

تقریباً آٹھ بجے دروازے پر مریم کی مانوس دستک سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ٹرے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اندر آ گئی۔ وہ اندھیرے سے روشنی میں آئی تو اس کا کھرا کھرا اور بنا سنورا وجود دیکھ کر

مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے لباس کے سلسلے میں بھی خاص اہتمام کیا تھا۔ بالوں کو سنوار کر اس نے جوڑا بنا رکھا

تھا۔ وہ تنگ پا جاسے اور لمبی ٹیٹ میں ملبوس تھی اور اس نے کوئی سمورکن پرفیوم بھی لگا رکھا تھا۔

مجھے یوں والہانہ انداز میں گھورتا دیکھ کر وہ کچھ شرمائی لیکن اس کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ اس نے میرے یوں گھورنے کا بُرا نہیں مانا ہے۔

اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا نام علی ہے؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا۔ ”ہاں، میرا نام علی ہے... لیکن... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ میں اچانک

آپ سے تم پر آ گیا۔

”آپ کیا سمجھ رہے تھے، آپ نہیں بتائیں گے تو کیا مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہوگا؟“

میں ہنس کر بولا۔ ”مریم! تم نے مجھے نام بتانے کا موقع ہی کب دیا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ مریم شوخی سے بولی۔

”کیا نام بتانے کے لیے بھی دو چار گھنٹے چاہئیں؟“

”اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟“ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے

بغیر بولا۔ ”اچھا چھوڑو... کوئی اور بات کرو۔“

”آپ پہلے کھانا کھائیں۔“ مریم نے کہا۔ ”میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”چائے بعد میں لے آنا، پہلے کھانا کھا لو۔“

”میں...؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، تم۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا تم کھانا نہیں کھاتی ہو؟“

”لیکن... میں...“

”کچھ مت بولو۔“ میں نے کہا۔ ”چلو کھانا نکالو۔“

اس نے کھانا نکالا اور پلیٹ مجھے دے کر خود بھی

رکھا۔ مجھے دنیا کی ہر آسائش دی۔ بس یہ پابندی لگا دی کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔ اگر نکلتا بہت ضروری ہو تو پھر عہد یا پھین کر اور چہرے پر نقاب لگا کر نکلوں۔“ اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بس میری اتنی ہی کہانی ہے۔“ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ ابھی تک مجھے کسی کا خطرہ نہیں تھا لیکن میرے دل میں چورتھا اس لیے میں بار بار چونک اٹھتا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا۔ ”کون؟“

”علیٰ دروازہ کھولیں میں اقبال ہوں۔“ باہر سے اقبال کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ اقبال اندر آ گیا۔ وہ اس وقت جینز اور جیکٹ میں تھا۔ اس کی نظر مریم پر پڑی تو چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے پھر فوراً ہی غائب ہو گئے۔ اس نے ایک نظر مریم کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”مریم! علی صاحب کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”یہ آپ ان ہی سے پوچھیں۔“ مریم نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا ہجک کہہ دیجیے گا۔“ اقبال نے کہا۔

مریم کھانے کے برتن سمیٹ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”یار! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس لڑکی سے گھریلو ملازمت کی طرح کام لیے جاؤں۔“

”مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“ اقبال نے جواب دیا۔ ”لیکن فی الحال ہمیں رازداری کی ضرورت ہے اور مریم بہت بااعتماد ہے۔“

”پھر بھی یار! اس کی ماں کیا سوچے گی؟“ میں نے جان بوجھ کر ماں کا تذکرہ کیا۔

”وہ کیا سوچے گی؟“ اقبال نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اب آرام کریں، مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں بستر پر لیٹا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر میری آنکھ لگ گئی۔

میں مشکل سے آدھا گھٹنا سویا تھا پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔ باہر گھنٹے میں اندھیرا تھا۔ میں آنکھوں سے ہاتھ دھو کر دوبارہ ہاتھ دھوئی تو میں چونک اٹھا۔ میں نے سیکے کے نیچے سے ماؤزر نکالا۔ یہ افکار کا ماؤزر تھا جو میں

وہاں سے چلتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

میں نے مریم کی مانوس دستک کو پہچان لیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ حواس باختہ سی اندر آ گئی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”خیریت تو ہے مریم؟“

”خیریت نہیں ہے۔“ مریم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اقبال آپ کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔“

”اقبال؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیوں؟“

”باتوں میں وقت ضائع مت کریں علی!“ اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔“

میں عجلت میں اندر آیا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے۔ دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماؤزر میں نے پشت پر پینٹ کی بیلٹ میں اڑ لیا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اقبال اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مریم کے حلق سے سرسلی سی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اقبال کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”ڈیبل، کمینٹی، احسان فراموش... میرے احسان کا تو نے خوب بدلہ چکا یا ہے۔ پہلے میں تجھ ہی کو ختم کروں گا۔“

اس نے گن مریم کی طرف تان دی اور ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ میں چیخ کر بولا۔ ”اقبال! یہ کیا کر رہے ہو؟“

”بکو اس بند کر۔“ اس نے مجھے جھڑک دیا۔ ”اس کے بعد تیرا بھی یہی حشر کروں گا۔“

میں نے غیر محسوس طور پر ماؤزر نکال لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اقبال قائر کرنا، میرے ماؤزر نے شعلہ افکلا۔ دھماکے کی آواز رات کے ستارے میں کچھ زیادہ ہی سنائی دی۔ میں نے چونکا کھا کر اقبال کو اوندھے منہ زمین پر گرتے دیکھا۔ وہ چند لمبے تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

اس کی پھٹی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کو تیک رہی تھیں۔ مریم غیر شعوری انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے آہستگی سے اسے علیحدہ کیا تو وہ بھی کچھ جھینپ سی گئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ”اب فوراً یہاں سے نکلو۔۔۔ اس ستارے میں فائر کی آواز دور دور تک سنائی گئی ہوگی۔“

میں نے نوٹوں کے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور مریم سے اپنا چھوٹا سوٹ کیس اٹھانے کو کہا جس میں میری ضرورت کا سامان تھا۔

میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں تقریباً بیس، بائیس ہزار کے کرنسی نوٹ، ایک کنگا، رومال اور گاڑی کی چابیاں تھیں۔ میں نے اس کی تمام چیزوں کو داپس اس کی جیب میں ٹھونسا اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھنٹوں میں نکل آیا۔

میں نے مریم سے کہا۔ ”تم گھر جا کر سو جاؤ، تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں نے فائر کی آواز سنی تھی لیکن کسی کو دیکھا نہیں۔“

مریم اچانک رونے لگی۔ وہ بہت بڑی طرح سسک رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”آ... آپ... مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے؟“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”میری زندگی تو خود خطرات میں گھری ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ جا کر کیا کرو گی؟“

”اس زندگی سے تو بہتر ہی ہو گا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔“ اس نے کہا۔

اس کے بہت زیادہ اصرار پر میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

ہم دونوں اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گاڑی تک پہنچے۔ فائر کی آواز کسی نے سنی بھی ہوگی تو باہر نکلنے کے بجائے گھر میں دیک گیا ہوگا۔ ان دنوں بھی اسن دامان کی صورت حال ایسی ہی تھی جیسی آج ہے۔

مجھے ایک خطرہ تھا کہ پولیس کی کوئی حسرتی پارٹی مجھے روک نہ لے لیکن وہاں سے گلبرگ تک ہمیں پولیس کی کوئی موبائل نہ ملی۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ مریم نے پوچھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تو میں سوچ رہا ہوں کہ کس طرف جاؤں۔ پہلے تو مجھے اس گاڑی سے چھٹکارا پانا ہے۔“

پھر میں نے گاڑی کا رخ اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ گاڑی وہیں ریلوے اسٹیشن کی پارکنگ میں چھوڑ کر خود کسی میں کسی اور طرف نکل جائیں گے۔

گاڑی کو ریلوے اسٹیشن کی پارکنگ میں چھوڑنے کے بعد ہم اپنا سامان لے کر ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ ابھی تک پولیس کو اقبال کے قتل کی اطلاع بھی نہیں ملی ہوگی۔

پنڈی جانے والی گاڑی روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں نے جلدی سے پنڈی کے دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے لیے

اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ فرسٹ کلاس کا ڈبا تقریباً خالی تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر اڈمیر عمر کا ایک شخص اوپر والی برتھ پر سو رہا تھا۔

گاڑی اسٹیشن سے باہر نکلی تو میں نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔ مریم بھی کافی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”مہمیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ اقبال مجھے ختم کرنا چاہتا ہے؟“

”وہ آپ سے مل کر وہاں سے گیا نہیں تھا بلکہ میرے گھر میں آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے چائے بنانے کو کہا۔ پھر چائے پی کر سگریٹ پھونکا رہا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اقبال کچھ دیر بیٹھا رہا پھر دبے پاؤں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ وہ مجھے سویا ہوا سمجھ رہا تھا۔ جس مکان میں آپ تھے، اس کی ایک چابی اقبال کے پاس بھی تھی۔ میں دروازے کے پاس پہنچی تو میں نے آپ کا دروازہ کھلنے کی خفیف سی آواز سنی۔ مجھے حیرت تھی کہ اقبال اتنے پرسرار انداز میں کیوں گیا ہے۔ میں دوبارہ لیٹ گئی۔ پھر میں نے دوبارہ اقبال کو داپس آتے دیکھا۔ میں نے پھر یہی ظاہر کیا کہ میں گھری نیند سو رہی ہوں۔“

اچانک اقبال کی ہلکی سی آواز آئی۔ ”یار! اس کے پاس تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ کیش ہے... بہت زیادہ... تم یقین نہیں کرو گے... کتنا؟ میرا اندازہ ہے کہ تین چار کروڑ روپے تو ہوں گے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں کیش نکال کر کہیں پھینک دوں گا لیکن اتنا کیش دیکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب اسے زندہ چھوڑنا بھی۔ بے وقوفی ہوگی۔ وہ بعد میں ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے... ملک صاحب... وہ... سارے ناجائز کام مجھ سے لیتے ہیں اور دس بیس ہزار روپے دے کر ٹر خاد دیتے ہیں... نہیں یار! میں ویسے بھی ان کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا... میری گاڑی میں بیٹرول نہیں ہے۔ میں اس کا ٹینک فل کرا کے آتا ہوں پھر اس علی سے بھی نمٹ لوں گا... ارے نہیں یار، تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خوف زدہ اور تہتا آدمی ہے۔ اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“

”پھر میں نے اقبال کو باہر جاتے دیکھا۔ وہ شاید بیٹرول ٹینک فل کرانے جا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ قریب ترین بیٹرول پمپ بھی وہاں سے تین چار کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اس کے جاتے ہی میں پھرتی سے اٹھی اور آپ کے پاس پہنچ گئی۔“ بولتے بولتے مریم کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

”تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول کیوں لیا؟“

میں نے پوچھا۔ ”اقبال کے مقابلے میں تو میں تمہارے لیے  
اجنبی ہوں۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”بہسی بہسی اجنبی بھی دل کے بہت  
قرب آجاتے ہیں۔“

گلٹ چکر آیا تو ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔  
کچھ دیر بعد مریم گہری نیند سو گئی مگر میں جاگتا رہا۔  
اچانک میں نے ہنڈی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شہر  
میرے لیے محفوظ نہیں تھا۔ وہاں افتخار کے والد اور افتخار کا  
آنا جانا رہتا تھا۔ وہ گاڑی پشاور تک جارہی تھی۔ میں نے  
پشاور جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں گاڑی میں سوار ہونے کے بعد کئی دفعہ احسن کا  
ٹیلی فون نمبر ڈائل کر چکا تھا لیکن اس کا موبائل فون مسلسل بند  
تھا۔ مجھے اس کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔

دوپہر کے وقت گاڑی ہنڈی پہنچی۔ میں نے پلیٹ  
فارم پر اترنے کے بجائے ڈائنگ کار سے کھانا منگو لیا۔  
کھانا اگرچہ زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن شدید بھوک میں وہ بھی  
اچھا لگ رہا تھا۔ گلٹ چکر دوبارہ آیا تو میں نے اس سے  
پشاور تک کے ٹکٹ بنوا لیے۔

میں مسلسل احسن کو کال کرتا رہا لیکن اس کا موبائل  
فون ابھی تک بند تھا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔  
ہم پشاور پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا۔ وہ گاڑی خاصی  
لیٹ تھی۔

وہاں میں نے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کے  
بجائے حیات آباد کے نزدیک صاف ستھرے سے ایک  
ہوٹل میں کرا بک کر لیا۔

مریم کے جسم پر وہی ایک جوڑا تھا جو وہ پہنے ہوئے  
تھی۔ میں نے اسے ڈھیروں شانگ کرا دی۔ اس کے لیے  
چھوٹا سا ایک سوٹ کیس بھی خرید لیا۔

مجھے پشاور آئے تیسرا دن تھا اور احسن سے کوئی رابطہ  
نہیں ہوا تھا۔ اب میری پریشانی گہرا ہٹ میں بدل چکی  
تھی۔ آخر احسن نے سیل فون کیوں بند کر رکھا تھا؟ مریم  
نے کہا کہ ممکن ہے ان کا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہو یا چوری ہو  
گیا ہو۔

یہی ایک امکان میرے ذہن میں بھی تھا۔  
پھر میں نے گہرا کرسیما کا نمبر ڈائل کر دیا۔ اس کا ٹیلی  
فون بھی بند تھا۔ امی اور ابو سے بات کرنے کی مجھ میں ہمت  
نہیں تھی۔ اسی پریشانی میں تھا کہ اچانک میرے سیل فون کی  
گھنٹی بجی۔ میں نے چونک کر سیل فون کی اسکرین پر نظر

دیا۔ اس کی کال ریسیو کروں یا نہ کروں؟ پھر میں نے کال  
ریسیو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”ہیلو! میں نے آہستہ سے کہا۔  
”علی! تو خیریت سے تو ہے؟“

”ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے  
مخاطب انداز میں جواب دیا۔

”تو اقبال کے مرنے سے اتنا گھبرایا کہ وہاں سے  
فرار ہی ہو گیا۔“

”ہاں یار، میری سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا کہ مجھے کیا کرنا  
چاہیے۔“

”اقبال اپنی ذاتی دشمنی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔“  
افتخار نے کہا۔ ”زینت نے پولیس کو یہی بیان دیا ہے کہ پہلے  
اقبال کی سب کلامی ہوئی پھر اسے گولی مار دی گئی۔ اس بیان  
میں تیرا ذکر نہیں ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔  
”اب تو مجھے بتا دے کہ تو نے اقبال کو کیوں مار  
دیا؟“ افتخار نے پوچھا۔

اس کی بات پر میں بری طرح اچھل پڑا۔ میں نے  
مخاطب انداز میں کہا۔ ”اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار  
دیتا۔ تو نے مریم کو تو دیکھا ہوگا۔ اقبال کا خیال تھا کہ میں  
مریم کو درگزر رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ افتخار ہنس کر بولا۔ ”یہ چکر تھا۔ اس کا  
مطلب ہے کہ مریم بھی...“

”ہاں، وہ بھی میرے ساتھ ہے۔“ میں نے جواب  
دیا۔

”تو ہے کہاں؟“ افتخار نے اچانک پوچھا۔  
”اس وقت تو میں گجرات میں ہوں، کل شاید کراچی  
چلا جاؤں۔“

”یار! اگر وقت ہو تو لاہور سے ہو کر کراچی جانا۔“  
”ہاں، وقت ملا تو میں تیرے پاس ضرور آؤں گا۔“

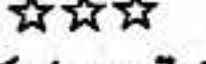
میں نے سلسلہ منقطع کر کے مریم کو افتخار کی کال کے بارے  
میں بتایا۔

”زینت آنٹی بہت اچھی ہیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں  
تمہارے ساتھ ہوں۔ انہوں نے مجھے بچانے کے لیے اتنا  
بڑا جھوٹ بول دیا۔“

افتخار کے ٹیلی فون کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب  
کم از کم مجھے افتخار یا اس کے باپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اگلے دن میں کراچی کے لیے سٹیشن تک کرانے گیا تو  
معلوم ہوا کہ کل تک کوئی بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔ قومی  
ائر لائن میں، نہ کسی دوسری ائر لائن میں۔

اس سے اگلے دن میں نے دگنے پیسے خرچ کر کے  
فلائنٹ میں سٹیشن تک کرا لیں۔



میں کراچی پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ اپنا شہر  
دیکھ کر مجھے خاصی طمانیت کا احساس ہوا۔ میں گھر پہنچنے کے  
لیے اتنا بے قرار تھا کہ ہر طرح کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ  
کر میں ائر پورٹ سے سیدھا گھر پہنچ گیا۔ ٹیکسی میں نے گلی  
کے ٹر پر ہی چھوڑ دی لیکن گھر پہنچ کر میرا دماغ بھک سے اڑ  
گیا۔ میری آہنی گیٹ میں پڑا ہوا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے اپنے پڑوسی بیگ صاحب کی ڈور تکل بجا  
دی۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ کھلا اور انکل بیگ باہر نکل آئے۔  
مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار  
ہوئے اور وہ درشت لہجے میں بولے۔ ”اب تم یہاں کیا لینے  
آئے ہو علی؟“

”میں سمجھا نہیں انکل... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“  
میں نے الجھ کر پوچھا۔

”میاں! میں اور کیا کہوں، جب تم نے اپنے باپ  
کے جنازے میں آنا بھی گوارا نہ کیا تو اب...“

”کیا کہہ رہے ہیں انکل؟“ میں نے وحشت زدہ ہو  
کر پوچھا۔ ”کیا ابو...“

”ہاں۔“ انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ”ان کا  
انتقال تو اسی رات ہو گیا تھا جب انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔“

ان کے الفاظ پچھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے  
کانوں میں پڑ رہے تھے۔ میرا سر بری طرح چکرایا اور اگر  
میں فوراً ہی دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو اونڈھے منہ زمین پر  
گرتا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے روتے  
ہوئے پوچھا۔ ”اور... امی... اور سیما؟“

”تم نے نہ جانے کیا چکر چلایا تھا۔“ بیگ صاحب  
نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہاری امی، بیٹی کی عزت  
بچانے کے لیے گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ بس  
مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔“ انہوں نے بے اعتنائی سے کہا۔

”ہاں، تمہاری امی جاتے ہوئے مجھے گھر کی چابی دے گئی  
تھیں کہ شاید تم لوٹ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور چابیاں  
لا کر میرے حوالے کر دیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔  
میں نے کانپتے ہاتھوں سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ہر چیز جوں کی توں تھی۔ امی کی چوکی، ابو کی مخصوص  
کرسی۔ سبھی کچھ تھا لیکن گھر کے کہیں نہیں تھے۔

میں برآمدے میں بچی چوکی پر ڈھیر ہو گیا اور بلک  
بلک کر رونے لگا۔

روتے روتے مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ  
محسوس ہوا۔ وہ مریم تھی۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی رو رہی  
تھی۔

روتے روتے میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔ ڈاک  
کا وہ لفافہ دروازے کے نزدیک گمن میں پڑا ہوا تھا۔ میں  
نے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھالیا۔ وہ احسن کا بھیجا ہوا لفافہ تھا۔ اس  
کی تحریر میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں نے بے صبری  
سے لفافہ چاک کر کے اس میں سے خط نکال لیا۔

احسن نے لکھا تھا۔

”علی! تم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں لیکن لگتا ہے  
اب تم سے ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ جس دن انکل کو ہارٹ  
ایفک ہوا تھا، اسی دن ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے جان  
بوجھ کر تم سے یہ بات چھپائی۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں  
ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر دوسرے دن وہ امریکی لڑکی دو  
آدمیوں کے ساتھ تمہارے گھر آگئی اور امی اور سیما کو  
زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ ان سے تمہارا پتا پوچھ رہی  
تھی۔ سیما نے تمہیں کال کی تو تمہارا نمبر بند تھا پھر اس نے  
مجھے کال کی اور بتایا کہ یہ لوگ بھیا کا پتا پوچھ رہے ہیں۔ پھر  
سیما کے ہاتھوں سے کسی نے سیل فون چھین لیا اور بولا...“

علی! تم جہاں بھی ہو سامنے آ جاؤ ورنہ ہم تمہاری ماں اور  
بہن کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں، تمہاری بہن کو اتنی آسانی  
سے نہیں ماریں گے بلکہ پہلے اس کی آبرو کو پامال کریں گے۔  
میں نے جذباتی لہجے میں کہا کہ میری ماں اور بہن کو چھوڑ دو۔  
میں کل شام تک کراچی پہنچ جاؤں گا۔“

”تم جب تک نہیں آؤ گے، تمہاری ماں اور بہن  
ہمارے قبضے میں رہیں گی۔“

”میں نے انکل سے بات کی۔ وہی انکل جو ہوم  
منسٹری میں سیکرٹری ہیں۔ انہوں نے کرائم برانچ کے ایک  
ایس ایس پی کو یہ کیس دے دیا۔ ایس ایس پی آصف بہت  
اچھا فائر ہے۔ اس نے بہت تیزی سے تحقیقات کیں اور مجھے  
بتایا کہ یہ امریکی لڑکی اس سے پہلے بھی اس قسم کی کئی  
وارداتیں کر چکی ہے۔ یہ یہاں کے سیدھے سادے

کسی بھی شخص کی کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جو پیدائش سے موت تک ایک ہی حالت پر رہتی ہو... انسان محض تغیر پذیر صفات کا مجموعہ نہیں... اس مجموعے کا مرکز ایک تغیر ناپذیر حقیقت ہے... اور وہ روح ہے... روح کے دو حصے ہیں... مجرد روح اور ہوائی روح... مجرد روح عالم ملکوت کی شے ہے... مجرد روح اور جسد عنصری کے اس مرکب کا نام ہوائی روح ہے... قانون قدرت ہے کہ عناصر باہم مل کر مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں... موت بدن سے ہوائی روح کے الگ ہوجانے کا نام ہے... معدوم ہوجانے کا نہیں... موت کے بعد بھی ہوائی روح کے اثرات اس قدر باقی رہ جاتے ہیں کہ ان سے مجرد روح کا رابطہ قائم رہے... انسان کے بہت سے فعل اسرار و کشف اور الہام سے ظاہر و عیاں ہوجاتے ہیں... شعور اور لاشعور کی دیبیز تہوں میں پوشیدہ عوامل کی حقیقتوں کو بیان کرتی پُر تحریر تحریر...

انسانی ذہن اور باطن کی کیفیات کا اجزا... سرپرست رازوں کا سنسنی خیز انکشاف

کاشف زبیر  
رابطہ



شیراز سید میوں سے اوپر آیا تو اسے لگا کہ معاذ کی سے بات کر رہا ہے۔ شیراز تقریباً چھتیس برس کا خوش رو اور چہرے جسم کی وجہ سے کم عمر نظر آنے والا مرد تھا۔ معاذ اس کا بیٹا تھا اور وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ اس سال اسے اسکول میں داخل کرانا تھا۔ شیراز نے ہاتھ روم میں جھانکا۔ معاذ ہاتھ میں بیٹھا تھا اور اس کا رخ واٹش بیسن کی طرف تھا۔ شیراز مسکرا دیا۔ وہ اپنے بیٹے کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ اکلوتا تھا اور بہن بھائی کے حوالے سے تنہائی محسوس کرتا تھا

ان لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اگر مجھے میرے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملے تو لی مارکیٹ میں ڈی لکس ہوٹل کے مالک جان محمد سے رابطہ کرنا، فقط احسن۔“  
خط پڑھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ احسن نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی۔ وہ صحیح معنوں میں میرا دوست تھا۔ میں نے اسی وقت موٹر سائیکل نکالی اور لی مارکیٹ روانہ ہو گیا۔ جان محمد کو ڈھونڈنے میں مجھے کوئی وقت نہ ہوئی۔ وہ علاقے کا مشہور آدمی تھا۔ مشہور کیا بلکہ بدنام آدمی تھا۔ میں نے اس سے احسن کے بارے میں پوچھا تو وہ چونک اٹھا پھر مجھے اس کے چہرے پر تاسف کے آثار دکھائی دیے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”واجباً ہم علی صاحب کو بچا نہیں سکا۔ بس مجبوری تھی۔“  
میں چکر اکر بیٹھ گیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں۔ دنیا کو بتاؤں کہ میں ہی وہ خود غرض اور لاپچی انسان ہوں جو دولت کی خاطر اپنے باپ کو کھاکھا گیا۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز دوست کو کھاکھا گیا۔ اس دولت کی خاطر میری پھول سی نازک بہن اور نیک طینت ماں نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہوں گی۔

اچانک میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ سارا کیا دھرا اس دولت ہی کا تھا۔ کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں کا جن کی وجہ سے میں یتیم ہو گیا تھا۔

میں نے سارے نوٹ مٹھن میں ڈھیر کر دیے۔ پھر اپنی موٹر سائیکل سے پیٹرول نکالا اور نوٹوں پر چھڑک کر آگ لگا دی۔

آگ کی رنگ برنگی لپٹیں اٹھیں اور فضا میں گم ہو گئیں۔

پھر جب تک وہ تمام نوٹ راکھ میں تبدیل نہ ہو گئے۔ میں مٹھن میں بیٹھا نہیں دیکھتا رہا۔ انہیں راکھ ہوتا دیکھ کر میرے دل کو عجیب سا سکون ملا۔

میں نے امی اور سیمیا کی تلاش میں کراچی کا کونا کونا چھان لیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اگر مریم نہ ہوتی تو شاید میں پاگل ہو جاتا یا خودکشی کر لیتا۔ مریم نے ہر ہر طرح سے میری دل جوئی کی اور تسلیاں دیں۔

مجھے آج بھی امی اور سیمیا کا انتظار ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے وہ اچانک گھر میں داخل ہوں گی اور مسکرائی ہوئی مجھ سے لپٹ جائیں گی۔ کاش ایسا ہوجائے، کاش...!



نوجوانوں کو اسی طرح پھنساتی ہے پھر ساری رقم ان سے لے کر انہیں ہلکے میل کرتی ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو ورنہ تمہارا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم سے قائم کر دیا جائے گا۔ تمہارے خلاف وہ رقم ہی سب سے بڑا ثبوت ہوگی جو تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرائی گئی ہے کہ تم نہ صرف دہشت گرد ہو بلکہ دہشت گردوں کا پورا نیٹ ورک چلا رہے ہو اور تمہیں بیرونی ممالک سے فنڈنگ ہورہی ہے۔ لوگ خوف زدہ ہو کر اس کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس لڑکی کا تعلق ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیم سے ہے۔ وہ مافیا اتنی طاقتور ہے کہ کئی حکومتیں بھی اس کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔

”اس ایس بی اے سے گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ کسی امریکی شہری کو بغیر ثبوت کے پکڑا بھی تو نہیں جاسکتا۔“

”اب یہی ایک طریقہ تھا کہ میں خود کو علی بن کر ان لوگوں کے پاس جاؤں اور انہی اور سیمیا کو وہاں سے نجات دلاؤں۔ میں نے یہی کیا۔ میں نے سیمیا کے سل فون پر انہیں پیغام دیا کہ میں گھر میں موجود ہوں، بتاؤ کہاں پہنچتا ہے؟“

”اس لڑکی نے مجھے گھر ہی پر رہنے کی ہدایت کی اور تھوڑی دیر بعد وہ خود گاڑی میں آئی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے مجھ سے رقم کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا کہ جب تک تم میری ماں اور بہن کو نہیں چھوڑو گی، میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”اس نے امی اور سیمیا کو چھوڑ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اب وہ گھر میں نہ ٹھہریں بلکہ کسی رشتے دار کے گھر چلی جائیں۔“

”ان کے جانے کے بعد اس امریکی لڑکی نے مجھ سے رقم کے بارے میں پوچھا۔ رقم میرے پاس تھی ہی نہیں تو میں اسے کہاں سے دیتا۔ اس نے مجھ پر تشدد کی انتہا کر دی۔ میری حالت مردوں سے بھی بدتر ہو گئی۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اسی حالت میں ایک دن اس کا ریوالور میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر اس امریکی لڑکی اور اس کے ساتھی کو گولی مار دی اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کا تیسرا ساتھی میرے تعاقب میں لگ گیا۔ میں نے لی مارکیٹ کے علاقے میں پناہ لی لیکن وہ آدمی میرے تعاقب میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ظاہر ہے وہ ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ مافیا کارکن تھا اور ہر طرح سے تربیت یافتہ تھا۔ میں یہ خط تمہیں وہیں سے لکھ رہا ہوں۔ اس امریکن ایجنٹ نے کچھ مقامی آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں اور

بنائے تھے۔ اب جسے کھانا تھا، وہ خود کچن میں جا کر ڈسپوزیبل پلیٹ میں نکال لاتا اور جہاں مرضی ہوتی بیٹھ کر کھاتا۔ شیراز کو بھوک لگ رہی تھی اس لیے شام ختم کر کے وہ اپنے لیے کھانا لے آیا اور باہر بیڑیوں پر آ گیا جہاں احمد نواز سامنے رہنے والے تویر سے بات کر رہا تھا۔ تویری سے ڈے اے میں کام کرتا تھا۔ شیراز ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ احمد نواز ساٹھ سال کا ہونے والا تھا اور اگلے سال اس کی ریٹائرمنٹ تھی۔ شیراز نے پوچھا۔ ”ملک صاحب! ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ارادہ ہے؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”محلے کی دیکھ بھال... مجھے تو چوبیس گھنٹے یہاں رہنے کا موقع ملے گا۔ تم جانتے ہو مجھے اس جگہ سے عشق ہے۔ اب تو گاؤں جانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ میری تو خواہش ہے کہ مروں تو مکان کے سامنے والے لان میں دفن کر دیا جائے۔ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں۔ قبرستان یہاں سے دور ہے۔“

”ملک صاحب! ابھی تو آپ جوان ہیں، مرنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“ شیراز ہنسا۔ ”ویسے واحد کا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں میں نگراد ہوگا۔“

”ہم گلی بانٹ لیں گے۔“ احمد نواز نے فوری صل نکال لیا۔

”لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ واحد آگیا۔

تویر، اس کے برابر والا رزاق شاہ اور سہیل خان سب سے شیراز کی سلام دعا اور بے تکلفی تھی لیکن دوستی صرف واحد سے تھی۔ عمروں کے فرق کے باوجود ان کے مزاج اور ذہن ملتے تھے۔ گیارہ بجے تک نصف لوگ رخصت ہو گئے کیونکہ انہیں صبح دفتر جانا تھا۔ شیراز اور کچھ دیگر جو اپنا کام کرتے تھے، ان کو فکر نہیں تھی۔ شیراز صبح دس بجے دفتر جاتا اور چار بجے واپس آ جاتا تھا۔ کنسرشن کے معاملات ایک فرم کے سپرد تھے مگر شیراز صرف سفارش کرتا تھا ورنہ اس سے نقشہ بنوانے والا آزاد تھا کہ جس سے چاہے کنسرشن کروالے۔ البتہ شیراز تعمیراتی معیار کو سپرد کرتا تھا کیونکہ یہ اس کی ساکھ کا معاملہ تھا اس کے نقشہ کیے مکان یا تعمیر میں کوئی خرابی نکلتی تو اس کی ساکھ بھی متاثر ہوتی۔ ویسے اس کا کام مزے کا تھا۔ بارہ سال پہلے آرکیٹیکٹ میں ماسٹر کے بعد اس نے چار سال ایک فرم میں کام کیا اور پھر اپنی فرم کھول لی۔ دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دس منٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ اس نے گھر کے تہ خانے میں بھی ایک چھوٹا سا

واحد انصاری تقریباً بیالیس برس کا کسی قدر چھوٹے قد اور گول چہرے والا شخص تھا۔ ماتھا بال اڑنے سے فراخ ہو گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہمہ وقت ایک مسکراہٹ رہتی تھی۔ مسرتویر نے ہنس کر کہا۔ ”آپ محلے کے دوسرے جوڑوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں واحد بھائی۔“

”اس پر آئندہ پارٹی میں ایک ریفرنڈم کرایا جائے گا۔“ واحد نے کہا۔ ”آج کی پارٹی نئے مہمان کے اعزاز میں ہے۔“

تمام مہمانوں کے آنے کے بعد واحد نے شیراز کو کوئلہ ڈرئک کاٹن تھمایا اور آہستہ سے بولا۔ ”آج کی نئی مہمان کچھ خاص ہے۔“

نئے مہمان کا مطلب تھا کہ محلے میں کوئی نیا آیا تھا یا اگر کسی کے گھر کوئی مہمان آیا ہوتا تو پارٹی میں اسے نئے مہمان کا درجہ ملتا تھا۔ شیراز نے پوچھا۔ ”کوئی نیا آیا ہے؟“

”ہاں، بی سیون میں ایک خاتون آئی ہے، ثمنینہ صادق۔“

”شادی شدہ؟“

”ہاں لیکن اب بیوہ ہے۔ ایک بارہ تیرہ سال کی بیٹی ہے۔ خود تقریباً پینتیس برس کی ہے۔“ واحد نے بتایا۔ ”دو دن پہلے شفٹ ہوئی ہے۔ کل میں اور سارے جا کر اسے دعوت دے کر آئے تھے۔ ویسے بھی دو ہفتے سے مل کر نہیں بیٹھے تھے، میں نے سوچا اس بہانے سے مل بیٹھیں گے۔“

ثمنینہ صادق جوان اور دل کش عورت تھی۔ اس کے سیاہ بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے اور سیاہ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ وہ خواتین کے درمیان بیٹھنے کی نہایت بے تکلفی سے سگریٹ پی رہی تھی۔ شیراز نے اس سے پہلے سگریٹ نوش خواتین دیکھی تھیں لیکن ان میں اتنا گھر لیون نہیں ہوتا جتنا ثمنینہ صادق میں محسوس کیا جاسکتا تھا۔ واحد نے شیراز اور ماہا کا تعارف کرایا۔ شیراز نے سر ہلایا اور ماہانے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”دیکھ... ماہانے کہا۔“

”مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ ہمارے محلے کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ اتنا سا محلہ ہے ایک خالی گھر بھی محسوس ہوتا ہے۔“

”مجھے بھی یہاں کا ماحول اچھا لگا ہے۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ”یہاں سکون اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ میں خود بھی تنہائی پسند ہوں۔“

”آپ بے فکر رہیں، یہاں کوئی آپ کی تنہائی میں... بلاوجہ خل نہیں ہوگا۔“ شیراز نے کہا۔ اسی دوران میں سارے نے کھانے کا اعلان کیا۔ اس نے شاٹلک اور فرائڈ رائس

اپنے گھر میں ہیں۔“

آئی رو بینہ مسکرائیں۔ ”اپنا گھر سمجھ کر تو آئی ہوں۔ تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ۔“

”معاذ اوپر ہے، وہ نو بجے سونے چلا جائے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آپ یہاں ہیں اگر کوئی مسئلہ ہو تو وہ آپ کو آواز دے گا۔“

”تم بے فکر رہو میں سوؤں گی نہیں۔ جاگنے کا سامان لے کر آئی ہوں۔“ انہوں نے چھوٹی سی باسکٹ سے تنگ کی سلامیاں اور اون کا گولا نکال کر دکھایا۔ ”اپنے پوتے کے لیے سویٹر بن رہی ہوں۔“

کل رات واحد نے کال کر کے پارٹی کا کہا تھا مگر وجہ نہیں بتائی تھی۔ دس منٹ بعد وہ دونوں تیار ہو کر باہر نکل گئے۔ نومبر کے وسط میں اچھی خاصی سردی ہو گئی تھی۔ یہ گلی دارانگھومت کے دو سیکٹرز کے درمیان تھی اور اس کے آگے پیچھے جنگل تھا۔ یہ آگیا ہوا جنگل تھا جس میں درخت ترتیب سے لگائے گئے تھے مگر برسوں گزرنے کے بعد اس نے خود رو جنگل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پلاٹ زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن ایک کمپنی نے ان پر ایک جیسے گھر بنا کر فروخت کیے تھے اور یہ گھر جدید انداز کے تھے۔

شیراز کے برابر والا مکان ڈی ایس پی ملک احمد نواز کا تھا۔ وہ چہرے سے سخت نظر آتا تھا مگر عام پولیس والوں سے قطعی مختلف تھا۔ محلے کے ہر فرد سے اس کے بہترین تعلقات تھے۔ ملک احمد نواز کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا

شاہنواز اور ایک بیٹی شائستہ تھی۔ شاہنواز ایم بی اے کے آخری سال میں تھا اور شائستہ گریجویشن کر رہی تھی۔ اس نے بھی یہ مکان تقریباً شیراز کے ساتھ لیا تھا۔ احمد نواز کے بعد واحد کا مکان تھا۔ واحد محکمہ داخلہ میں افسر تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ یہاں دس سال پہلے آیا تھا اور پرانے لوگوں میں سے تھا۔ اس کا بیٹا راجیل یونیورسٹی میں شاہنواز کے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ مگر وہ اس سے تین سال چھوٹا اور بی بی اے کے ابتدائی سیمسٹر میں تھا۔ باہر آنے پر ماہانے اپنی

شال لپیٹ لی تھی۔

”آج سردی بہت ہے۔“

”میرا خیال ہے سونے سے پہلے ہیٹر چلانا پڑے گا۔“ شیراز نے اس کی تائید کی۔ وہ واحد کے مکان میں داخل ہوئے تو اس نے گرم جوٹی سے ان کا استقبال کیا اور بلند آواز سے بولا۔

”ہمارے محلے کا سب سے خوب صورت جوڑا۔“

اس لیے خود سے بات کر رہا تھا۔ ربر سے بنے ٹپ میں ہوا بھری ہوئی تھی اور یہ خاص طور سے چھوٹے بچوں کے لیے بنایا گیا تھا کہ انہیں چوٹ لگنے یا ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو۔ شیراز نے تویا لیتے ہوئے اسے لپیٹ کر اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ وہ اسے خشک کرتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ نے سونا ہے۔“

معاذ نے اپنی چھوٹی سی انگلی اٹھا کر کہا۔ ”مجھے ٹی وی دیکھنا ہے۔“

”نہیں، سونا ہے۔“ شیراز نے کہا۔ ”میں آپ کی ماما کے ساتھ واحد انگل کے ہاں جا رہا ہوں۔“

”ٹی وی۔“ معاذ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ابھی نو نہیں بچے ہیں۔“

”اوکے ٹی وی... لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک نو بجے آپ کو بستر پر ہونا ہے۔“

”پراسپا! معاذ نے کہا تو شیراز نے اسے پیار کیا۔“

”میرا اچھا بیٹا۔“

شیراز نے اسے بستر پر بٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور ریوٹ ایسے تھمایا۔ معاذ کارٹون شوق سے دیکھتا تھا۔ ماہا تیار ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی دہلی پتلی لیکن خوش شکل اور دل کش عورت تھی۔ سرخی مائل رنگت کی وجہ سے اس کے چہرے نقش و نگار اچھے لگتے تھے۔ ماہانے پوچھا۔ ”آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“

”معاذ کو کون دیکھے گا؟“ شیراز نے سوال کیا۔

”میں نے رو بینہ آنٹی کو کہہ دیا ہے، وہ رکھیں گی جب تک ہم واپس نہیں آجاتے۔“ ماہانے کہا۔ اسی لمحے کال بیل بجی۔ ”میرا خیال ہے، وہ آگئی ہیں تم دیکھ لو۔“

رو بینہ آنٹی ان کی گلی میں سامنے والی لائن میں رہتی تھیں۔ تقریباً ساٹھ برس کی خوش مزاج خاتون تھیں اور محلے والوں سے ان کی اچھی بنتی تھی کیونکہ وہ ہر ایک کے کام آتی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا بھوی بچوں کے ساتھ مڈل ایسٹ میں ہوتا تھا۔ مالی لحاظ سے آسودگی تھی لیکن رو بینہ آنٹی بیٹے اور اس کے بچوں کی کمی محسوس کرتی تھیں۔ یہاں وہ صرف ایک ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ شاید اسی لیے ان کا اکثر وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ ماہا کی درخواست پر وہ خوشی سے مان گئی تھیں۔ پہلے بھی وہ کئی بار معاذ کی دیکھ بھال کر چکی تھیں۔ شیراز انہیں لاؤنج میں لے آیا۔ بڑائی وی یہاں تھا اور ایک ٹی وی ان کے بیڈروم میں تھا۔ شیراز نے کہا۔ ”آپ کا شکر یہ آنٹی... آپ یہاں ٹی وی دیکھیں اور فرنیچ میں سب کچھ موجود ہے، سمجھ لیں آپ

سیٹ اپ بنایا ہوا تھا۔ اگر کام زیادہ ہوتا تو وہ گھر لے آتا اور یہاں کر لیتا۔ بہر حال اسے زیادہ دیر دفتر میں نہیں بیٹھنا پڑتا تھا۔

شیراز اندر آیا تو پارٹی میں اب کم لوگ رہ گئے تھے اور وہ سب نشست گاہ میں جمع تھے۔ سارہ نے شمینہ سے کہا۔ ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”نام تو آپ جانتے ہیں۔ میں بیوہ ہوں۔ میرے شوہر ڈاکٹر صادق حسن ماہر نفسیات تھے۔ دو سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میں بھی ماہر نفسیات ہوں۔“

سب نے افسوس کیا پھر شیراز نے کہا۔ ”کام دلچسپ ہے۔“

شمینہ مسکرائی۔ ”اتنا بھی نہیں کیونکہ بہت سے لوگ بالکل پسند نہیں کرتے کہ انہیں کبھی کسی ماہر نفسیات کی خدمات کی ضرورت پڑے۔ ویسے میں علاج کرنے والی ماہر نفسیات نہیں ہوں۔“

”تو پھر؟“ ماہانے پوچھا۔

”میں ریسرچ ورک کرتی ہوں۔ ایک این جی او ہے۔ ہمارے کچھ پروجیکٹس ہیں، ان پر کام کرتی ہوں۔ این جی او ڈاکٹر صاحب نے قائم کی گئی پھر میں ان کے ساتھ۔ بطور ریسرچ منسلک ہو گئی۔ ہمارے درمیان انڈرا سٹینڈنگ ہوئی تو شادی کر لی۔“

”ریسرچ ورک؟“ شیراز نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”نفسیات اور مابعد الطبیعیات۔“

”اوہ... ماورائی واقعات اور پراسرار دنیا آپ کے پروجیکٹس ہیں۔“ شیراز نے کسی قدر مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ماہانے اسے چٹکی کاٹی تو وہ جلدی سے بولا۔ ”پلیز... میں مذاق کر رہا ہوں۔“

”میں نے بُرا نہیں منایا۔ امید ہے آپ لوگ بھی میری اسموکنگ کا بُرا نہیں منائیں گے۔“ اس نے ایک سگریٹ اور سلگایا۔ ”آپ اسے روحانی سائنس بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے سائنس دو جہج دو برابر چار ہوتی ہے۔“ شیراز نے کہا۔

”اس کے برعکس فزکس ہمیں بتاتی ہے کہ مادے کی دو اکائیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں۔“ شمینہ نے کہا۔ ”ہماری دنیا کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے جس کا ہم ادراک نہیں

”ہاں اس کے لیے ماحول کی شرط نہیں ہے۔ وہ سب بھول جائیں جو فلموں اور کہانیوں میں بتایا جاتا ہے۔“

شیراز نے آنکھیں بند کر لیں اور توجہ شمینہ کی آواز پر مرکوز کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہی گھسا پٹا راگ الاپے گی۔ ”تمہیں نیند آرہی ہے۔“ مگر اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”مسٹر شیراز! تمہیں سنیما یا ٹھیٹر میں سے کیا پسند ہے؟“

”سنیما۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کے تم تصور کرو تم ایک سنیما میں ہو۔“ شمینہ کے لہجے میں ارتعاش سا آگیا۔ ”اس کی دیواریں اور نشستوں کے کورسرخ رنگ کے ہیں... سامنے سفید اسکرین ہے... اس کے دائیں بائیں سرخ پردے ہیں... مگر اب ان کا رنگ سیاہ ہو رہا ہے... دیواروں کا... نشستوں کا... سیاہ رنگ ہر طرف چھا رہا ہے۔“

”ہاں، سب سیاہ ہو رہا ہے۔“ شیراز نے دہمکی اور گہری آواز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹرانس میں آ گیا ہے۔ سب دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ساکت بیٹھا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے آنکھیں بند کی ہوئی ہوں۔ کچھ اس پر یقین کر رہے تھے اور بعض کے چہروں پر بے یقینی تھی۔ وہ اسے صرف ایک تماشا سمجھ رہے تھے اور شیراز کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ٹرانس کا ایکٹ کر رہا ہے۔ صرف اس کے برابر میں بیٹھی ماہا جانتی تھی کہ وہ ایکٹ نہیں کر رہا ہے۔ اس کا جسم سونے والی حالت میں آ گیا تھا اور ماہا اس کی یہ کیفیت اچھی طرح جانتی تھی۔

شیراز، شمینہ کی آواز سن رہا تھا۔ ”اب پورا سنیما سیاہ رنگ میں رنگ گیا ہے۔ صرف ایک چیز سفید ہے اور وہ ہے اس کی اسکرین...“

”ہاں اب صرف اسکرین سفید ہے باقی سب سیاہ اور تاریک ہے۔“

”اسکرین سفید ہے... تم اپنی پسندیدہ نشست پر بیٹھے ہو... بالکل وسط میں... اسکرین پر کچھ الفاظ ہیں... تم دیکھ رہے ہو... لیکن وہ واضح نہیں ہیں۔“

”ہاں، وہ واضح نہیں ہیں۔“

”تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”او کے، تم اسکرین کے پاس جا رہے ہو... الفاظ آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہے ہیں... اب تم دیکھ سکتے ہو... اسکرین پر کیا لکھا ہے؟“

”نیند۔“ شیراز نے کہا اور چونک کر اٹھا۔ سب ہنس

رہے تھے۔ اس نے ماہا کی طرف دیکھا۔ ”کیا... کیا ہوا؟“

ماہا بولی۔ ”تم سونا چاہتے ہو۔ تم نے کہا تمہیں نیند آرہی ہے۔“

واحد ہنسا۔ ”تم ڈراما کر رہے تھے، اصل میں تمہیں نیند آرہی ہے۔“

”یہ ڈراما نہیں تھا۔“ شمینہ نے اٹھ کر شال اوڑھی۔

”مسٹر شیراز مبارک ہو... تم بہت اچھے معمول ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے کسی کو اتنی تیزی سے اور بالکل واضح انداز میں ٹرانس میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ تم کیا ب لوگوں میں سے ہو۔ شاید سو میں سے کوئی ایک شخص ہی اچھا معمول ہوتا ہے۔“

”بچہ جہورا۔“ واحد نے آواز نکالی۔ ”میں کون حامل... تو کون معمول۔“

”شٹ اپ۔“ شیراز نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔ روہینہ آئی کو زیادہ زحمت دینا مناسب نہ ہوگا۔“

وہ سب سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر باہر آئے تو ماہا نے کہا۔ ”تم سچ سچ جیسے گہری نیند میں چلے گئے تھے۔ میں تمہاری یہ کیفیت جانتی ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم لیکن وہ جو کہہ رہی تھی، میں بالکل صاف دیکھ رہا تھا۔“

”شمینہ کا کہنا ہے کہ تم وہی سن رہے تھے جو اس نے خاص طور سے تمہارا نام لے کر کہا۔“

”کیا اس نے کچھ اور بھی کہا تھا؟“

”ہاں، وہ بتاتی رہی تھی کہ یہ سب کیا ہوتا ہے۔“ ماہا نے سر ہلایا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس کچھ حیات اور بھی ہوتی ہیں لیکن وہ لاشعور اور تحت اشعور کے تحت کام کرتی ہیں۔ ٹرانس کی حالت میں یہ دونوں شعور سے مل جاتے ہیں اور تب انسان دوسری دنیا سے رابطہ کر سکتا ہے۔“

شیراز نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے نہیں سنا کہ اس نے ایسا بھی کچھ کہا ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے وہ صرف مجھ سے بات کر رہی تھی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، تم کتنی دیر ٹرانس میں رہے؟“

”شاید دس منٹ۔“

”تم پورے آدھا گھنٹا ٹرانس میں رہے۔ میرے خدا! میں نے آج تک ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا لیکن

شیراز اس تجربے سے گزرا تھا مگر اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھر واپس آئے تو آئی رو بیٹھتی وی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے آواز بند کر رکھی تھی تاکہ معاذ کی طرف سے خبردار رہیں۔ جاگنے کی کوشش میں ان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ماہانے معذرت کی کہ انہیں کچھ دیر ہوگئی۔ پھر وہ انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔ معاذ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ شیراز نے اسے پیار کیا اور اپنے بیڈروم میں آیا۔ ماہ اور وازے کھڑکیاں چیک کرنی اور لاش آف کرنی ہوئی اوپر آئی۔ اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ شیراز رات کا لباس پہن کر بستر پر آیا۔ کچھ دیر بعد ماہا بھی کپڑے بدل کر آگئی۔

شیراز نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔  
”اسکول جا ب کا کیا سوچا ہے؟“  
”وہ جنوری سے بلا رہے ہیں مگر میں سوچ رہی ہوں کہ پہلے معاذ کو اسکول میں داخل کرا دوں۔ اسی اسکول میں... وہاں سٹم بہت اچھا ہے۔ معاذ میرے ساتھ آئے جائے گا۔“

ماہانے ایجوکیشن میں ماسٹر کیا تھا اور شادی کے بعد بھی وہ امید سے ہونے تک جا ب کرنی رہی تھی۔ وہ ہائر کلاسز کو پڑھاتی تھی۔ معاذ اب بڑا ہور ہا تھا اور اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ ماہانے اسے گھر میں بہت کچھ سکھا دیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ بس ایک سال کی اسکولنگ کے بعد پہلی کلاس میں چلا جائے۔ جب وہ اور شیراز معاذ کے لیے اسکول گئے تو انتظامیہ نے ماہا کو بھی جا ب کی پیشکش کر دی۔ وہ اچھا پیکج دے رہے تھے۔ اگرچہ بیس ہزار شیراز کی آمدنی کا ساتواں حصہ بھی نہیں تھے لیکن اپنی کمائی کی بہر حال اہمیت ہوتی ہے۔ شیراز نے کہا۔ ”اگر تم خواہش مند ہو تو کولو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی اور کو رکھ لیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں لیکن پھر معاذ کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو رکھنا ہوگا۔ کم سے کم تین مہینے کے لیے۔“  
”کوئی ملازمت تلاش کر لو لیکن اعتماد والی ہو۔“ شیراز نے کہا اور سیدھا لٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ رات کی وقت اسے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور انگلیاں نیچے ٹیک کر زور لگایا تو اس کا ناخن فرش سے رگڑ کھا کر اٹھ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ اچانک اٹھ بیٹھا مگر چیخ بھی خواب میں تھی۔ حقیقت میں اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے بے

جاسوسی ڈائجسٹ - 262 - مئی 2014ء

ساتھ اپنا ہاتھ دیکھا، اس کا تان اپنی جگہ تھا مگر ہاتھ لرز رہا تھا۔ اس نے دیکھا بیڈ شیٹ سسٹی ہوئی تھی جیسے اس نے اسے منہ میں جکڑا ہوا ہو۔ برابر میں ماہا بے خبر سو رہی تھی۔ جس زمانے میں وہ اپنی فرم سیٹ کر رہا تھا، اسے بہت زیادہ محنت سے اعصابی کشیدگی کا مرض لاحق ہوا تھا تب ڈاکٹر نے اسے اعصابی سکون کے لیے ایک دوا دی تھی۔ شیراز ٹھیک ہو گیا تھا مگر اب بھی کبھی کبھی اسے دوا کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ لرزتے دیکھا تو اٹھ کر دراز سے دوا کی شیٹی نکالی اور گلاس میں پانی نکال کر اس کی مدد سے حلق سے اتار لی۔

اس نے گلاس واپس رکھا تو اسے پانی میں سرخی کی آمیزش دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر واش روم میں آیا اور لائٹ آن کر کے اپنا منہ دیکھا تو اسے خون ہونٹوں پر دکھائی دیا۔ اس نے منہ کھولا تو سامنے اوپر والے دانت سے خون رس رہا تھا۔ اس نے گلاس رکھ کر انگلیوں سے دانت پکڑا تو وہ ہلتا ہوا محسوس ہوا اور ذرا سا زور لگانے سے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے بے یقینی سے اپنا دانت دیکھا۔ کل تک اس کا دانت بالکل ٹھیک تھا اور اب یہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا صدے سے بڑا حال ہو گیا کیونکہ اسے اپنی شخصیت اور اپنے دانت بہت عزیز تھے۔ اس کے دانت تھے بھی خوب صورت اور سفید چمکتے ہوئے۔ دانت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر واش بین میں گر ا۔ اس نے دانت دیکھا اور پھر آئینے میں دیکھا تو اسے اپنے ہونٹ صاف دکھائی دیے اس نے جلدی سے منہ کھولا تو اس کے سارے دانت اپنی جگہ موجود تھے۔ اس نے بے یقینی سے واش بین میں دیکھا تو وہاں دانت نہیں تھا اور نہ ہی اب گلاس کے پانی میں خون کی آمیزش تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دانت چھوا اور پھر سر تھام لیا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

☆☆☆

اگلے دن شیراز دفتر میں تھا اور ایک پارٹی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑی ولا بنوانا چاہتے تھے۔ ان کا کسٹمر غیر ملکی تھا اور وہ شمالی علاقے میں ایک ولا بنوانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے شیراز سے رابطہ کیا تھا اور اسے کام کی پیشکش کی تھی۔ انہوں نے شیراز کو سائٹ وزٹ کرانے کو کہا تھا۔ وہ صرف اس کام کے اسے دس ہزار دے رہے تھے اور اخراجات بھی ان کے ذمے تھے اس لیے شیراز نے ہائی بھر لی۔ انہیں وہاں دو سے تین لگ سکتے تھے۔ شیراز نے ماہا

262 - مئی 2014ء

کو بتایا اور اسے اپنا بیگ تیار کرنے کو کہا۔ ماہانے اس کے لیے گرم کپڑے نکالے کیونکہ پہاڑوں پر موسم بہت سرد ہو گیا تھا۔ برف باری کا بھی امکان تھا۔ معاذ کو پتا چلا کہ وہ دو دن کے لیے جا رہا ہے تو وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے شیراز سے پت کر کہا۔ ”پاپا! آپ نہیں ہوتے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔“

وہ ڈنر کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماہانے چونک کر اسے دیکھا۔ شیراز نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹا؟“

”پتا نہیں پاپا۔“ وہ مصیبت سے بولا۔

”آپ فکر مت کرو۔ میں دو دن میں آ جاؤں گا... اور آپ کی ماما بھی تو ہیں پاس۔“

”میں ماما کے پاس سوؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماہانے کہا۔ ”لیکن آپ کھانا کھاؤ۔“

”اور آپ نے سونے سے پہلے دودھ بھی پینا ہے۔“ شیراز نے اس کا سر سہلایا۔ ”یہ سارے کام آپ نے میری غیر موجودگی میں بھی کرنے ہیں۔“

معاذ ماں کے مقابلے میں باپ سے زیادہ قریب تھا اور وہ اس کا کہنا بھی فوراً مانتا تھا جبکہ ماہا اسے کچھ کہتی تو وہ جیل جمت یا بحث کرتا تھا۔ صرف ایک ٹی وی ایسی چیز تھی جس کے لیے وہ اپنی ضد منوا کر چھوڑتا تھا۔ رات سونے سے پہلے وہ لازمی ٹی وی دیکھتا تھا۔ کھانے کے بعد ماہا اسے اوپر لے گئی اور شیراز پلٹیں اٹھانے لگا۔ سنک میں رکھ کر وہ لاؤنج میں آیا اور سامنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے بی سیون میں اوپری کھڑکیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس نے سوچا کہ شبینہ صادق نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اسے گزشتہ رات والی بات یاد آگئی۔ خواب کی حد تک تو وہ پریشان نہیں تھا مگر اس کے بعد جو ہوا تھا، وہ اس کے لیے پریشان کن تھا۔ وہ کسی صورت اسے اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس نے جو دیکھا تھا، وہ بالکل واضح تھا۔ اس نے زور لگا کر دانت نکالا تھا اور اس کے فوراً بعد اس نے دانت اپنی جگہ دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا انوکھا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ کیا یہ شبینہ صادق کی طرف سے ہینٹا ٹرزم کے بعد ہوا تھا؟ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ بُری طرح اچھل پڑا۔ یہ ماہا تھی۔ ”میرے خدا! تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔“

”تم بہت دیر سے پردہ اسی طرح تھامے کھڑے تھے۔“ ماہانے کہا۔ ”سوری، میں نے اچانک چھوا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ شیراز نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”معاذ لپٹ گیا؟“

”نہیں، وہ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔“ ماہانے تشویش سے کہا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ٹی وی اپنا عادی کر لیتا ہے۔“

”میرا خیال ہے آدھے گھنٹے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ نو بجے بستر پر چلا جاتا ہے۔“

اگلے دن شیراز پارٹی کے ساتھ شمالی علاقے روانہ ہوا۔ پانچ گھنٹے کی ڈرائیو تھی اور جگہ بہت خوب صورت تھی۔ کیونکہ ہل اسٹیشن نہیں تھا اس لیے یہاں سکون اور سناٹا تھا۔ شاید اسی لیے کسٹمر نے یہاں ولا بنوانے کا سوچا تھا۔ اس نے لوکیشن دیکھی اور پھر زمین کا معائنہ کیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہاں پہلے ہی کھدائی کر دی گئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زمین کی نوعیت کیا تھی اور وہ تعمیر کا بوجھ برداشت کر سکتی تھی یا نہیں۔ زمین اچھی اور مضبوط تھی۔ اس میں پتھر بہت زیادہ تھے جو پختہ تعمیر کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس نے نقشہ بنانے کے لیے ہاں کر دی۔ پارٹی خوش ہوگئی۔ شیراز کی مالک سے براہ راست بات کرادی گئی اور اس نے شیراز کا منہ مانگا معاوضہ منظور کر لیا۔ یہ اس کے عام معاوضے سے تقریباً پچاس فیصد زیادہ تھا اور پھر اسے ہروزٹ کا معقول الاؤنس دیا جاتا اس لیے وہ بہت خوش تھا۔ واپس آ کر وہ اسی خوشی میں ماہا اور معاذ کو شاپنگ پر لے گیا۔ سردیوں کا آغاز ہو گیا تھا اور ابھی اس کی بھی شاپنگ کرنی تھی اس لیے شیراز نے مناسب سمجھا کہ یہ کام بھی ابھی نٹالے۔ آگے مصروفیات بہت زیادہ تھیں اور ان میں پورا ایک دن صرف شاپنگ کے لیے نکالنا بہت مشکل تھا۔ ماہا اور معاذ بھی خوش ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مصروف ہو گیا۔

آنے والا ایک مہینہ بہت مصروف گزارا۔ مگر اس نے یہ پروجیکٹ مکمل کر لیا اور نقشہ ولا کے مالک کو پسند بھی آیا تھا۔ اب صرف اس کی فنشنگ باقی تھی۔ انہی دنوں واحد نے اسے اطلاع دی کہ آنے والے اتوار سب برف باری کے لیے نزدیک ہی ہل اسٹیشن جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس کے لیے بس ہائر کی جانی اور سب ایک ساتھ جاتے۔ صبح جاتے اور شام تک واپس ہوتی۔ شیراز کا کام نمٹ گیا تھا اس لیے اس نے اوکے کر دیا۔ ماہا اور معاذ بھی پُر جوش ہو گئے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے پہلی برف باری مس کی ہو ورنہ وہ ہر سیزن میں پہلی برف باری میں جاتے تھے۔ اس بار اس پروجیکٹ کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی مگر اب سب جا

جاسوسی ڈائجسٹ - 263 - مئی 2014ء



رہے تھے اور پکنگ بھی ہوتی۔ مل اسٹیشن پر سب اپنی اپنی مرضی سے تفریح کرتے یا مل کر بیٹھے۔ صرف آنا جانا ساتھ تھا۔ مگر خواتین نے کہا کہ وہ گھر سے سب لے کر جائیں گی اور سب ایک جگہ ہی بیٹھ کر کھا لیں گے۔ اس لیے سب نے ڈشیں اور چیزیں بانٹ لیں۔ ماہا بیٹ بڑا بڑا اچھی بناتی تھی اس نے وہ تیار کی۔ سارہ چائے اور کافی بہت اچھی بناتی تھی، یہ اس کے سپرد کردی گئیں۔ باقی سب نے کھانے کا سامان بانٹ لیا۔ مسز تنویر نے سب کے لیے ری فریج منٹ بیک تیار کیے تھے۔

ایک بڑی بس ہائر کی گئی جس میں پورا محلہ آرام سے آگیا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ مل اسٹیشن پہنچے۔ احمد نواز کے ایک واقف کار کا یہاں بنگلا تھا۔ اس نے ایک بڑا کمران کے لیے خالی کر دیا تھا۔ اس میں قالین بچھا تھا اور ساتھ ہی واش روم بھی تھا۔ وہ سامان رکھ کر گھومنے پھرنے کے لیے نکل گئے۔ ان کا گروپ اتنا بڑا تھا کہ سڑک ان سے بھر گئی تھی۔ وہ مل اسٹیشن کے بازار تک آئے۔ خواتین اور لڑکیاں دکانوں میں گھس گھس اور مرد مختلف جگہوں پر گپ شپ کرتے رہے۔ بچے اور لڑکے چہل قدمی کرتے ہوئے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اچانک شور بلند ہوا۔ شیراز واحد اور احمد نواز کے ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ راجیل اور شاہنواز آپس میں بھڑے ہوئے تھے اور شاہنواز راجیل کو رگڑ رہا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں کہیں تو مند تھا۔ وہ تینوں ان کی طرف لپکے۔ احمد نواز اور واحد نے اپنے اپنے بیٹوں کو الگ کیا۔ راجیل ہانپ رہا تھا اور شاہنواز پھرا ہوا تھا۔ وہ پھر راجیل کی طرف بڑھا مگر احمد نواز نے سخت لہجے میں کہا۔

”بس... تم لوگوں نے بہت اچھا تماشا دکھا دیا ہے۔“

شاہنواز کچھ دیر راجیل کو گھورتا رہا جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور پھر وہ پلٹ کر چلا گیا۔ راجیل بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ چلا گیا اور کچھ دیر میں سب معمول پر آ گیا۔ احمد نواز کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ واحد نے اسے تسلی دی۔ ”یار! لڑکے ہیں، گرم خون ہے۔ لڑائی ہو جاتی ہے۔ کل دونوں پھرل کر گھوم رہے ہوں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس موقع پر یہ سب کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ بچے نہیں ہیں۔ ابھی یہاں عورتیں ہوتیں تو ان کے موڈ خراب ہو جاتے۔ پکنگ کا بیڑا غرق ہو کر رہے۔“

جاتا۔“

شیراز واحد احمد نواز کو وہاں سے لے گئے اور وہ کچھ دیر میں نارمل ہو گیا۔ شام تک وہ سب بھول بھی چکے تھے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ خواتین کو پتا نہیں چلا تھا۔ کچھ دیر بعد سب کو بھوک لگنے لگی اور انہوں نے بیٹھنے کا رخ کیا۔ لڑکے ہوٹلوں اور ریسٹورانز میں چلے گئے تھے خواتین، لڑکیوں اور مردوں نے گھروں سے لایا ہوا کھانا کھایا۔ ہاٹ پاٹ میں سب گرم اور مزے کا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے سارے برتن ڈسپوزیبل استعمال کیے تھے۔ واحد نے سب کو وارنگ دی تھی کہ ایک ریپر بھی کہیں نہیں پھینکتا ہے۔ وہ بڑا ساشا پر لایا تھا، سارا کچرا اس میں بھر کر واپس لے جاتے اور راستے میں آنے والے کسی ڈسٹ بن میں ڈالتے۔ واپسی پر سب بہت تھکے ہوئے مگر خوش تھے۔ انہوں نے بہت اچھی تفریح کی تھی۔ آرام وہ اور بیٹھ کر ساتھ بس کا سفر بھی اچھا گزارا تھا۔ معاذ شیراز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ شیراز نے پوچھا۔ ”آپ کسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہو۔“

”ردا کو پاپا۔“

”ردا کون؟“ شیراز نے پوچھا مگر معاذ خاموش رہا۔ شیراز نے توجہ نہیں دی۔ وہ جانتا تھا کہ معاذ کسی خیالی وجود سے بات کرتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کا نام لیا تھا۔ گویا وہ جس سے بات کرتا تھا، وہ لڑکی تھی اور اس نے اس کا نام ردا رکھا تھا۔ شاید یہ فطری بات تھی۔ اس نے ہم نشینی کے لیے لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ واپسی پر اس نے ماہا کو یہ بات بتائی۔

”ہاں، میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہ اکثر خود سے باتیں کرتا ہے۔ لیکن ایسا تو اکثر بچے کرتے ہیں جن کے بہن بھائی نہیں ہوتے یا وہ زیادہ تر اکیلے رہتے ہیں۔“

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ معاذ کا کوئی بہن بھائی ہونا چاہیے۔“

ماہا شرما گئی۔ ”خواہش تو میری بھی ہے لیکن جو اللہ کی مرضی... وہی دینے والا ہے۔“

شیراز اور ماہا نے معاذ کے بعد بس دو سال احتیاط کی تھی۔ اس کے بعد احتیاط چھوڑ دی تھی مگر یہ قدرت کی طرف سے تھا کہ معاذ کے بعد ان کے گھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شیراز کے خیال میں ابھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ ماہا پھر سے ماں بن سکتی تھی۔ معاذ جلدی سونے چلا گیا۔ وہ برف میں بہت

زیادہ کھیلا تھا اور شیراز کسی قدر فخر مند بھی تھا کہ اسے ٹھنڈ نہ لگے۔ ماہا سے کھل پیک کر کے لے کر گئی تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹے تو ماہا کو خیال آیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ مہرین سے بات کروں۔ شاید اس کی کوئی جاننے والی ہو جو معاذ کی دیکھ بھال کر سکے۔“

مہرین ماہا کی کالج اور یونیورسٹی کے زمانے کی دوست تھی اور وہ اسی اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ ماہا نے جاب چھوڑ دی تھی لیکن وہ کرتی رہی تھی۔ درحقیقت ماہا کو دوبارہ جاب کی پیشکش اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ”ہاں، وقت کم رہ گیا ہے۔ آج سٹائیکس دبیر ہے اور تمہیں پہلی سے جوائن کرنا ہے۔“

”دیکھتی ہوں ورنہ پھر مجھے معاذ کو ساتھ لے جانا ہو گا۔ اسے فی الحال پریپ کلاس میں سیٹ کرادوں گی۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اسے تعلیم کے لیے ہی کلاس میں داخل کرایا جائے۔ ورنہ یہ خود کو مس فٹ محسوس کرے گا۔“ شیراز نے کہا۔ خود ماہا کا بھی یہی خیال تھا۔ اگلی صبح شیراز کے دفتر جانے کے بعد ماہا پکن سمیٹ رہی تھی کہ فون کی تیل بجی۔ کارڈ لیس میز پر معاذ کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے اپنے کھلونے چھوڑ کر کارڈ لیس اٹھایا اور کال ریسیو کی پھر سن کر ماں کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فون لیا۔ دوسری طرف ماہا کی سہیلی مہرین تھی۔ وہ بھی ٹچر تھی اور اسی اسکول میں پڑھاتی تھی۔

”میں تمہیں کال کرنے جا رہی تھی۔“ ماہا نے کہا اور اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ معاذ جو خاموش بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا، اس نے اچانک کہا۔

”مہرین آئی سے کہیں وہ شیمہ کو بھیج دیں۔“

اسی لمحے مہرین نے کہا۔ ”ایک لڑکی ہے شیمہ... حال ہی میں گریجیشن کے پیمپرز دیے ہیں اور کچھ مہینوں کے لیے فارغ ہے۔ یہاں اسکول میں مونیٹوری دیکھ چکی ہے۔ اسے بچے پنڈل کرنا آتے ہیں۔“

ماہا ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر اسے خیال آیا کہ شاید مہرین نے شیمہ کا نام لیا ہو اسی لیے معاذ نے بھی کہا تھا۔ پھر اسے خوشی تھی کہ جو وہ چاہتی تھی وہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ”اگر تمہیں اس پر اعتماد ہے تو اسے بھیج دو۔“

”میں اسے کہہ دیتی ہوں، وہ رہتی بھی تمہارے علاقے میں ہے۔ میرا خیال ہے وہ پیدل بھی آسکتی ہے۔“

”پلیز اسے کال کرو کیونکہ میرے پاس صرف تین

دن ہیں۔ مجھے اسکول چلنے ہی جوائن کرنا ہے۔“

”میں آج ہی اسے کال کرتی ہوں، وہ کل تک آجائے گی۔“ مہرین نے یقین دلایا۔ ”امید ہے تمہیں اس سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ میں اسے جانتی ہوں اسی لیے تمہیں کہہ رہی ہوں۔“

”میں اسے اچھا معاوضہ دوں گی۔“

”اسے ضرورت بھی ہے۔“ مہرین نے کہا۔

☆☆☆

شیمہ تقریباً بیس سال کی قبول صورت اور کسی قدر موٹے نقوش والی لیکن دل کش لڑکی تھی۔ قدر درمیانہ تھا۔ اس نے کال تیل بجائی تو شیراز نے دروازہ کھولا۔ شام کے چار بج رہے تھے اور وہ ابھی دفتر سے آیا تھا۔ شیمہ کو دیکھ کر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ شیمہ اس کی نظروں سے گھبرائی۔ پھر اس نے کہا۔ ”سر! میں جاب کے لیے آئی ہوں۔“

”شیراز! کون آیا ہے؟“ اسی لمحے ماہا وہاں آگئی۔ اس نے شیمہ کو دیکھا اور بولی۔ ”یقیناً تم شیمہ ہو؟“

شیمہ نے سکون کا سانس لیا۔ ”جی، مجھے مہرین باجی نے بھیجا ہے۔“

”آؤ اندر آؤ۔“ ماہا نے کہا تو شیراز دروازے سے ہٹ کر اندر آیا۔ ماہا شیمہ کو لاؤنج میں لے آئی۔ شیراز حیران تھا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی عجیب سی کیفیت کیوں ہوئی۔ وہ لڑکیوں میں دلچسپی لینے والا آدمی نہیں تھا۔ اسے دنیا میں کوئی عورت بہ حیثیت عورت کے اچھی لگتی تھی تو وہ اس کی بیوی تھی۔ پھر یہ لڑکی چھوٹی تھی، مشکل سے انیس بیس برس کی ہوگی۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ وہ کتنی دیر اسے گھورتا رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی ہوگی؟ شیراز نشست گاہ میں آ گیا۔ وہ سن رہا تھا۔ ماہا اور شیمہ آپس میں بات کر رہی تھیں۔ ماہا اسے معاذ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ شیمہ نے بتایا کہ اسے تین سے پانچ سال تک کی عمر کے بچے سنبھالنے کا تجربہ ہے۔ آدھے گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ماہا مطمئن ہو گئی۔ اس نے شیمہ کو پورا گھر دکھایا اور معاذ سے طویا۔ معاذ اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے گی۔ اس نے شیمہ سے پوچھا۔

”آپ میرے ساتھ کھیلیں گی؟“

”کیوں نہیں... شیمہ نے جواب دیا۔“ ہم دونوں کھیلیں گے۔ میرے پاس گڑیا ہے، میں وہ بھی لاؤں گی۔“

شیرا کی رضامندی پا کر ماہا نے اس سے سخاوت کا پوچھا۔ اس نے چھ ہزار کہے تو ماہا مان گئی۔ طے پایا کہ وہ صبح آٹھ بجے آجائے گی اور پھر ایک بجے یا اگر کسی وجہ سے ماہا کو دیر ہو جائے تو اس کے آنے تک رکے گی۔ ماہا نے کہا۔

”اضافی وقت اور ٹائم میں شمار ہوگا۔ اس کی الگ سے ادائیگی ہوگی۔“

”تھینک یو۔“ شیرا خوش ہو گئی۔ ”مجھے اس جاب کی ضرورت بھی تھی۔“

ماہا اسے جین میں لے گئی اور اس کی خاطر تواضع کرنے لگی۔ شیرا اسے بتا رہی تھی کہ دنیا میں اس کا سوائے ایک ماں اور چھوٹے بھائی کے کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں ایک بڑے گارمنٹ اسٹور میں کام کرتی تھی۔ اس کا باپ سرکاری ملازم تھا اور جب وہ بہن بھائی چھوٹے تھے تب اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے مرنے سے پہلے وہ ان کے لیے گھر کر گیا تھا۔ پھر شیرا کی ماں نے ہمت کی اور ملازمت کر کے ان لوگوں کو پالا اور پڑھایا۔ شیرا کی خواہش تھی کہ وہ گریجویٹیشن کا رزلٹ آنے کے بعد کوئی جاب کرے اور ساتھ ہی آگے بھی پڑھے۔ ماہا نے اس کے خیالات کو سراہا۔ مہرین کا کہنا درست تھا، وہ بالکل پاس رہتی تھی۔ ان کی گلی سے گزرنے والی سڑک دوسرے سیکڑ تک جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ہی چھوٹے کوارٹرز والے حصے میں شیرا کا گھر تھا۔ جب وہ جانے لگی تو نشست گاہ کے دروازے کے سامنے سے گزری اور شیراز نے اسے دیکھا تو اس کے دماغ میں پھر ویسا ہی جھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے ایک لمبے کو سرخ سی روشنی چمکی ہو۔ اسے باقاعدہ جھکا سا محسوس ہوا۔ ماہا دروازہ بند کر کے واپس آئی اور اس سے پوچھا۔

”آپ کو کیسی لگی... یہ معاذ کو سنجال لے گی؟“

شیراز ہنسی پکڑا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ چھوٹی ہے اگر تم کوئی بڑی عمر کی عورت رکھو۔“

”شیراز پلیز... اتنی مشکل سے یہ ملی ہے اور اب دو دن میں کہاں سے میں کوئی عورت تلاش کروں۔ مہرین کے توسط سے آئی ہے۔ مجھے اچھی لگی ہے۔“

”میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ اس کام کے لیے کوئی بڑی اور ذمے دار عورت ٹھیک رہے گی۔“

اسی لمحے لاؤنج سے کسی چیز کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں تیزی سے وہاں آئے تو معاذ صوفے پر ساکت بیٹھا تھا اور سامنے ریک پر رکھا گلدان نیچے گر کر

کھڑے کھڑے ہو گیا تھا۔ ماہا نے معاذ کو گود میں لے لیا۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ ”کچھ نہیں ہوا... کچھ نہیں ہوا۔“

”یہ کیسے گرا؟“ شیراز نے پوچھا۔

”ردائے گرایا ہے۔“ معاذ نے جواب دیا۔

ماہا نے شیراز کو گھورا۔ ”یہ ڈرا ہوا ہے، اس وقت سوال مت کر دو۔“

شیراز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے معاذ سے کہا۔ ”باہر چلیں؟“

معاذ خوش ہو گیا۔ اسے باہر جانا اچھا لگتا تھا۔ شیراز اور ماہا اسے اکیلے جانے دیتے تھے مگر معاذ اس سے کچھ خفا بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں ماما کے ساتھ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے آپ ماما کے ساتھ جائیں، میں یہ صاف کرتا ہوں۔“ شیراز بیٹھ کر گلدان کے ٹکڑے چھنے لگا۔ ماہا معاذ کو لے کر باہر نکل آئی۔ باہر بہت سرد ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر درختوں کے سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ صفائی کرنے والا عملہ روز پچھرا لے کر جاتا تھا مگر پتے اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ کچھ ہی دیر میں دوبارہ سڑک پر ان کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ معاذ پتوں کے ڈھیر پر پاؤں مارتا ہوا چلنے لگا۔ ماہا اس کے پیچھے تھی۔ کبھی کبھی اس سڑک سے تیز گاڑیاں بھی گزرتی تھیں اس لیے ماہا اور شیراز اسے اکیلے باہر جانے نہیں دیتے تھے۔ معاذ نے سڑک کر اس کی اور دوسری طرف چلا گیا۔ ماہا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اچانک معاذ بی سیون کے سامنے رکا اور اس نے ماہا سے پوچھا۔

”ماما! یہاں کون رہتا ہے؟“

”یہاں شمینہ آئی رہتی ہیں۔“

اسی لمحے شمینہ کے مکان کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی۔ اس نے گرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جا رہی ہے۔ اس نے نیچے ڈرائیو سے پر آ کر فولادی گرل والا دروازہ کھولا اور ماہا سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسی ہو... کبھی میرے گھر آؤ۔“

”میں ٹھیک ہوں اور ضرور آؤں گی۔ میں اسکول جوائن کر رہی ہوں اس لیے آج کل کچھ سیننگ میں مصروف ہوں۔ آپ بھی پھر لگائیں۔ یہ محلہ ایک خاندان کی طرح ہے، کوئی تکلف نہیں کرتا ہے۔“

”میں ضرور آؤں گی۔“ شمینہ نے کہا اور جھک کر معاذ سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”آئی ایم فائن۔“ معاذ نے جواب دیا۔

”آپ پڑھتے ہیں؟“

”میں ضرور آؤں گی۔“ شمینہ نے کہا اور جھک کر معاذ سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”آئی ایم فائن۔“ معاذ نے جواب دیا۔

”آپ پڑھتے ہیں؟“

”میں ضرور آؤں گی۔“ شمینہ نے کہا اور جھک کر معاذ سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”آئی ایم فائن۔“ معاذ نے جواب دیا۔

”نہیں، اب اسکول جاؤں گا۔“ معاذ نے پھر اعتماد سے کہا۔ شمیمہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ماہا سے کہا۔

”تمہارے بچے میں کچھ خاص بات ہے۔ یہ شاید اسے باپ سے ملی ہے۔ جو بات تمہارے شوہر کی آنکھوں میں ہے، وہی اس کی آنکھوں میں بھی ہے۔“

”کیسی بات؟“

”یہ بھی اچھا معمول ہے۔“

”پلیز! یہ بچہ ہے۔“ ماہا نے گھبرا کر کہا۔

”بچے ہی اچھے معمول ہوتے ہیں۔ میں نے بتایا تھا کہ بچوں میں لاشعور اور تحت الشعور طاقتور ہوتا ہے اس لیے یہ آسانی سے رابطہ کر لیتے ہیں۔“

”رابطہ... لیکن کس سے؟“

”ان سے جن سے ہم بڑے رابطہ نہیں کر پاتے ہیں۔“ شمیمہ نے کہا اور اپنی کار کی طرف مڑ گئی۔ دروازہ کھول کر اس نے ماہا کی طرف دیکھا۔ ”اپنے بچے کا بہت خیال رکھا کرو۔“

شمیمہ نے ڈرائیو سے کار نکالی اور گیٹ دوبارہ بند کر کے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ماہا اسے جاتا دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس نے معاذ کے بارے میں ایسا کیوں کہا تھا؟

☆☆☆

ماہا کو اسکول کی اسٹاف وین لینے آئی تھی۔ شیراز اور معاذ نے اسے بیڑھیوں تک آکر رخصت کیا۔ شیمہ دروازے پر کھڑی تھی۔ ماہا کے جانے کے بعد شیراز نے معاذ کو اس کے حوالے کیا اور خود ادا پر آیا۔ وہ اب دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ دس بجے وہ گھر سے نکلا۔ اس نے گاڑی باہر نکالی اور ملک احمد نواز کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر نظر ڈالی تو وہاں ڈرائیو سے وے میں شاہنواز کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے اور وہ واحد کے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے رائیل کو دیکھا جو ڈرائیو سے پروا حد کی گاڑی دھورہا تھا۔ شیراز کو خیال آیا کہ چنگ سے واپسی پر اس نے ایک بار بھی شاہنواز اور رائیل کو ساتھ ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ ایک قالب دو جان تھے۔ صبح سے لے کر رات تک ان کا وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ اب کوئی گڑبگڑ تھی۔ کچھ دیر بعد یہ خیال اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب اسے شیمہ کا خیال تھا۔ کیا وہ معاذ کی ٹھیک سے دیکھ بھال کر سکے گی؟

وہ شام کو آیا تو اس نے معاذ کو بہت خوش پایا۔ اس نے شیراز سے کہا۔ ”پاپا! شیمہ آپنی بہت اچھی ہے۔ رواد نے بھی اسے پسند کیا ہے۔“

شیراز کو رواد کی پروا نہیں تھی لیکن اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ معاذ نے شیمہ کو پسند کیا تھا۔ اب بھی شیراز شیمہ کو دیکھتا تو کبھی کبھی اس کے اندر ویسا ہی جھماکا ہوتا تھا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرنے لگا تھا۔ اس نے اس جھماکے سے بچنے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ شیمہ کے سامنے کم سے کم آتا تھا۔ وہ صبح آتے ہی معاذ میں لگ جاتی تھی اور جب وہ ناشتے کے لیے اسے نیچے لاتی تو شیراز ناشتے سے فارغ ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ اوپر چلا جاتا۔ اب شیمہ معاذ کو ناشتا کراتی تھی کیونکہ ماہا کو بھی تیار ہونا ہوتا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے چلی جاتی اور اس کے بعد شیراز دفتر جانے تک کمرے میں ہی رہتا تھا۔ جاتے ہوئے جب شیمہ دروازہ بند کرنے آتی، تب بھی اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اسے نہ دیکھے۔

ماہا تین مہینے کے ٹرائل پر تھی کیونکہ اس دوران میں اسکول کا نصاب بدل چکا تھا اور اسے اس سے ہم آہنگ ہونا تھا۔ سالانہ امتحان کی کارکردگی پر اسے مستقل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا اور اس صورت میں اس کی تنخواہ بھی بڑھ جاتی۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ گیپ پورا کر لے گی۔ سب سے بڑھ کر اسے معاذ کا ساتھ مل جاتا، وہ اس کے ساتھ ہی آتا جاتا۔ وہ خود کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ اسے شیمہ مل گئی تھی۔ وہ معاذ کی بہت اچھی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اسے سکھاتی اور پڑھاتی تھی۔ اس نے معاذ کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ماہا کو یقین تھا کہ اسے آسانی سے پہلی کلاس میں داخلہ مل جائے گا اور اسے پریسہ کلیمز نہیں لینا پڑیں گی۔ فروری کے آخر تک سرمایہ شدت کم ہو گئی اور بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ مگر جھانانے والے درختوں اور پودوں پر نیا سبزہ نمودار ہو رہا تھا۔ محلے والوں نے مل کر آٹس پارلر جانے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ انہیں شام کے وقت جانا تھا اس لیے ماہا نے شیمہ کو روک لیا۔

”تم آج شام تک رک جاؤ۔“

شیمہ اس سے پہلے کبھی اتنی دیر تک نہیں رکی تھی۔ ماہا نے اسے تسلی دی۔ ”تم فکر مت کرو، شام کو میں اور شیراز تمہیں چھوڑ کر آئیں گے۔ تمہیں اکیلے نہیں جانا پڑے گا۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ شیمہ نے کہا۔ ”شام کے وقت یہ سڑک بالکل سنسان ہو جاتی ہے اور جنگل سے اکیلے گزرتا پڑتا ہے۔“

چار بجے محلے والے گھروں سے نکل آئے اور ٹولیوں

وابطہ

نواز ذرا پیچھے تھا اور وہ اکیلا کسی سوچ میں گم چل رہا تھا۔ واحد حسب معمول اپنے محلے کی تعریفوں میں لگا ہوا تھا۔ ”کیا اس شہر یا اس پورے ملک میں کوئی ایسا محلہ ہوگا جہاں رہنے والے ہماری طرح ہوں۔ ایک ایک آدمی جیسے چتا ہوا ہو۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ شیراز بولا۔ ”اچھے بڑے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

”یہاں نہیں ہیں۔“ واحد نے یقین سے کہا۔ ”یہ میرا یقین ہی نہیں، میرا ایمان بھی ہے۔“

تویر ہنسا۔ ”واحد بھائی نے تو اسے اپنے ایمان کا حصہ بنا لیا۔“

وہ گلی والی سڑک سے نکلے اور سیکٹر کی بڑی سڑک پر آئے۔ یہاں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اچانک شیراز کو لگا جیسے اس کے سر میں وہی سرخ جھماکا ہوا ہو جو شیمہ کو دیکھنے سے ہوتا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر واحد اور تویر آپس میں بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ آگے خواتین کا گروہ تھا جس میں محلے کی تقریباً تمام ہی عورتیں شامل تھیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولیاں الگ تھیں۔ شیراز سوچ رہا تھا کہ ابھی شیمہ سامنے نہیں تھی پھر ایسا کیوں ہوا؟ اسی لمحے پھر جھماکا ہوا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ جھماکا اتنا تیز تھا کہ ایک لمحے کے لیے آس پاس کا سارا منظر بھی سرخ ہو گیا۔ وہ آٹس کریم پارلر کے پاس پہنچ گئے۔ خواتین اندر جا چکی تھیں۔ شیراز نے پارلر میں قدم رکھا تھا کہ تیسری بار جھماکا ہوا۔ اچانک اسے کوئی خیال آیا اور وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگا۔ واحد نے اسے آواز دی تو اندر موجود ماہا نے بھی دیکھا اور وہ پریشان ہو کر باہر آئی۔ دوسرے بھی ان کے پیچھے آنے لگے۔ شیراز اب بھاگ نہیں رہا تھا مگر تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ اس نے دوسروں کی آوازوں کا جواب نہیں دیا۔ مگر پھر پیچھے آتی ماہا نے آواز دی۔ ”شیراز رکو... کیا ہوا ہے؟“

”معاذ۔“ شیراز کے بغیر بولا۔ معاذ کے نام نے ماہا کا دل بھی دھڑکا دیا۔ ست روی سے یہ قاصد دس منٹ میں طے ہوتا تھا۔ شیراز نے موبائل نکالا اور گھر کا نمبر ملا یا۔ شیمہ کا موبائل نمبر ماہا کے پاس تھا مگر وہ اپنا موبائل گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ تیل جا رہی تھی اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ایک بار تیل بند ہوئی تو شیراز نے پھر نمبر ملا یا اور اس وقت تک ملاتا رہا جب تک وہ گلی میں داخل نہیں ہو گیا۔ پھر اس نے موبائل رکھا اور تقریباً اڑتالیس گھنٹے پہنچا۔ دو جستوں میں اس نے سڑھیاں چڑھیں اور کھلے داخلی دروازے سے اندر آیا۔

کی صورت میں آٹس کریم پارلر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں بہت اچھی کواٹھ کی آٹس کریم پارلر میں ملتی تھی۔ پارلر سیکٹر کی مرکزی مارکیٹ میں تھا اور پیدل کا راستہ تھا۔ شیراز اور ماہا کے جانے کے بعد شیمہ نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لاؤنج میں صوفے پر آگئی۔ معاذ اور اپنے کمرے میں اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ شیمہ کو بعض اوقات اس کا رویہ عجیب لگتا تھا، جب وہ کسی خیالی چیز سے بات کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہستی بچ مچ موجود ہے۔ شیمہ جب اس کے ساتھ اکیلی ہوتی اور معاذ خیالی ہستی سے بات کرتا تو اسے خوف محسوس ہوتا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی اسے ٹوک دیتی تھی تو وہ چپ ہو جاتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے شیمہ نے ایک رسالہ اٹھالیا۔ اچانک اسے اوپر سے معاذ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ اس نے نظر انداز کیا مگر جب دوبارہ آواز آئی تو وہ اٹھ کر اوپر آئی۔ اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا تو وہاں خلاف توقع تاریکی تھی۔ باہر سے آتی روشنی میں معاذ کا بیڈ نمایاں تھا اور وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ شیمہ نے پوچھا۔

”آپ ہنس رہے تھے؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”کیوں؟“

”ردا کی بات پر۔“

شیمہ بری طرح چوکی۔ ”کیا... کیا... کس کی بات؟“

”ردا کی بات پر۔“ معاذ نے بالکل واضح کہا اور اس بارشک کی گنجائش نہیں تھی۔

”تم... ردا سے بات کرتے ہو؟“ شیمہ کی آواز لرز رہی تھی۔

معاذ نے سر ہلایا۔ ”ہر روز... ہر وقت۔“

”کہاں کرتے ہو؟“

”یہاں... اپنے گھر میں... ہر جگہ۔“

شیمہ اندر آئی۔ ”تم اب بھی ردا سے بات کر رہے تھے؟“

”ہاں، وہ یہاں موجود ہے۔“

شیمہ نے جھپٹ کر معاذ کو گود میں لیا اور چلا کر بولی۔

”تم سچ کہہ رہے ہو، وہ یہاں ہوتی ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ معاذ کسمسایا۔ چند لمحے بعد وہ معاذ کو گود میں لیے تیزی سے بیڑھیاں اتر رہی تھی۔

☆☆☆

شیراز، واحد اور تویر کے ساتھ چل رہا تھا۔ آج احمد

اس نے چلا کر معاذ کو آواز دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ چہرہ منٹ میں اس نے سارا مکان دیکھ لیا۔ معاذ اور شیمائیں نہیں تھے۔ وہ باہر نکلا تو اسی لمحے ماہا آگئی۔ اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی تھے۔ ماہا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”معاذ اور شیمائیں اندر نہیں ہیں۔“

واحد نے نزدیک آنے پر سن لیا تھا۔ اس نے دوسروں سے کہا۔ ”آس پاس دیکھو۔۔۔ اپنے گھروں میں بھی دیکھو۔“

سب اپنے اپنے گھروں کی طرف گئے۔ واحد نہیں گیا کیونکہ اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا اور وہ مکان لاک کر کے نکلا تھا۔ جن کے گھروں میں کوئی تھا، وہ دیکھ رہے تھے۔ شیراز کی گلی کے جنگل والے سرے تک آیا۔ دور تک سڑک صاف تھی۔ شیراز نے سڑک کے دائیں طرف موجود جنگل میں دیکھا تو اس کے ذہن میں پھر ویسا ہی جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور درختوں میں داخل ہو گیا۔ ماہا اس کے پیچھے تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہاں کیوں جا رہے ہو؟“

”معاذ اور شیمائیں ہیں۔“

درختوں کے بیچ میں راستے نہیں تھے اور عشروں سے جمع ہونے والے گلے سڑے پتوں کا ایک ڈھیر تھا جس نے اسے جیسی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے عجیب سی بو اٹھ رہی تھی اور وہ اس پر پاؤں رکھتے تو یہ دبتا تھا۔ اس پر چلنا آسان نہیں تھا مگر اس وقت دونوں میاں بیوی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ معاذ تک پہنچنے کے لیے انہیں بل صراط پر چلنا پڑتا تو وہ اس کے لیے بھی راضی تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ گرتے پڑتے جنگل پار کر کے دوسری طرف موجود سیکٹر کے کمرشل ایریا کے پاس پہنچے۔ یہاں گھما گھمی تھی۔ لوگ اور گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ شیراز چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ماہا رو ہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”معاذ کہاں ہے... مجھے میرا بچہ چاہیے۔“

شیراز نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے سڑک پار ایک بڑے گارمنٹ اسٹور کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سرخ جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے سڑک عبور کرنے لگا۔ ایک کار کا بارن چلا یا اور وہ شیراز سے چند انچ کے فاصلے پر رکی۔ ماہا کی بھی چیخ نکل گئی مگر شیراز کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ر کے

بغیر تیزی سے سڑک عبور کر کے گارمنٹ اسٹور میں داخل ہوا۔ یہ خاصا بڑا اسٹور تھا جس میں ریڈی میڈ گارمنٹس کا مکمل کٹیشن تھا۔ یہاں شعبے بنے ہوئے تھے۔ مردانہ، زنانہ اور بچکانا گارمنٹس کے الگ الگ شعبے تھے۔ جگہ جگہ ریٹنگ پر لمبوسات بٹنگ تھے۔ اسٹور میں خاصے لوگ تھے۔ ان کے درمیان کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ شیراز چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر اسے کچھ دور کسی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ آگے بڑھا۔ ماہا بھی اندر آگئی۔ وہ شیراز کے پیچھے لگی۔

شیمائیں سر پر گہرے سبز رنگ کا بیٹنڈا لگا رکھا تھا اور شیراز کو اسی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتا اور راستے کے لیے اچیل اور معذرت کرتا ہوا گئی ریٹنگ پار کر کے دوسری طرف پہنچا تو اسے شیمائیں کو معاذ کو لیے نظر آگئی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور شیمائیں سے دیکھ کر اسٹور کے ملازمین کا یونیفارم پہنی ایک ادھیڑ عمر عورت کے پیچھے ہو گئی۔ مگر شیراز نے اس کی پروا کیے بغیر شیمائیں سے معاذ کو چھین لیا۔ اسٹور میں خاصے لوگ تھے۔ اس بیجاگ دوڑا اور پھر شیراز کی حرکت نے سب کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ سبز مین شیراز کی طرف بڑھے۔ ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ آپ نے بچے کیوں چھینا ہے؟“

تھی۔ اس نے غصے سے شیمائیں کو دیکھا۔ ”میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم نے میرا بچہ اغوا کر لیا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ”شیمائیں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”تم کون ہو؟“

”میں شیمائیں کی ماں ہوں۔“ عورت نے کہا پھر اس نے شیمائیں کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

شیمائیں جذباتی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہاں، میں معاذ کو لاتی ہوں۔“

”دیکھا، اس نے میرے بچے کو اغوا کرنے کا اقرار کیا ہے۔“ ماہا بلند آواز سے بولی۔ ”میں اسے پولیس کے حوالے کروں گی۔“

”کر دو۔۔۔ لیکن اس سے پوچھو۔۔۔ یہ ردا کو دیکھتا ہے... اس سے باتیں کرتا ہے... اسے ردا نظر آتی ہے... شیمائیں بول رہی تھی اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے کہا۔

”شیمائیں! کیا کہہ رہی ہے؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں، پوچھو اس سے۔“ شیمائیں

پھر ہنچا کر پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس کی کم شدہ بہن کا کس یاد ہے؟“

احمد نواز نے شانے اچکائے۔ ”ہاں، کچھ یاد ہے۔ اصل میں یہ اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن کے بارے میں تھا۔ تم جانتے ہو میری ڈیوٹی ہیڈ آفس میں ہے۔ اس لیے بس اتنا جانتا ہے جتنا دوسروں کو علم ہے۔ لڑکی انٹرنیٹ ٹیچنگ اور کوچنگ سینٹر سے واپس آتے ہوئے غائب ہوئی تھی۔ پولیس نے کئی مہینے تک اس کیس پر کام کیا لیکن کوئی سرا نہیں ملا اس لیے کام بند کر دیا۔ ممکنہ طور پر لڑکی اغوا کر لی گئی اور پھر ماری دی گئی۔ اس کی لاش بھی کہیں چھپا دی گئی تھی۔ لڑکیوں کا اغوا یا کم شدگی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس جیسے محفوظ شہر میں بھی ہر سال سو سے زیادہ لڑکیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کم سے کم ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔ ردا بھی ان میں سے ایک ہے۔“

شیراز نے سوچا۔۔۔ جب وہ معاذ کو کیوں نظر آتی تھی؟ پھر وہ چونک گیا۔ اسے اپنے خیال پر تعجب ہوا۔ وہ معاذ کے خیال کو سچ سمجھ رہا تھا؟

☆☆☆

اس رات وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ان کے موڈ بحال ہونے لگے تھے اور وہ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے۔ البتہ معاذ کو جیسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ آتے ہی اپنے کھلونوں میں مگن ہو گیا تھا۔ شیراز نے اس سے پوچھا۔ ”آپ نے شیمائیں سے کیا کہا تھا؟“

”وہ بکواس کرتی ہے۔“ ماہا بولی۔

”ممکن ہے لیکن وہ اس بارے میں جھوٹ تو نہیں بول سکتی۔ یقیناً اس کی بہن کا نام ردا ہے اور وہ تین سال پہلے۔۔۔ پھر اسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو اس کا معاذ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس نے ایک فرضی کردار بنایا ہوا ہے اور اس کا نام ردا رکھا ہے۔“ ماہا کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”صرف ایک نام سن کر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ آپ کو اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس نے ہمارے بچے کو یوں لے جانے کی ہمت کیسے کی؟“

شیراز نے ایک بار پھر معاذ سے پوچھا۔ ”آپ نے کیا کہا تھا؟... شیمائیں آپ کو کیوں لے گئی تھی؟“

”پلیز شیراز۔۔۔ ماہا نے کہنا چاہا۔“

”مجھے بات کرنے دو۔“ شیراز کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”مجھ سے بات کرو۔“ اچانک معاذ نے کہا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ یہ گونجتی ہوئی اور بھاری آواز تھی جو

چلائی۔

شیراز خاموش تھا۔ اس نے معاذ کو سینے سے لگا یا ہوا تھا۔ ماہا کئی گونز ہو گئی۔ اس نے شیمائیں کی ماں سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہے... کس ردا کی بات کر رہی ہے؟“

”ردا میری بڑی بیٹی تھی۔ وہ تین سال پہلے کوچنگ سینٹر سے آتے ہوئے غائب ہو گئی اور آج تک نہیں ملی۔“ شیمائیں کی ماں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ماہا! واپس چلو۔“ شیراز نے کہا۔ شیمائیں کی ماں کی بات سن کر اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا اور وہ فوراً یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

”لیکن اس نے جو کیا ہے؟“ ماہا نے شیمائیں کی طرف دیکھا۔

”چھوڑو اسے... واپس چلو۔“

”ایک منٹ... آپ کے پاس تین ہزار روپے ہیں؟“ ماہا نے پوچھا تو شیراز نے نہ سمجھنے کے انداز میں اپنا پرس اس کے حوالے کر دیا۔ ماہا نے اس میں سے تین ہزار روپے نکال کر شیمائیں کی طرف پھینکے۔ ”یہ تمہارے حساب سے زیادہ ہے۔ آئندہ میرے گھر کے سامنے بھی نظرمت آتا۔“

شیمائیں اور اس کی ماں ساکت کھڑے تھے، انہوں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر شیمائیں نے کہا۔ ”آپ یہ رقم اٹھالیں، مجھے نہیں چاہیے۔“

شیراز کو ماہا کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا، یہ اخلاق کے خلاف تھا۔ اس نے فرش پر پڑے نوٹ اٹھائے اور انہیں شیمائیں کی طرف بڑھایا۔ ”یہ تمہاری تنخواہ ہے، تمہارا حق ہے۔“ اس نے اصرار سے کہا تو اس بار شیمائیں نے رقم لے لی۔

پھر دونوں میاں بیوی معاذ کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔ اگلے دن شام کے وقت ہلکی بارش کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور محلے والے دھلے ماحول کو انجوائے کرنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ایک طرف مرد جمع تھے۔ شیراز ان کے پاس آیا۔ گزشتہ دن کا واقعہ تقریباً سب کے علم میں آ گیا تھا۔ معاذ کی بہ حفاظت واپسی پر سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ جب شیراز اور ماہا واپس آئے تو محلے والے آس پاس کا سارا علاقہ چھان کر اب سیکٹر کی طرف جا رہے تھے کہ شاید بچہ غلطی سے ان کے پیچھے نہ آ گیا ہو۔ احمد نواز نے شیراز کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم لوگوں نے اچھا کیا کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی۔“

”اس نے غلطی کی لیکن یہ جرم نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا

”اس نے غلطی کی لیکن یہ جرم نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا

”اس نے غلطی کی لیکن یہ جرم نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا

”اس نے غلطی کی لیکن یہ جرم نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا

معاذ نے اس سے پہلے کبھی نہیں نکالی تھی اور نہ آواز کو بھگانا کہا جاسکتا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ شیراز بے تاب ہو کر معاذ کے پاس آیا۔

”کیا... کیا کہا تم نے۔“

لیکن اتنی دیر میں معاذ پھر سے اپنے کھلونوں میں مگن ہو گیا تھا۔ شیراز نے اس کا بازو پکڑا۔ ”معاذ! میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ اس کے لہجے میں سختی تھی۔ ماہا آگے آئی اور اس نے معاذ کو گود میں لے لیا۔

”لگتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو... یہ بچہ ہے۔ تم اس سے کیا کھلوانا چاہتے ہو؟“

”میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے اس کی آواز سنی تھی؟“

”میں نے کچھ نہیں سنا اور میں کچھ نہیں سنا چاہتی۔“ ماہا معاذ کو لے کر اوپر گئی۔ شیراز اس کے پیچھے آ رہا تھا اور وہ مسلسل بول رہا تھا۔

”تم مجھے اس سے بات کرنے دو... ماہا! یہ میرا بیٹا ہے... تم یوں درمیان میں نہیں آسکتیں... پلیز! مجھے بات کرنے دو۔“

ماہا نے معاذ کو اس کے بیڈ پر بٹھایا اور جارحانہ انداز میں بولی۔ ”نہیں، میرا نہیں خیال...“

”تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔“ شیراز نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور معاذ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”معاذ بولو بیٹا... تم نے کیا کہا تھا... تم نے ایسی آواز کیوں نکالی؟“

”شیراز! چھوڑ دو اسے۔“ ماہا پھر آگے آئی۔

”مجھے میرے بیٹے سے بات کرنے دو۔“ شیراز پلٹ کر دھاڑا۔

”پاپا۔“ معاذ اچانک زور سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میں نے اس لیے کہا تھا کہ آپ ماما سے لڑ رہے تھے۔“

معاذ نے کہا اور کروٹ لے کر لیٹ گیا مگر اس کا ہلتا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ماہا وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

شیراز کی آنکھ کھلی تو وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہلکا کھیل اوڑھ رکھا تھا۔ رات ماہا سے جھگڑے کے بعد وہ نیچے آ گیا تھا اور یہیں صوفے پر سو گیا تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور ماہا یقیناً جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر اپنا سلپر دیکھا۔ ایک سلپر صوفے کے ساتھ تھا مگر دوسرا غائب تھا۔ اس نے اٹھ کر اس پاس دیکھا۔ پھر میز کے

دوسری طرف صوفے تلے جھانکا تو سلپر وہاں نظر آ گیا۔ اس نے سلپر نکال کر پہنا اور اوپر آیا۔ واش روم سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آیا تو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر نوٹ پینڈ کا کاغذ لگا ہوا تھا۔ اس پر ماہا کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

”میں معاذ کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ناشا تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے بنا لینا۔“

ماہا معاذ کو اپنے ساتھ اسکول لے گئی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے شیراز کو بتایا بھی نہیں تھا۔ یہ ناراضگی کا اظہار تھا۔ شیراز کا دفتر جانے کا موڈ نہیں تھا۔ کوئی خاص کام یا ایساٹ منٹ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے اسٹنٹ کو کال کر کے بتا دیا کہ آج وہ دفتر نہیں آئے گا اس لیے وہ کام دیکھ لے اور کوئی مشکل ہو تو اسے کال کر لے۔ شیراز نیچے آیا اور

سیڑھیوں سے اترتے ہی ٹھنک گیا۔ لاؤنج میں واحد کھڑا تھا اور اس کا چہرہ عجیب سا ہورہا تھا۔ اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ”شیراز! میں تباہ ہو گیا...“

”واحد! کیا ہوا ہے؟“ وہ اس کی طرف بڑھا مگر وہ اس کی طرف توجہ دے بغیر دروازے سے باہر چلا گیا۔ شیراز اس کے پیچھے آیا تو وہ سیڑھیوں پر سر تھا بے بیٹھا تھا۔ شیراز اس کے پاس بیٹھا تو وہ بولا۔ ”یہ حملہ جسے میں مثالی سمجھتا تھا... یہاں یہ سب ہوتا رہا... میرے خدا...“ اس نے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا تھا۔

شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ واحد ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ اسے صبح کس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا جو وہ یوں ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شیراز سیڑھیاں اتر کر ڈرائیو سے بیٹھا آیا اور اس نے پلٹ کر واحد کی طرف دیکھا تو اسے جھکا لگا۔

سیڑھیاں خالی تھیں۔ واحد وہاں نہیں تھا۔ اسے نیچے اترنے اور پلٹنے میں صرف دو سیکنڈ لگے تھے۔ واحد اتنی جلدی کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ اسی لمحے گھنٹی کی آواز آئی۔ شیراز گیٹ سے باہر آیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر علاقے کا پوسٹ مین چلا آ رہا تھا۔ جب وہ کسی کے لیٹر بکس میں کچھ ڈالتا تو ساتھ

سائیکل کی گھنٹی بھی بجاتا تھا۔ شیراز واحد کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس وقت پوسٹ مین اس کے گیٹ کے ساتھ لگے لیٹر بکس میں ایک لفافہ ڈال رہا تھا پھر وہ احمد نواز کے گھر کی طرف بڑھا۔ واحد کے مکان کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اس کی

کار اندر نہیں تھی۔ شیراز سیڑھیاں چڑھ کر داخلی دروازے تک آیا۔ وہ واحد سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو وہ بھی کھلا ہوا ملا۔ شیراز ہچکچاہٹ کے ساتھ اندر آیا تو اسے لاؤنج میں راحیل نظر آیا۔ شیراز

نے اس سے پوچھا۔

”واحد کہاں ہے؟“

”ڈیڈی۔“ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ ”ہتا

نہیں... پر میں جانے والا ہوں۔“

”کہاں؟“

”کیا آپ بھی چلیں گے؟“ راحیل نے کہا اور ہاتھ

آگے کیا جس میں پستول دبا ہوا تھا۔ اس نے پستول شیراز کی طرف اٹھایا۔ شیراز پہچان گیا، یہ واحد کا پستول تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہوا اور چلا یا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میں جا رہا ہوں۔“ راحیل نے کہا اور اچانک

پستول اپنے سر پر رکھ کر گولی چلا دی۔

”نہیں۔“ دھماکے کے ساتھ شیراز چلا یا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر ہلکا کھیل پڑا ہوا تھا۔ شیراز نے سکون کا سانس لیا۔ تو یہ خواب تھا۔ اس نے سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر وال کلاک پر گئی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ پھر اس نے سلپر کے لیے نیچے دیکھا تو

اسے ایک ہی نظر آیا۔ وہ ٹھنکا پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کر دوسرے صوفے کے نیچے جھانکا۔ وہ خود سے

کہہ رہا تھا کہ سلپر نہیں ہوگا مگر سلپر وہاں موجود تھا۔ اس نے سلپر نکالا اور خود کو سلی دی کہ یہ اتفاق ہے۔ وہ اوپر آیا اور واش روم جانے کے بجائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس

نے بے اختیار ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کی طرف دیکھا۔ اس پر نوٹ پینڈ کا کاغذ دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔ وہ تیزی سے پاس آیا اور کاغذ کھینچ کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”میں معاذ کو لے جا رہی ہوں۔ ناشا تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے بنا

لینا۔“

”نہیں... نہیں۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”یہ اتفاق ہے۔ میں نے خواب ہی دیکھا تھا۔“

مگر وہ واش روم جانے کے بجائے تیزی سے نیچے آیا اور لاؤنج میں جھانکا۔ واحد وہاں نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس نے خواب ہی دیکھا تھا۔ باقی سب

اتفاق تھا۔ اسی لمحے اسے باہر سے پوسٹ مین کی سائیکل کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا۔ اس نے دیکھا پوسٹ مین اسی طرف آ رہا تھا۔ شیراز باہر نکل آیا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ خواب ہی تھا۔

پھر بھی وہ واحد کے مکان کی طرف بڑھا۔ پوسٹ مین اس کے پاس سے گزر کر احمد نواز کے مکان کے پاس پہنچا۔

اچانک ہی قار کی دہلی دہلی آواز آئی اور شیراز بھاگا۔ اس نے یہ فاصلہ لمحوں میں طے کیا اور داخلی دروازے کا ہینڈل کھمایا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کھلا ہوگا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے تیل بجائی اور چلا یا۔ ”واحد! دروازہ کھولو۔“

اسی لمحے اندر سے سارہ کے چلانے کی آواز آئی۔ شیراز مسلسل کال تیل بجانے لگا۔ سارہ نے دروازہ کھولا تو وہ

شاک میں بھی اور اس کا ہاتھ ایک طرف اٹھا ہوا تھا۔ لاؤنج میں فرش پر راحیل پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور اس کے سر کے پاس خون پھیل رہا تھا۔ شیراز نے اندر

جاتے ہوئے جھپٹ کر فون اٹھایا پھر وہ سارہ کو اٹھا کر نشست گاہ میں لے گیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ایبوی لینس اور واحد ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ جس وقت طبی عملہ راحیل کو

ایبوی لینس میں منتقل کر رہا تھا، واحد اور سارہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ راحیل زندہ تھا مگر اس کی حالت بہت

خراب تھی۔ واحد کے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شیراز سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے پہلے سے سب کیسے جان لیا تھا؟ ایبوی لینس چلی گئی۔ شیراز نے اٹھ کر واحد کو سینے سے لگا لیا۔ وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے کہا۔ ”میرے خدا... راحیل... ہمارے پاس بس وہی ہے۔“

”حوصلہ کرو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ شیراز نے کہا۔ ”میں گاڑی لا رہا ہوں، ہم اسپتال چلتے ہیں۔“

شیراز شام تک واحد اور سارہ کے ساتھ اسپتال میں رہا۔ اس نے وہیں سے کال کر کے ماہا کو بتا دیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق راحیل کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ گولی نے عقبنی دماغ کو نقصان پہنچایا تھا اور اس وقت وہ کومے میں تھا۔ اس کی دل کی دھڑکن اور سانس مشینوں کی مدد سے چلائی جا رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

راحیل کو دیکھنے والے ڈاکٹر نے صاف گولی سے کہا۔ ”ایسی صورت میں آدمی کے بچنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے، مشکل سے پانچ فیصد... بہر حال ہم دیکھیں گے۔ ایسی کنڈیشن میں بعض اوقات مریض معجزانہ طور پر ہوش میں آجاتے ہیں۔“

یہ جان کر واحد اور سارہ کی حالت مزید خراب ہو گئی۔ ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ راحیل نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ کچھ عرصے سے خاموش سا رہنے لگا تھا۔ یونیورسٹی سے آ کر گھر میں رہتا تھا۔ اس نے باہر جانا اور دوستوں سے ملنا

ترک کر دیا تھا۔ گھر میں بھی وہ زیادہ تر کمرے میں محدود

رہتا تھا۔

رہتا تھا۔ مگر یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح خودکشی کی کوشش کرے گا۔ واحد کا ہسپتال اس کے کمرے میں اس کی الماری کے لا کر میں ہوتا تھا۔ وہ اسلحہ کھلا چھوڑنے کا قائل نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے راحیل نے لا کر تک رسائی حاصل کی اور ہسپتال نکال لیا۔ شیراز یہ مشکل انہیں گھر آنے پر راضی کر سکا ورنہ وہ ہسپتال سے آنے کو تیار نہیں تھے۔ راحیل انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھا اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ماہا اس کی منتظر تھی۔ شیراز تھکا ہوا تھا۔ اس نے سارے دن صرف چائے اور پانی پر گزارہ کیا تھا اس لیے وہ کھانا کھا کر سو گیا۔ ماہا، سارہ اور واحد سے ملنے اور انہیں گھر لے گئی تھی۔ وہ کچھ دیر میں وہاں آگئی۔ اگلی صبح ناشتے پر شیراز نے اسے تفصیل سے بتایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماہا کو اپنے خواب کا بتانے یا نہ بتانے۔ پھر اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ ماہا نے بتایا کہ اسکول میں معاذ کو فی الحال پریپ ٹو میں بٹھایا جا رہا ہے۔ دو ہفتے بعد داخلے شروع ہو جاتے تو وہ باقاعدگی سے اسکول جانے لگتا۔ اس معاملے میں ماہا کو کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اسکول انتظامیہ اس سے تعاون کر رہی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے معاذ کو تیار کیا اور وہاں کے ہارن پر وہ اسے لے کر روانہ ہوئی۔ شیراز اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ کپڑے بدل کر باہر آیا۔ پہلے اس نے واحد کا معلوم کیا۔ وہ صبح سویرے ہی ہسپتال چلا گیا تھا البتہ سارہ گھر میں تھی۔ شیراز ہسپتال پہنچا۔ راستے میں اس نے دفتر کال کر کے آج بھی نہ آنے کی اطلاع دے دی تھی۔

واحد سستے ہوئے چہرے کے ساتھ ہسپتال کے وینٹک روم میں بیٹھا تھا۔ شیراز اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد واحد نے بتایا کہ راحیل کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس صورت میں وہ آدی کو دو ہفتے سے زیادہ وینٹی لیٹر پر نہیں رکھتے ہیں۔ اگر راحیل کو دو ہفتے ہوش نہیں آیا تو وہ اسے وینٹی لیٹر سے ہٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ واحد نے بتایا کہ اس نے ایک بڑے نیوروسرجن سے رابطہ کیا تھا۔ وہ آج شام راحیل کو دیکھے گا۔ واحد کو امید تھی کہ شاید وہ راحیل کے لیے کچھ کر سکے۔ شیراز کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا پھر وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے واحد سے یہی کہا تھا کہ اسے دفتر میں ضروری کام ہے لیکن اس کا رخ دفتر کی طرف نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی کار گارمنٹ اسٹور کے سامنے رکی۔ اسٹور صبح دس بجے کھل جاتا

تھا مگر گاڑیوں کی آمد و رفت بارہ بجے تک شروع ہوتی تھی۔ شیراز اندر آیا تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اسٹور کے ملازمین اسے عام گاڑی سمجھے۔ شیراز اس حصے کی طرف بڑھا جہاں شیما اپنی ماں کے ساتھ موجود تھی۔ شیما کی ماں وہاں ریٹنگ پر کپڑے دیکھ کر رہی تھی۔ شیراز نزدیک آیا تو وہ اسے دیکھ کر چوٹی۔

”تم...“

”میں اس دن کے حوالے سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ شیراز نے آہستہ سے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ غلطی شیما کی تھی۔“ عورت نے نرمی سے کہا۔ ”میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ بات پولیس تک نہیں لے کر گئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ شیراز نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ”کیا میں ردا کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”کاش کہ ہمیں معلوم ہوتا۔“ عورت نے سرد آہ بھری۔ ”وہ کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی اور شام کے وقت کوچنگ کی کلاسز لیتی تھی۔ ایک شام وہ کوچنگ سے گھر آنے کے لیے نکلے مگر بھی گھر نہیں پہنچی۔ پولیس نے کوشش کی۔ ہم پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملی۔“ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”میرا بیٹا معاذ اکلوتا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں اکیلے بچے کوئی خیالی دوست بنا لیتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ معاذ نے بھی ایسا ہی ایک دوست بنایا ہوا ہے۔ وہ اسے ردا کہتا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ صرف اتفاق ہے۔ اس کا آپ کی گم شدہ بیٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ عورت نے سر ہلایا۔ ”میں پہلے ہی تسلیم کر چکی ہوں کہ بچے کو یوں اٹھا کر لانا شیما کی جذباتی غلطی تھی۔ وہ اپنی گم شدہ بہن سے بہت محبت کرتی ہے اسی لیے بچے کے منہ سے اس کا نام سن کر جذباتی ہو گئی۔“

”میں ایک بار پھر معذرت کرتا ہوں۔“ شیراز نے کہا اور اسٹور سے نکل آیا مگر وہ گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہ اتفاق تھا کہ معاذ بھی اس خیالی ہستی کا نام ردا لے رہا تھا؟ وہ گھر پہنچا تو اسی وقت ماہا معاذ کو لے کر وہاں سے اتر رہی تھی۔ اس نے حیرت سے شیراز کو دیکھا۔

”تم دفتر نہیں گئے؟“

”نہیں، میرا موڈ نہیں تھا اور پھر میں ہسپتال گیا تھا۔“ شیراز نے کہا۔ وہ سیزھیوں سے اوپر آئے۔ ماہا نے داخلی دروازے کا لاٹک کھولا۔

”راحیل کی حالت کیسی ہے؟“

”تقریباً ویسی ہی ہے۔ آج ایک بڑا نیوروسرجن اس کا معائنہ کرے گا۔“

”اللہ کرے راحیل صحت یاب ہو کر گھر آجائے۔“ ماہا نے دل سے کہا۔ ”وہ اکلوتا ہے اور اولاد کا دکھ ماں باپ ہی جانتے ہیں۔ جب معاذ غائب ہوا تھا تو مجھے لگا میری جان نکل گئی ہو۔ اب سارہ کی حالت نہیں دیکھی جا رہی ہے۔ تم اب تک ہسپتال میں ہی تھے؟“

شیراز نے سوچا اور پھر اسے بتا دیا۔ ”میں شیما کی ماں کے پاس بھی گیا تھا۔“

”کیوں؟“ ماہا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا ضرورت تھی؟“

”میں اس سے اس کی گم شدہ بیٹی کے بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔“

”اس کی گم شدہ بیٹی کا ہم سے کیا تعلق... یہ واقعہ تو ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہو گیا تھا۔“

”ہاں لیکن مجھے لگتا ہے کوئی نہ کوئی تعلق ہے... معاذ...“

”پلیز شیراز! تم پھر وہی موضوع نکال رہے ہو۔“

”آخر یہ کسی ردا کا نام کیوں لیتا ہے؟“ شیراز کو غصہ آ گیا۔ ”تم جانتی ہو میں نے کیسے جانا کہ شیما معاذ کو لے گئی ہے اور پھر ہم کیسے بالکل درست جگہ پہنچے؟“

”یہ اتفاق تھا۔“ ماہا بولی۔

”یہ اتفاق نہیں تھا۔“ شیراز نے کہا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور پھر معاذ کی طرف دیکھا۔

رابطہ

”ایسا ہوا ہے۔“ شیراز نے بے چینی سے کہا۔ ”یاد کرو شمیم نے کیا کہا تھا کہ میں ایک اچھا معمول ہوں، میں رابطہ کر سکتا ہوں اور اس کا مطلب ہے مجھے بہت سی باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ معاذ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی علم ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ گم شدہ ردا کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔“

اس بار ماہا بھڑکی نہیں۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کچھ دن پہلے میں معاذ کو لے کر باہر گئی تھی۔ تب شمیم نے سامنا ہوا تھا۔ اس نے ایک عجیب سی بات کی تھی کہ معاذ کی آنکھوں میں کوئی خاص بات ہے اور یہ چیز اسے تم سے ملی ہے۔“

شمیم کے نام پر شیراز کو خیال آیا کہ یہ سب اس واقعے کے بعد سے شروع ہوا تھا، جب سے شمیم نے اسے پہنچانا سزا کیا تھا۔ اس کے اندر کوئی تبدیلی آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی کھڑکی کھل گئی تھی اور اسے کچھ ایسی باتوں کا علم ہو رہا تھا جو مستقبل میں ہونی چاہئیں اور قبل از وقت اس کے علم میں آجاتی تھیں۔ مگر وہ دوبارہ وہ سب نہیں چاہتا تھا، ایک ہی تجربہ اس کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ اس واقعے میں کچھ کڑیاں غائب تھیں جیسے اس نے واحد کو اپنے گھر کے لاؤنج اور پھر مکان کی سیزھیوں پر دیکھا تھا۔ وہ بہت دل گرفتہ اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے خواب میں جو کیا تھا حقیقت میں سب ویسا ہی نہیں کیا تھا۔ البتہ راحیل کی خودکشی والی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ شیراز کو خیال آیا کہ یہ سلسلہ شمیم نے شروع کیا تھا، وہی اسے ختم کر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ملے گا اور اس سے کہے گا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کرے۔ مگر اس وقت وہ اپنے گھر پر نہیں ہوتی تھی۔

شیراز کو شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کے وقت موسم خراب تھا۔ آسمان پر بہت گہرے بادل تھے پھر سورج ڈوبتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شیراز برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑ اس کے پیروں تک آ رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ راحیل والے واقعے کے بعد گلی میں ویرانی سی ہو گئی تھی۔ لوگ اب شام کے وقت بھی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا۔ ساڑھے چھ بجے شمیم کی کار نمودار ہوئی اور اس نے اسے سڑک کے کنارے ہی روک دیا پھر تیز بارش سے بچتی ہوئی اپنے مکان کے برآمدے تک آئی۔ اس کے اندر جاتے ہی شیراز اٹھا اور بارش کی پروا کیے بغیر سر جھکائے

گھبرا کر آئے۔

شیراز کو شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کے وقت موسم خراب تھا۔ آسمان پر بہت گہرے بادل تھے پھر سورج ڈوبتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شیراز برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑ اس کے پیروں تک آ رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ راحیل والے واقعے کے بعد گلی میں ویرانی سی ہو گئی تھی۔ لوگ اب شام کے وقت بھی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا۔ ساڑھے چھ بجے شمیم کی کار نمودار ہوئی اور اس نے اسے سڑک کے کنارے ہی روک دیا پھر تیز بارش سے بچتی ہوئی اپنے مکان کے برآمدے تک آئی۔ اس کے اندر جاتے ہی شیراز اٹھا اور بارش کی پروا کیے بغیر سر جھکائے

شیراز کو شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کے وقت موسم خراب تھا۔ آسمان پر بہت گہرے بادل تھے پھر سورج ڈوبتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شیراز برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑ اس کے پیروں تک آ رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ راحیل والے واقعے کے بعد گلی میں ویرانی سی ہو گئی تھی۔ لوگ اب شام کے وقت بھی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا۔ ساڑھے چھ بجے شمیم کی کار نمودار ہوئی اور اس نے اسے سڑک کے کنارے ہی روک دیا پھر تیز بارش سے بچتی ہوئی اپنے مکان کے برآمدے تک آئی۔ اس کے اندر جاتے ہی شیراز اٹھا اور بارش کی پروا کیے بغیر سر جھکائے

شیراز کو شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کے وقت موسم خراب تھا۔ آسمان پر بہت گہرے بادل تھے پھر سورج ڈوبتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ شیراز برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑ اس کے پیروں تک آ رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ راحیل والے واقعے کے بعد گلی میں ویرانی سی ہو گئی تھی۔ لوگ اب شام کے وقت بھی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا۔ ساڑھے چھ بجے شمیم کی کار نمودار ہوئی اور اس نے اسے سڑک کے کنارے ہی روک دیا پھر تیز بارش سے بچتی ہوئی اپنے مکان کے برآمدے تک آئی۔ اس کے اندر جاتے ہی شیراز اٹھا اور بارش کی پروا کیے بغیر سر جھکائے

تیزی سے خمینہ کے مکان تک آیا۔ برآمدے میں آکر اس نے اپنی جیکٹ اور بالوں سے پانی جھاڑا اور کال نیل بجائی۔ دروازہ خمینہ نے کھولا اور اسے دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ”تم اس موسم میں؟“

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”آؤ، اندر آجاؤ۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ شیراز اندر آتے ہی بولا۔

”میں پریشان ہو گیا ہوں جب سے آپ نے مجھے ہینا ٹائر کیا ہے۔ میرے اندر پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ اگر کوئی کھڑکی کھل گئی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ یہ لختی کھڑکی بند ہو جائے۔“ بولتے ہوئے شیراز کی نظر لاؤنج میں بیٹھی خمینہ کی بیٹی پر گئی تو وہ چپ ہو گیا پھر اس نے کہا۔ ”سوری، میں شاید غلط بول گیا مگر میں اس کرب سے نجات چاہتا ہوں۔“

خمینہ نے پلٹ کر اپنی بیٹی کو دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی۔ خمینہ اسے لاؤنج میں لائی۔ وہ اس کی آمد سے ذرا بھی فکر مند نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شیراز اس کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ اسے صوفے پر بٹھا کر وہ بولی۔

”ہاں، اب کہو کیا مسئلہ ہے؟“

شیراز نے کہا۔ ”میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ خمینہ نے اس کی بات کاٹی۔

”تمہیں آنے والے وقت کے مناظر دکھائی دیتے ہوں گے۔ تمہاری چھٹی حس بہت زیادہ کام کرنے لگی ہوگی اور تم چیزوں سے خبردار ہو جاتے ہو گے۔ یہی ہو رہا ہے نا تمہارے ساتھ؟“

شیراز حیران ہوا۔ ”ہاں اور میں چاہتا ہوں یہ بند ہو جائے۔ میں کچھ جانتا نہیں چاہتا۔“

خمینہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے پوچھا۔ ”تمہارے ارد گرد کچھ غیر معمولی ہو رہا ہے جس کا اثر تمہاری اور تمہارے گھروالوں کی زندگی پر پڑ رہا ہے۔“

اس بار شیراز نے جواب دیا۔ اس نے خمینہ کو ردا کے بارے میں بتایا جو معاذ کو نظر آتی تھی اور جو شیما کی بہن تھی۔ وہ تین سال پہلے پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔ خمینہ کے چہرے پر دلچسپی نظر آئی۔ ”تم نے کبھی معاذ سے پوچھا کہ وہ کسی ہے... آئی میں ردا؟“

”نہیں، میں نے کبھی اس سے یہ نہیں پوچھا۔“

”تمہیں معلوم کرنا چاہیے۔“

”میں نے کہا میں کچھ معلوم نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے ہی

اس بات پر ماہا سے میری شدید جھڑپ ہو چکی ہے۔“ شیراز کا لہجہ پھر تیز ہو گیا۔ ”پلیز! اس چیز کو روکو۔“

”ٹھیک ہے، ہم کوشش کرتے ہیں۔“ خمینہ نے کہا۔

”تم ہینا ٹائر ہونے کے لیے تیار ہو؟“

”ہاں!“

”جسم ڈھیلا چھوڑ کر چند گہرے سانس لو۔“ خمینہ نے حکم دیا اور شیراز نے تعمیل کی۔ ”اب سنیما ہال کا تصور کرو... وہاں کیا رنگ ہے؟“

شیراز کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے دھیمی اور گہری آواز میں کہا۔ ”سرخ... پورا ہال اور اس کی چیزیں سرخ ہیں۔“

”وہ اب سیاہ ہو رہی ہیں... سیاہ رنگ ہر چیز پر چھا رہا ہے۔“

”سب سیاہ ہو رہا ہے۔“

”سوائے اسکرین کے... وہ بالکل سفید ہے۔“

”اسکرین سفید ہے۔“

”اسکرین پر کچھ لکھا ہے لیکن اسے دیکھنے کے لیے تمہیں اسکرین کے پاس جانا ہوگا۔“

”میں اسکرین کے پاس جا رہا ہوں۔“ شیراز نے کہا مگر وہ پہلے کی طرح پُر سکون نہیں تھا، بے چین ہو رہا تھا۔

”ہال میں کوئی ہے؟“

خمینہ نے کہا۔ ”وہاں کوئی نہیں ہے۔“

”نہیں ہے... اگلی نشست پر کوئی بیٹھا ہے۔“

”شیراز! وہاں کوئی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا... یہ ہال اصل میں تمہارا ذہن ہے اور اس میں صرف تم ہو سکتے ہو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں کوئی ہے...“ شیراز کی سانس تیز ہونے لگی۔ ”وہ... وہ کوئی عورت ہے...“

”اگر ہے تب بھی اسے نظر انداز کر کے اسکرین کی طرف بڑھو۔“

”میں نہیں جاسکتا، مجھے اس کے پاس سے گزرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، تم اس کے پاس سے گزرو گے لیکن اس کے پاس رکو گے نہیں۔“

شیراز کو لگ رہا تھا کہ وہ عورت اسے روکے گی۔ وہ رفتہ رفتہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچا عورت نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ عورت نہیں بلکہ لڑکی تھی۔ اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی

اور اس کے کھلے منہ سے سامنے کا ایک دانٹ غائب تھا۔ خلاف توقع اس نے شیراز کو روکنے کے بجائے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ تب شیراز نے اسکرین کی طرف دیکھا اور اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔ خاصا سرد موسم ہونے کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ خمینہ نے اسے پانی کا گلاس دیا جو اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ چند لمحے بعد اس کی حالت قدرے قابو میں آئی تو خمینہ نے پوچھا۔ ”اسکرین پر کیا لکھا تھا؟“

”صرف ایک لفظ۔“ شیراز نے جواب دیا۔

”کھودو۔“

خمینہ چونکی۔ ”اور عورت؟“

”وہ عورت نہیں لڑکی تھی۔ شاید سترہ اٹھارہ سال کی... اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔“

”اس نے تمہیں روکا؟“

”نہیں، اس کے برعکس اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا تھا۔“ شیراز نے کہا اور پھر پوچھا۔ ”یہ سب کیا تھا؟“

”میں درست طور پر نہیں جانتی۔“ خمینہ نے گہری سانس لی۔ ”لیکن یہ بات یقینی ہے۔ تمہارا کسی سے رابطہ ہے اور وہ تم سے کچھ چاہتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے اسکرین پر نظر آنے والا لفظ مشورہ ہے... وہ مجھ سے کھدائی چاہتا ہے؟“

”شاید۔“ خمینہ نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تمہارے ذہن میں کھلنے والی کھڑکی بند نہیں ہوئی ہے۔“

”کیوں؟“ شیراز نے احتجاج کیا۔

”میں نہیں جانتی۔ اسے کھولنا یا بند کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

”پھر کس کے اختیار میں ہے؟“

”تمہارے۔“ خمینہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے تم نے کھولا ہے اور تم ہی بند کر سکتے ہو۔“

”وہ کیسے؟“

”تم سے رابطہ کرنے والا جو چاہتا ہے، وہ پورا کر کے۔“ خمینہ نے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ تمہاری اور کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ امید ہے تم اس معاملے میں مزید مجھے زحمت نہیں دو گے۔“

شیراز نے سر ہلایا۔ ”مجھے بھی امید ہے۔“

وہ گھر واپس آیا تو ماہا اسے دیکھ کر فکر مند ہو گئی۔

”شیراز! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اتنا پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

”کیونکہ میں پریشان ہوں۔“ شیراز کہتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھا۔ ماہا اس کے پیچھے آنے لگی تو اس نے اسے روک دیا۔ ”پلیز! میں کچھ دیر کے لیے تمہاری چاہتا ہوں۔“

ماہا کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ وہ واپس چلی گئی۔ شیراز اوپر آیا اور اس نے معاذ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنی ڈرائنگ بک پر اسٹیج بنا رہا تھا۔ شیراز اس کے پاس آیا اور بیڈ کے کنارے بیٹھ کر کچھ دیر دیکھا رہا۔ معاذ پینل سے ملی کی تصویر بنا رہا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس نے بہت اچھا اسٹیج کیا تھا۔ شیراز نے اس کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گیا۔

”پاپا! میں نے اچھا بنایا ہے نا؟“

”بہت اچھا، یہ تو بالکل اصلی ملی لگ رہی ہے۔“

”مس بھی کہتی ہیں میں بہت اچھی ڈرائنگ بنا تا ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا۔ معاذ شیراز کو خمینہ کی بات یاد آئی کہ اس نے معاذ سے ردا کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسی لگتی ہے؟

”آپ ردا کی تصویر بنا سکتے ہیں؟“

معاذ نے سر ہلایا اور ڈرائنگ بک پر جھک گیا۔ وہ پینل سے خاکہ بنا رہا تھا اور چند منٹ بعد ایک لڑکی کا خاکہ سامنے تھا۔ یہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر اس میں دو چیزیں بالکل نمایاں تھیں۔ ایک لڑکی نے عینک لگائی ہوئی تھی اور دوسرے اس کا سامنے کا ایک دانٹ غائب تھا۔

☆☆☆

آج چھٹی تھی اسی لیے ماہا کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اتوار والے دن وہ الارم نہیں لگاتی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ معاذ بھی اپنے بستر پر نہیں تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے صبح صبح کہاں چلے گئے؟ اس نے سوچتے ہوئے فرنچ کھولا تو اس میں سامنے اورنج جوڑے کے کارڈن بھرے ہوئے تھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ شیراز یا وہ کبھی ناشتے میں اورنج جوڑے لیتے تھے مگر اتنی زیادہ تعداد میں کارڈن کبھی ان کے گھر میں نہیں آئے تھے۔ پھر کل رات تک یہ کارڈن فرنچ میں نہیں تھے۔ وہ چھوٹے کمرے کے ساتھ عقبی صحن کی طرف کھلنے والے دروازے تک آئی اور باہر جھانکا تو دنگ رہ گئی۔ شیراز اور معاذ صرف پینٹ اور ٹیکر میں زمین کھود رہے تھے۔ وہ باہر آئی۔ ”شیراز! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”کھدائی۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ ایک تین فٹ گہرے گڑھے میں کھڑا اسے مزید کھود رہا تھا اور نکالی جانے والی مٹی برابر میں ڈھیر کر رہا تھا۔ معاذ چھوٹے سے پلاسٹک کے بے نتیجے سے مٹی کے ڈھیر کو ایک طرف کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اصل کھدائی شیراز نے کی تھی اور معاذ صرف کھیل رہا تھا۔ البتہ اس کھدائی نے باغ کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ ماہا کے ہونٹ بچھکے گئے۔

”لیکن کیوں؟“

”ایسے ہی۔“ شیراز نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ضروری ہے ہر بات کا کوئی جواز ہو۔“

”شیراز! خدا کے لیے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔“ اس نے بیلچے زور سے مٹی پر مارا۔ ”اپنے پاگل پن میں یہ سب کر رہا ہوں؟“

شیراز کی آنکھیں سرخ اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہو۔ ماہا نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”پھر اس کا کیا مقصد ہے؟“

”میں کچھ تلاش کر رہا ہوں۔“ شیراز نے کہا اور دوبارہ بیلچے سنبھال لیا۔ یہ باغ اسی نے بنایا تھا۔ یہاں ایک کونے میں لگا ہوا لوکاٹ کا درخت خاصا بڑا ہو گیا تھا اور سنگترے کے درخت پر گزشتہ سیزن میں پھل آنا شروع ہو گئے تھے۔ مگن کا خاصا بڑا حصہ گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اور دیواروں کے ساتھ پھول دار پودوں کے تختے اور بیلین جھیں۔ مگن کے ساتھ والے حصے میں انگور کی تیل تھی جو گزشتہ سال لگائی گئی تھی اور اب خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کھدائی سے سارے ہی پودے متاثر ہو رہے تھے۔

”کیا تلاش کر رہے ہو؟“ ماہا نے کہا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ جب ہم یہاں آئے تو تم نے سارے مگن میں چار فٹ تک نئی مٹی ڈلوائی تھی۔ پرانی مٹی نکلوا دی تھی اگر یہاں کچھ ہوتا تو اس وقت ضرور ملتا۔“

”ہو سکتا ہے جو میں تلاش کر رہا ہوں، وہ اس سے زیادہ گہرائی میں ہو۔“

شیراز نے اپنا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور بولا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ میں سو رہی کرتا ہوں۔ مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

ماہا نے کہا۔ ”مجھے تمہارے طرزِ خطاب کی فکر نہیں ہے، تم جو کر رہے ہو اس کی فکر۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ تم نے جس نہیں لیا۔ شاید تمہارا ارادہ نہیں ہے۔“ شیراز نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کا گلاس بھی اٹھا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ ماہا نے اخبار رکھ دیا اور بولی۔

”ہلیز شیراز! میں پریشان ہوں۔ ابھی معین کا ایس ایم ایس آیا ہے۔ دادی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں سانس لینے میں پر اہلیم ہو رہی ہے۔ وہ بہت تکلیف میں ہیں۔“

”اب نہیں ہیں۔“ شیراز نے بے ساختہ کہا اور پھر یوں چپ ہو گیا جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ ماہا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”کیا۔۔۔ کیا تمہارے؟“

شیراز کھڑا ہو گیا۔ ”کچھ نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے میں نے جو کہا اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔“

”نہیں تم۔۔۔“ ماہا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ لاؤنج میں لگے فون کی گھنٹی بجی۔ ماہا نے اٹھ کر کال ریسیور کی تو شیراز باہر جا رہا تھا۔ اس نے سنا ماہا کہہ رہی تھی۔

”معین! ہاں ابھی تمہارا ایس ایم ایس دیکھا ہے۔۔۔“

شیراز باہر آیا۔ کچھ دیر بعد ماہا اندر سے روتی ہوئی برآمد ہوئی۔ ”دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

میری اور میرے رشتے داروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟“

شیراز نے نرمی سے کہا۔ ”ماہا! میں جو کر رہا ہوں، وہ اس گھر اور ہمارے خاندان کے لیے ضروری ہے۔“

”مرضی تمہاری۔“ ماہا نے کہا اور پاؤں پلٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنا اور معاذ کا مختصر سامان کار میں رکھ کر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھے بغیر اسے خدا حافظ کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

ماہا کا میکا دو گھنٹے کی مسافت پر دوسرے شہر میں تھا اور وہ اس سے پہلے بھی کئی بار خود ڈرائیو کر کے جا چکی تھی اس لیے شیراز کو اس کی فکر نہیں تھی۔ معاذ عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور باپ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی شیراز پھر مگن میں آیا اور کھدائی کرنے لگا۔ نیچے کی مٹی خشک تھی اور بہت سخت تھی۔ اسے نرم کرنے کے لیے وہ پانی سے گیلا کر رہا تھا۔ شیراز شام تک لگا رہا۔ اس نے نصف مگن کھود ڈالا تھا اور تقریباً چھ فٹ تک کھودا تھا مگر کچھ نہیں نکلا تھا۔ اس رات وہ نڈھال ہو کر لیٹا تو اسے صبح تک پتا نہیں چلا۔

داش روم سے فارغ ہو کر اس نے ناشتا کیا اور پھر مگن میں آ گیا۔ اب اس نے دوسرا نصف حصہ کھودنا شروع کیا۔ دوپہر تک وہ اسے بھی تقریباً کھود چکا تھا۔ وہ ہر تین فٹ کے بعد چھ فٹ گہرا گڑھا کھود رہا تھا۔ وہ لوکاٹ کے درخت کے پاس پہنچا اور یہاں کھدائی شروع کی تو ربر پائپ کی لمبائی اس سے پہلے ختم ہو گئی۔ یہ آٹھ فٹ لمبا تھا جبکہ گڑھا بارہ فٹ کی دوری پر تھا۔ اسے یاد آیا کہ تہ خانے میں مزید پائپ رکھا ہوا تھا۔ وہ نیچے آیا اور ربر پیک پر رکھا ہوا پائپ تلاش کر کے واپس آنے لگا تھا کہ اس کی نظر تہ خانے کے فرش پر گئی اور کچھ دیر بعد وہ کدال سے فرش توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر تہ خانے کا فرش بہت مضبوط کنکریٹ کا بنا ہوا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ یہ کام ایسے نہیں ہوگا، اسے مزید اوزاروں کی ضرورت تھی۔ اس نے غسل کر کے کپڑے پہنے اور سیکٹر کی مارکیٹ کے سب سے بڑے ہارڈویئر اسٹور پہنچ گیا۔

اس کا تعلق کنسٹرکشن سے تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کام کے لیے کون سے اوزار درکار ہوں گے۔ اس نے کنکریٹ میں سوراخ کرنے والی ایک بھاری ڈرل مشین، ایک بھاری ہتھوڑا اور کچھ دوسرے اوزار لیے۔ وہ واپس آ رہا تھا کہ موسم خراب ہونے لگا۔ موسم کئی دن سے خراب ہی تھا اور اکثر گرج چمک اور تیز طوفانی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوتی رہی تھی۔ جب وہ گھر کے سامنے کار سے اترتا تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ راستے میں کار کے ریڈیو کے مطابق

میری اور میرے رشتے داروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟“

شیراز نے نرمی سے کہا۔ ”ماہا! میں جو کر رہا ہوں، وہ اس گھر اور ہمارے خاندان کے لیے ضروری ہے۔“

”مرضی تمہاری۔“ ماہا نے کہا اور پاؤں پلٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنا اور معاذ کا مختصر سامان کار میں رکھ کر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھے بغیر اسے خدا حافظ کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

ماہا کا میکا دو گھنٹے کی مسافت پر دوسرے شہر میں تھا اور وہ اس سے پہلے بھی کئی بار خود ڈرائیو کر کے جا چکی تھی اس لیے شیراز کو اس کی فکر نہیں تھی۔ معاذ عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور باپ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی شیراز پھر مگن میں آیا اور کھدائی کرنے لگا۔ نیچے کی مٹی خشک تھی اور بہت سخت تھی۔ اسے نرم کرنے کے لیے وہ پانی سے گیلا کر رہا تھا۔ شیراز شام تک لگا رہا۔ اس نے نصف مگن کھود ڈالا تھا اور تقریباً چھ فٹ تک کھودا تھا مگر کچھ نہیں نکلا تھا۔ اس رات وہ نڈھال ہو کر لیٹا تو اسے صبح تک پتا نہیں چلا۔

اس پورے علاقے میں کئی شہروں تک طوفان باد و باران کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے کئی دن جاری رہنے کا امکان تھا۔ اس نے سامان تہ خانے تک پہنچایا۔ صبح ناشتے کے بعد اس کا گزارہ بس اور ٹیچ جس پر ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ آتے ہوئے اپنے لیے ہیزا لیٹا آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ پیٹ بھرے گا اور پھر کام کرے گا۔

☆☆☆

ماہا کو رہ کر شیراز کا خیال آرہا تھا۔ اگر دادی جان کی وفات کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ بھی اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہ آتی۔ آج دادی کا سوئم ہو گیا تھا اور آنے والے بیشتر مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ ماہا شام سے شیراز کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی لیکن کال مغرب کے بعد جا کر لگی تھی۔ اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”کہاں تھے تم، میں کئی دیر سے کال کر رہی ہوں۔“

”سو رہی۔“ شیراز نے معذرت کی۔ ”میں ذرا تہ خانے میں کام کر رہا تھا۔“

”اوہ اچھا۔۔۔ ویسے سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، سب ٹھیک ہے میں اب مگن میں کھدائی نہیں کر رہا ہوں۔“ شیراز نے جواب دیا۔ ”جب تم آؤ گی تو سب پہلے کی طرح ٹھیک ہوگا۔“

”ہاں میں سوچ رہی ہوں آج ہی آ جاؤں۔“

”آج۔“ شیراز بے چین ہو گیا۔ ”نہیں، موسم بہت خراب ہے۔“

”ابھی دن ہے، میں آرام سے پہنچ جاؤں گی۔ یہاں موسم ٹھیک ہے امید ہے کہ وہاں آتے آتے ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ماہا! میری بات سنو۔۔۔“ شیراز نے کہنا چاہا لیکن اسی لمحے کال کٹ گئی۔ ماہا نے پھر نہیں ملایا کیونکہ بات ہو گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی جہاں معاذ اپنی نانی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نانی سے مانوس تھا اور یہاں آ کر خوش ہوتا تھا۔ ماہا نے ماں سے کہا۔

”میں واپس جا رہی ہوں۔ گھر زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتی اور پھر نئی جا ب ہے۔ دو دن سے زیادہ چھٹی نہیں کر سکتی۔ کل لازمی جانا ہوگا۔“



لگ رہا ہے۔  
”کس سے؟“ ماہانے حیرت سے پوچھا۔  
”گھر سے... وہاں کچھ ہونے والا ہے۔“  
”بیٹا کچھ نہیں ہو رہا... چلو شاپس چلنے کی تیاری کرو۔“

”اسے یہاں چھوڑ جاؤ۔ ابھی داخلے شروع ہونے میں کچھ دن ہیں۔“ ماں نے سفارش کی۔ ماہانے سوچا اور سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، اس کا سامان بھی ہے۔ شاید اگلے اتوار کو میں اور شیراز دونوں آئیں۔“  
ماہا اس وجہ سے بھی مان گئی تھی کہ تعزیت کے لیے شیراز کا آنا لازمی ہو جائے۔ ابھی تو اس نے بہانہ کر لیا تھا کہ شیراز مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ دوسروں نے اس بات کو محسوس کیا تھا تو شیراز کے آنے سے وہ بھی مطمئن ہو جاتے۔ سب سے سلام دعا کر کے ماہا نکلنے لگی تھی کہ محاذ دوڑ کر آیا۔ اس نے ماہا کا ہینڈ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ ”ماما! آپ یہ بھول رہی ہیں۔ اس میں آپ کی اہم چیزیں ہیں۔“  
”تھینک یو بیٹا۔“ ماہانے اسے پیار کیا اور بیگ لے کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

احمد نواز توخیر کے ساتھ مارکیٹ کی طرف سے پیدل آ رہا تھا۔ وہ واحد کے بیٹے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کا معائنہ کرنے والے مشہور نیوروسرجن نے بھی ناامیدی ظاہر کی تھی۔ وہ گلی میں داخل ہوئے اور جب احمد نواز کے گھر کے پاس پہنچے تو انہیں شیراز کے گھر سے بھاری ڈرل مشین چلنے کی آواز آرہی تھی اور پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی بھاری ہتھوڑے سے سنگریٹ توڑ رہا ہو۔ احمد نواز نے تشویش سے کہا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے؟ کل سے اس کے گھر سے ایسی آوازیں آرہی ہیں۔ اس نے اپنا عقربی گمن بھی کھو ڈالا ہے۔“

”میرا خیال ہے کوئی کنسٹرکشن کا کام کرانا چاہتا ہے۔“ توخیر بولا۔  
”لیکن یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے خود ہی توڑ پھوڑ کر رہا ہے۔ ہمارے گھر لٹے ہوئے ہیں، اس کا اثر میرے گھر پر نہ آئے۔ تم دھماکے سن رہے ہو ان کی دھمک یہاں تک آرہی ہے۔ یہ دیواریں بڑھا دینے کے لیے کافی ہے۔“

”میرا خیال ہے ان مکانات کی بیس اور دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ کچھ سال پہلے آنے والے شدید زلزلے کا

ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔“ توخیر نے کہا اور پھر پیشکش کی۔  
”ایک کپ چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ احمد نواز مان گیا اور وہ دونوں توخیر کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

شیراز ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا مگر موبائل خاموش تھا۔ موسم کا اثر موبائل سگنل پر بھی آیا تھا۔ شیراز بہ مشکل لاؤنج میں لگے فون تک آیا اور جب ریسو اٹھایا تو اسے بھی ڈیڑ پاپا۔ اس نے مایوسی سے فون شیخ دیا۔ وہ ماہا کو نہیں روک سکتا تھا اور یہاں گھر کی حالت۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دیکھا۔ لاؤنج کا فرنیچر کھسکا دیا گیا تھا۔ سیڑھیوں سے باہر عقربی گمن تک مٹی اور دوسرا المبا بکھرا ہوا تھا۔ پتھر گندا ہوا تھا کیونکہ شیراز ہاتھ اور چیزیں دھونے کا کام وہیں کر رہا تھا۔ یہ تو اوپر کی حالت تھی۔ تہ خانے کی اس سے زیادہ بری تھی۔ اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ ماہا یہ سب دیکھتی تو شیراز اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا کیا ڈرمل ہوتا؟ وہ نیچے تہ خانے میں آیا۔ اس نے تمام سامان اپنے اپنے ٹھکانے پر لگایا۔ باقی جہاں سے اس نے فرش توڑا تھا وہاں جا بہ جا کھدائی کی ہوئی تھی۔ مٹی کے جوڈھیر یہاں نہیں رکھ سکا تھا انہیں پوری میں بھر کر عقربی گمن تک پھینک آیا تھا۔ گھر ہی نہیں وہ خود بھی سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ یہ مٹی اوپر بیڈ روم اور واش روم تک جا پہنچی تھی اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گھر کے دوسرے حصوں کو صاف کر سکتا۔ اس کی ساری توجہ کھدائی کی طرف تھی۔

تہ خانے کی دیواریں سرخ اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ نیچے آ کر شیراز نے بھاری ہتھوڑا اٹھایا۔ اس کا دستہ تین فٹ لمبا تھا اور اسے کسی کلہاڑی کی طرح استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہتھوڑا اٹھ کر فرش پر مارا پھر اٹھا کر پیچھے کیا تھا کہ بے دھیانی میں ہتھوڑا عقربی دیوار سے کرا یا اور اس کی کچھ اینٹیں اندر کی طرف کھسک گئیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان اینٹوں کے پیچھے مٹی نہ ہو بلکہ خلا ہو، اسی وجہ سے اینٹیں پیچھے کھسک گئی تھیں۔ شیراز کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہتھوڑے سے چند ہلکی ضربیں لگا لیں تو کھسک جانے والی اینٹیں اندر گر گئیں اور تاریک خلا نظر آنے لگا۔ شیراز ایمر جنسی لائٹ اٹھا لیا اور روشنی اندر ڈال کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پوری جانفشانی سے دیوار سے اینٹیں نکال رہا تھا۔ جیسے جیسے خلا بڑا ہوا تھا، دوسری طرف کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں اس نے دیوار میں دو باقی تین فٹ کا سوراخ کر دیا تھا۔ اس کے دوسری

طرف کوئی چیز پلاسٹک شاپر میں لپٹی کھڑی تھی۔ یہ لمبی اور انسان جیسی کوئی چیز تھی۔

شیراز نے ایمر جنسی لائٹ اس طرح رکھی کہ اس کی روشنی سوراخ کے دوسری طرف جا رہی تھی وہ ایک چاقو لے آیا۔ قریب سے دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش ہی تھی۔ اس نے ہمت کی اور چیز پر لپٹا ہوا شاپر کاٹنے لگا۔ یہ تعمیراتی کام میں آنے والا پلاسٹک شاپر تھا جو بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی شیٹ تعمیر سے پہلے پلنتھ میں بچھاتے ہیں تاکہ زمین کی سیم مکان کو متاثر نہ کرے۔ جیسے جیسے شیٹ کی تہیں کٹ رہی تھیں، وہ چیز واضح ہوتی جا رہی تھی اور جب ساری تہیں کٹ گئیں تو اس نے دونوں ہاتھوں سے شاپر زچا کر کھولے اور پھر ہڑ بڑا کر پیچھے ہٹا۔ شاپر میں ایک ڈھانچا ہو جانے والی لاش تھی۔ اگرچہ اسے ساخت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی لاش ہی تھی مگر اس حالت میں ہوگی، یہ نہیں سوچا تھا۔

لاش کا چہرہ جس پر ٹینک تر جی سی ہو کر گئی تھی تقریباً ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ کسی لڑکی کی لاش تھی۔ اس کے سر سے اتر جانے والے لمبے بال شانوں پر موجود تھے۔ اس کا لباس بھی نسوانی تھا۔ ورنہ باقی کسی اور چیز سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ لاش کس کی ہے۔ شیراز نے خود پر قابو پانے کے لیے اوپر آ کر پانی پیا۔ اس دوران میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر ایک خیال کے ساتھ وہ نیچے آیا اور ایمر جنسی لائٹ کی روشنی میں لاش کے دائیں ہاتھ کا معائنہ کیا۔ لاش کے سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شیراز جان گیا کہ وہ کون ہے۔ وہ شیمایا کی گمشدہ بہن ردا تھی اور اُنہیں اسے جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

شیراز نہیں جانتا تھا کہ ردا کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس کی راہنمائی ردا نے ہی کی تھی اور اب اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ معاذ جس ردا کا ذکر کرتا تھا، وہ یہی تھی۔ شیراز نے اپنا دانت ٹوٹے دیکھا تھا۔ خواب میں اسے لگا کہ اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا ہو۔ یہ سب ردا کی طرف سے اشارے تھے۔ لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جو سمجھ رہا ہے، حقیقت بھی وہی ہے۔ شیمایا کی گمشدہ بہن ردا کا نام لے کر ماں کو کہتا ہے سب ایک ہی سلسلے کی کڑی تھی۔ ردا یا وہ جو کوئی بھی تھی، اس کا مقصد اس لاش تک ان کی راہنمائی کرنا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ لیکن وہ یہ کس طرح جان

وابطہ

سکتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس نے سوچا اور ڈھانچا ہوجانے والی لاش کو دیکھا اور پھر اسے شہینہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھا معمول ہے، وہ رابطہ کر سکتا ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ آگے کیا اور اسے لاش کے خشک ہوجانے والے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ رکھا، اسے ایک جھکاساگ۔

☆☆☆

لڑکی بہت تیز بارش میں سر جھکائے اور اپنا بیگ سینے سے لگائے سڑک پر جا رہی تھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ اس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے اور بارش جیسے ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ گھر سے چلی تو آسمان صاف تھا اور سورج چمک رہا تھا۔ اب بھی سورج نکلا ہوا تھا۔ مگر بہت تاریک بادلوں کے پیچھے چھپا تھا اور ماحول ایسا تھا جیسے بس رات ہونے والی ہو۔ اس وقت وہ جس سڑک سے گزر رہی تھی اس کے دونوں طرف آبادی تھی لیکن آگے جا کر یہ سڑک جنگل کے بیچ سے گزرتی تھی اور اسے وہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ مگر یہ آنا جانا اس کی مجبوری تھی۔ وہ غریب گھرانے کی لڑکی تھی اور اس کی ماں کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ اسے گھر پر ٹیوشن لگا کر دے سکتی۔ اس لیے اسے کوچنگ سینٹر جانا پڑتا تھا۔ ماں کے بعد وہی گھر کی بڑی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ تعلیم مکمل کر کے کہیں جا ب کرے اور اپنی ماں کی مشکلات کم کرے جس نے انہیں پالنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی تھی۔

وہ پانچ بجے جاتی تھی اور سات بجے تک اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ آج بارش کا امکان ہے تو وہ چھتری لے کر نکلتی۔ اب وہ گھر تک پہنچتی ہوئی جاتی۔ وہ تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ اس گلی میں داخل ہوئی جس کے بعد آبادی ختم ہو جاتی تھی اور جنگل شروع ہوتا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا مگر اسے گزرتا اسی جنگل سے تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس خوف سے پریشان تھی، وہ جنگل میں نہیں بلکہ آبادی میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر رفتار تیز کی اور آخری گھر کے پاس تھی کہ اچانک اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑا۔ وہ لڑکھڑائی اور اس کا پاؤں مڑ گیا۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی۔ پاؤں میں ٹیس اٹھی اور وہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ گول چکنا پتھر تھا جو بیگ کر اور چکنا ہو گیا تھا اور اس کا پاؤں اس پر پڑا تھا۔ وہ اپنا پاؤں ٹٹول رہی تھی۔ اس کے سینے میں موج آگئی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس سے کھڑا نہیں ہوا گیا۔ اچانک اسے پاس

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دیوقامت سے کہہ رہا تھا۔ "اے چھوڑ دو... اسے جانے دو۔"

"سٹ اپ۔" دیوقامت غرایا۔ اس وقت اس کے چہرے پر حیوانی تاثرات تھے۔ لڑکی تڑپ رہی تھی۔ پاؤں سٹخ رہی تھی اور ہاتھ اٹھانے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ مگر دوسرے لڑکے نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ اس نے فرش پر انگلیاں پھینکیں تو اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا۔ اسی کشمکش میں ان دونوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ اب وہ اپنی عزت بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی جان بچانے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ دیوقامت کا ہاتھ بہت سختی سے اس کی گردن پر جما ہوا تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اچانک وہ ساکت ہوئی اور اس کا مچلتا ہوا جسم ڈھیلا ہوا تو دوسرے لڑکے نے گھبرا کر کہا۔

"اے کیا ہوا؟"

"بے ہوش ہو گئی ہے۔" دیوقامت نے بے پردائی سے کہا۔ اس نے لڑکی کا گلا چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں، یہ سانس بھی نہیں لے رہی ہے۔" دوسرے لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم خود دیکھو۔"

اس بار دیوقامت نے بھی جھک کر دیکھا۔ لڑکی کی آنکھیں مکلی تھیں اور ان سے دہشت جھانک رہی تھی۔ اس کا سانس سچ سچ رکا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کی نبض دیکھی پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ دونوں ساکت تھیں۔ اس نے دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ "میں کہہ رہا تھا... یہ مر چکی ہے۔"

"لیکن کیسے؟" دیوقامت نے سوال کیا۔ اس کے چہرے پر بھی اب حیوانیت کی جگہ ہائیاں اڑنے لگی تھیں۔ "میں نے تو صرف اسے پیچھے سے روکا تھا۔"

"تم نے بہت زور سے اس کا گلا دبا یا تھا۔ یہ دیکھو، تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔" دوسرے لڑکے نے اشارہ کیا۔ وہ دونوں زیادہ عمر کے نہیں تھے مگر تھے تو جوان لڑکے۔ دیوقامت نے غور سے دیکھا تو واقعی لڑکی کی نازک گردن پر اس کی انگلیوں کے نشانات بہت گہرے ثبت ہوئے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور کھڑا ہو گیا۔ دوسرا نوجوان سر تمام کر کمرے میں ٹپکتے لگا۔ اس نے دیوقامت سے پوچھا۔

"اب کیا کریں؟"

"ہمیں اس لاش کو چھپانا ہوگا۔" دیوقامت نے کہا۔ "اسے تہ خانے میں لے جانا ہوگا۔" دیوقامت نے کہتے

سے آواز آئی۔

"اے، کیا ہوا ہے تمہیں؟"

لڑکی چونکی اور اس نے خوف زدہ نظروں سے اس دیوقامت لڑکے کو دیکھا جو اس کے پاس کھڑا تھا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے لان کا ہلکا سا سوٹ پہنا ہوا تھا جو بیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ دوپٹا بھی اسے چھپانے سے قاصر تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے سینے پر بیگ رکھ لیا اور کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ گرنے لگی اور اسی لمحے لڑکے نے اسے تھام لیا۔ شاید وہ اسے سہارا دے رہا تھا مگر اسے پکڑتے اور اس کا لمس محسوس کرتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اچانک لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے پھینچ کر اس مکان کے اندر لے جانے لگا جس کے آگے وہ گری تھی۔ لڑکی مچلی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر لڑکا بہت طاقتور تھا، اس کی گرفت سخت ناقابل شکست تھی۔ لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں اسے اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس کا بیگ وہیں گر گیا۔ لڑکے نے کسی سے کہا۔

"بیگ اٹھاؤ... جلدی۔"

تب لڑکی نے دوسرے لڑکے کو دیکھا۔ وہ مضطرب تھا مگر اس نے دیوقامت کی بات مانی اور بیگ اٹھا کر پیچھے آنے لگا۔ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "شانی... یہ کیا کر رہے ہو... اسے چھوڑ دو۔"

مگر لڑکے نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ لڑکی کو کھینچ کر اس خالی مکان میں لے آیا جس کی دیواروں پر تازہ رنگ و روغن ہوا تھا۔ ابھی کچھ کام باقی تھا اور اسی لیے مکان خالی تھا۔ لڑکا لڑکی کو تھپی چھوٹے کمرے میں لے آیا اور اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور چلائی تھی کہ لڑکے نے اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا مارا اور وہ پلٹ کر گری تو اس کے منہ سے خون کی دھار کے ساتھ سامنے کا دانت بھی باہر گرا۔ دیوقامت نے اسے سیدھا کر کے اس کا گلا دیوچ لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ لڑکی کا لباس اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا لڑکا پاس ہی تھا اور اس نے بیگ نیچے پھینک دیا تھا اور سر پر ہاتھ رکھے مضطرب انداز میں ہل رہا تھا۔ دیوقامت کی قوت کے باوجود لڑکی اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے غرا کر دوسرے لڑکے سے کہا۔

"دیکھ کیا ہے ہو؟ اس کے ہاتھ قابو کرو۔"

نوجوان آگے آیا اور اس نے لڑکی کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے فرش پر دبا لیے۔ مگر وہ اب بھی

بکھری چیزیں اور ملتا دیکھا۔ اس نے شیراز سے پوچھا۔  
 ”کیا تم نے مکان میں توڑ پھوڑ کی ہے؟“  
 شیراز نے سر ہلایا۔ ”تب ہی تو میں حقیقت تک پہنچا ہوں۔“

واحد نے سوال نہیں کیا۔ اس کا رویہ لاتعلقانہ سا تھا۔  
 باوجود اس کے کہ وہ شیراز کی فرمائش پر یہاں چلا آیا تھا۔  
 شیراز اسے لے کر تہ خانے میں آیا اور ایمر جی لائٹ اٹھا کر  
 اسے سوراخ کے پاس جانے کو کہا۔ واحد کے چہرے پر  
 خاصے سرد موسم میں بھی پسینا آ رہا تھا اور وہ یوں سوراخ کی  
 طرف بڑھا جیسے اسے معلوم ہو کہ اسے وہاں دیکھنے کو کیا ملے  
 گا؟ اس نے اندر جھانکا اور گہری سانس لے کر پلٹا۔ شیراز  
 نے کہا۔ ”تم جانتے تھے یہاں کیا دیکھنے کو ملے گا؟“

واحد نے سر ہلایا۔ ”میں نے کچھ دیر پہلے ہی راحیل  
 کی ڈائری پڑھی ہے اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے  
 خود کشی کیوں کی؟“  
 ”اصل قصور اس کا نہیں ہے۔“ شیراز نے کہا تو واحد  
 نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“  
 ”تمہیں یاد ہے، تم نے مجھے معمول بننے کے لیے  
 راضی کیا تھا؟“

”ہاں تو پھر... وہ سب ایک مذاق تھا۔“  
 ”واحد! وہ مذاق نہیں تھا۔ میں اس جگہ اسی وجہ سے  
 پہنچا ہوں۔ میں نے راحیل کو پہلے ہی خود کشی کرتے دیکھ لیا  
 تھا۔ افسوس کہ میں اس واقعے کو ہونے سے نہیں روک سکا۔  
 تم نہیں جانتے تھیندے کے عمل سے میرے اندر ایک کھڑکی کھل  
 گئی ہے۔ اب میں بہت سی باتیں جان جاتا ہوں اور بہت  
 سے رازوں سے واقف ہو جاتا ہوں۔“

”یہ بھی ایک راز ہے۔“ واحد نے ردا کی لاش کی  
 طرف دیکھا۔  
 ”راز تھا۔“ شیراز کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”اب یہ راز نہیں  
 رہے گا۔ یہ مظلوم لڑکی مستحق ہے کہ اسے اس کی آخری آرام  
 گاہ تک پہنچایا جائے اور اس کے ساتھ ظلم کرنے والوں کو سزا  
 ملے۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل جائے کہ ان کی لڑکی کے  
 ساتھ کیا ہوا تھا۔ ان کے دماغی دلوں کو قرار آ جائے۔“

واحد بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”شیراز...  
 میرا بیٹا تقریباً مر چکا ہے۔ کیا اسے بھی مجرم ٹھہرایا جائے  
 گا؟“

شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جانتا کہ اسے

ہوئے لڑکی کی لاش کسی سگھونے کی طرح اٹھا کر شانے پر  
 ڈال لی اور تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ دوسرا  
 نوجوان لڑکی کی گر جانے والی بینک اور اس کا بیگ اٹھا کر  
 اس کے پیچھے گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا  
 ہے کہ اس لاش کا کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

شیراز کو جھٹکا لگا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس نے  
 لاش کی طرف دیکھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ردا کیسے جان سے گئی  
 تھی۔ ڈھانچے کے ساتھ ایک بیگ بھی تھا جس میں یقیناً اس  
 کی کتابیں تھیں۔ شیراز نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔  
 ”تو یہ بات ہے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اس  
 واردات کے دونوں کردار اس کے پڑوسیوں اور دوستوں  
 کے بچے تھے۔ یہ وہ نوجوان تھے جنہیں وہ ابھی تک بچہ سمجھتا  
 تھا۔ ان میں سے ایک لڑکا خود کشی کی کوشش کے بعد اسپتال  
 میں زندگی و موت کے درمیان پڑا تھا اور دوسرا بدستور سینہ  
 تانے دندنا پھر رہا تھا حالانکہ اصل مجرم وہی تھا۔ جب  
 شیراز کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ اوپر آیا اور پھر مکان سے باہر  
 آ کر واحد کے مکان کی طرف بڑھا۔ اس نے کال بل بجائی  
 تو واحد نے خود دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ شیراز کو  
 بے اختیار اپنا خواب نظر آیا۔ واحد بالکل اس خواب کی طرح  
 پریشان اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر شیراز سمجھا کہ وہ راحیل کی  
 حالت کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ابھی اسے اصل دھچکا نہیں  
 لگا تھا۔ جب اسے معلوم ہوتا کہ اس کا بیٹا کیا بھیانک جرم کر  
 چکا ہے تو نہ جانے اس کی کیا حالت ہوتی۔ اس نے شیراز کی  
 طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”دوست... میرے ساتھ آؤ۔  
 میرے پاس تمہیں دکھانے کو کچھ ہے۔“

واحد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔  
 ”ہاں آج میرے علم میں نئی نئی باتیں آرہی ہیں۔ تم ٹھیک  
 کہہ رہے ہو، تمہارے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہ کچھ  
 ہوگا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“  
 ”ایک منٹ میں ابھی آیا۔“ واحد کہہ کر اندر چلا گیا۔  
 کچھ دیر بعد واحد اندر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا  
 تولیے جیسا رومال تھا۔ وہ باہر آئے اور شیراز کے مکان کی  
 طرف بڑھے۔ جب وہ احمد نواز کے مکان کے سامنے سے  
 گزرے تو انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ دو آنکھیں انہیں گھور رہی  
 ہیں۔ شیراز کے مکان کے اندر آنے پر واحد نے وہاں

مجرم ٹھہرایا جائے گا یا نہیں لیکن میں پولیس کو رپورٹ ضرور  
 کروں گا۔“  
 ”تم ایسا نہیں کرو گے۔“ واحد کے لہجے میں الجھا  
 آ گئی۔ ”خدا کے لیے... ہم پہلے ہی بہت مشکل میں  
 ہیں۔“

شیراز کا دل پھٹنے لگا۔ واحد عمر میں اس سے بڑا تھا  
 مگر دونوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس سے محبت  
 کرتا تھا اور اسے یوں ٹوٹا دیکھ کر اس کا دل نرم پڑ گیا۔  
 ایک کے بعد دوسرا صدمہ برداشت کرنا اس کے لیے مشکل  
 تھا۔ اگر راحیل زندہ نہ رہتا تب بھی وہ کسی سے نظریں  
 ملانے کے قابل نہ رہتا۔ واحد ذاتی طور پر بہت شریف  
 انسان تھا۔ شیراز اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر دوسری  
 طرف معاملہ بہت بڑا اور سنگین تھا۔ وہ اسے چھپاتا تو نہ  
 صرف قانون کی خلاف ورزی کرتا بلکہ اس مظلوم لڑکی کا  
 مجرم بھی بن جاتا۔ اس کی ماں اور بہن آج بھی اس کی تلاش  
 میں تھیں اور ان کی تلاش ختم ہونی چاہیے تھی تاکہ ان کے  
 دلوں کو قرار آئے۔ شیراز کٹکٹکٹ میں تھا اور واحد اسے غور  
 سے دیکھ رہا تھا۔ جب شیراز نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے  
 گہری سانس لی۔ ”مجھے معلوم تھا تم نہیں مانو گے... کیونکہ  
 تمہارا بیٹا زندگی و موت کی کٹکٹکٹ میں جھٹل رہا ہے۔ تم اس  
 دکھ اور کرب سے نہیں گزر رہے ہو جس سے میں گزر رہا  
 ہوں۔“ واحد کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

شیراز نے نرم لہجے میں کہا۔ ”پلیز واحد! مجھے سمجھنے کی  
 کوشش کرو... یہ ضروری ہے۔“

”کچھ ضروری نہیں ہے... یہ تین سال سے یہاں  
 ہے، یہ ہمیشہ یہاں رہ سکتی ہے۔ قیامت تک... اسے کیا  
 فرق پڑے گا؟ یہ مر چکی ہے۔ فرق ہم زندہ لوگوں کو پڑے  
 گا۔ نہیں شیراز! میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ میرا  
 بیٹا پہلے ہی مر چکا ہے۔ میں اس کی لاش کے ساتھ کچھ نہیں  
 ہونے دوں گا۔“ واحد نے کہتے ہوئے ہاتھ میں موجود  
 رومال گرا دیا اور اس میں دبا ہوا چھوٹا سا ریولور سامنے  
 آ گیا۔ اس نے ریولور شیراز کی طرف کیا تو وہ بے ساختہ  
 ہاتھ اٹھائے پیچھے ہوا۔ اسے لگا کہ واحد اس پر گولی چلا دے  
 گا۔ اسے ختم کر کے وہ اس راز کو ہمیشہ کے لیے راز ہی رہنے  
 دے گا تاکہ اس کے بیٹے پر الزام نہ آئے۔ یہاں کوئی نہیں  
 تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ واحد اس کے ساتھ آیا تھا۔ باہر  
 گرج چمک کے ساتھ بارش جاری تھی۔ اس کے شور میں کسی  
 کو گولی چلنے کی آواز نہ آتی۔ مگر گولی نہیں چلی۔ شیراز نے

آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ٹکٹکٹ کا تاثر واحد کے چہرے پر تھا۔  
 وہ اپنے دوست پر گولی نہیں چلا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا  
 تھا اور بالآخر جھک گیا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”شیراز!  
 جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”تم...“  
 ”چلے جاؤ۔“ واحد نے چلا کر کہا۔ ”اس سے پہلے کہ  
 میں فیصلہ بدل دوں۔“  
 شیراز پیچھے ہٹا اور سیڑھیوں سے اوپر آ گیا۔ اسی لمحے  
 کسی نے دروازے پر دستک دی۔

☆☆☆

ماہانے ہائی وے پر نصف راستہ طے کیا تھا کہ موسم  
 خراب ہو گیا۔ تیز بارش کے ساتھ بجلی بھی رہ رہ کر کڑک رہی  
 تھی اور ہوا بہت تیز تھی۔ ہوا کے ساتھ پانی کی بو چھاڑتی  
 تو بعض اوقات کچھ دیر کے لیے ونڈا سکرین اندھی ہو جاتی  
 تھی۔ اس رفتار سے حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ مجبوراً اس نے  
 رفتار کم کر دی۔ اسے شیراز کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی  
 تھی کہ لڑکھڑا کر کسی طرح اسے ساتھ لے آئی، اسے چھوڑ کر  
 نہ آئی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا اور وہ کیوں محن  
 میں کھدائی کر رہا تھا؟ ماہا کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شیراز  
 اسے جھوٹی تسلی دے رہا تھا۔ گھر میں گڑ بڑ تھی اور وہ اس  
 سے چھپا رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خراب موسم کے باوجود نکل  
 آئی تھی۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی گھر نہیں پہنچ  
 سکے گی۔ ابھی وہ شہر میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی اور رات ہو  
 چکی تھی۔

اسے خیال آیا کہ شیراز کو کال کر کے بتا دے۔ اس  
 نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا تو اس کا ہاتھ اس چھری سے  
 ٹکرایا جو وہ سفر کے دوران میں ساتھ رکھتی تھی۔ اگرچہ یہ  
 معمولی سا ہتھیار تھا مگر کسی ناگہانی صورت حال میں وہ خالی  
 ہاتھ تو نہ ہوتی۔ اس نے موبائل نکالا اور شیراز کو کال کرنے  
 لگی۔ مگر جواب میں نیٹ ورک ایر کنکشن کا پیغام آ رہا تھا۔  
 چند بار ناکام کوشش کے بعد اس نے گھر کا نمبر ملانا چاہا، تب  
 بھی یہی پیغام آ رہا تھا۔ اصل میں اس پورے علاقے میں  
 موبائل سگنل ہی کام نہیں کر رہے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا  
 کہ گھر کا فون بھی بارش کے بعد سے خراب ہو گیا تھا۔ طوفان  
 بہت شدید تھا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ شہر میں داخل ہوئی۔  
 اب بیس منٹ کا سفر اور باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شیراز لاؤنج میں آیا اور ٹھنک گیا۔ ساٹھ والی کھڑکی

تمہارے حلیے سے لگ رہا ہے تم کھدانی کرتے رہے ہو۔  
دو دن سے تمہارے گھر سے کنکریٹ توڑنے کی آوازیں  
آ رہی ہیں۔ تم کہاں کام کر رہے تھے؟“  
”بابا! میرا خیال ہے یہ یہ خانے میں کام کر رہا ہے۔“  
شاہنواز بد تیزی سے بولا۔ احمد نواز نے شیراز کو گھورا۔ اس  
نے بیٹے کی بد تیزی کا کوئی ٹوس نہیں لیا تھا ورنہ عام حالات  
میں وہ ایسے لہجے پر شاہنواز کو بھانڈ کر رکھ دیتا۔

”تم کیوں کھدانی کر رہے ہو؟“  
”فرش میں سیلن آرہی تھی، اسے نئے سرے سے  
بنواؤں گا۔“

”تب یہ کام مزدوروں سے لے سکتے تھے... خود  
سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“  
”وہ... میں فارغ تھا اس لیے سوچا توڑ پھوڑ کا کام  
خود کروں۔“

”بابا! یہ کیوں کر رہا ہے۔ اس نے یقیناً دیوار توڑ دی  
ہوگی۔“ شاہنواز کا لہجہ تیز تھا۔

احمد نواز نے ہاتھ اٹھا کر بیٹے کو چپ رہنے کا اشارہ کیا  
اور نرم لہجے میں بولا۔ ”شیراز! تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شیراز نے ذرا سخت لہجے  
میں کہا۔ ”تم دونوں باپ بیٹے کس طرح سے مجھ سے گفتگو کر  
رہے ہو؟“

”یہ یوں نہیں مانے گا۔“ شاہنواز نے پھر کہا۔

”تم چپ رہو۔“ احمد نواز نے اس بار اسے جھڑکا اور  
شیراز سے بولا۔ ”دیکھو اگر تم نے کچھ دیکھ لیا ہے تو بتا دو۔  
میں اب بھی معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔“

شیراز نے چابیاں تمام لی گئیں اور تیل کٹر گرفت میں  
لے لیا تھا۔ ”نواز فوراً اپنے بیٹے کو لے کر میرے گھر سے چلے  
جاؤ۔“

”بابا! میں نے کہا ہے تا یہ اس طرح نہیں مانے گا۔“  
شاہنواز بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکا۔ اس کے نزدیک  
آتے ہی شیراز اسے جھکائی دے کر دروازے کی طرف لپکا

مگر چالاک شاہنواز نے عقب سے اس کے پاؤں پر لات  
ماری اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ابھی اٹھ رہا تھا کہ پیچھے  
سے احمد نواز نے اس کے سر پر پستول کا دست مارا اور وہ  
دوبارہ گر گیا۔ احمد نواز بیٹے پر برس رہا تھا کہ اس نے احمقانہ  
حرکت کی تھی۔

”میں معاملہ سنبھال لیتا۔“  
”کس طرح سے؟“ شاہنواز تیز لہجے میں بولا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 286 مئی 2014ء

”مجھے یقین ہے یہ دیوار ہٹا کر لاش دیکھ چکا ہے۔“  
”کاش تو میری اولاد نہ ہوتا۔“ احمد نواز نے گہری  
سانس لے کر کہا۔ ”میں بھی زندگی میں کسی کے ہاتھوں اتنا  
مجبور نہیں ہوا جتنا تیرے ہاتھوں ہوا ہوں۔“

”بابا! اس کا کیا کرنا ہے؟“ شاہنواز نے ایک۔  
پُرغور مسکراہٹ کے ساتھ کہا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ  
اس کے آگے مجبور ہے۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ کسی  
صورت شاہنواز کو گنوا نہیں سکتا تھا۔ وہی اس کی اگلی نسل کا  
خاص تھا۔ احمد نواز نے فرش پر پڑے شیراز کو دیکھا۔

”اب وہ کرنا پڑے گا جو میں نہیں چاہتا تھا۔“ اس  
نے کہتے ہوئے صوفے سے ایک کٹن اٹھا کر پستول اس میں  
دباتے ہوئے شیراز کے سر پر رکھا تھا کہ باہر سے تیز ہارن کی  
آواز سنائی دی۔ شاہنواز گھبرا گیا۔ اس نے باپ سے کہا۔

”یہ اس کی گاڑی کا ہارن ہے۔“  
”اس کا مطلب ہے ماہا آگئی ہے۔“ اب احمد نواز  
بھی پریشان ہو گیا۔ ”اس سے بھی نمٹنا ہوگا اور اگر اس کے  
ساتھ معاذ ہوا تو...؟ ذلیل شخص تو نے مجھے کس مصیبت  
میں ڈال دیا ہے؟“ احمد نواز کراہا۔ ”میں نے ساری زندگی  
ایک ہی غلط کام کیا اور وہ بھی تیری وجہ سے... آج اس کا  
پھل میرے سامنے آ رہا ہے۔“

”بابا! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔“ شاہنواز نے  
گھبرا کر کہا۔ باہر سے مسلسل ہارن کی آواز آرہی تھی۔ ”کچھ  
کریں ورنہ وہ آ جائے گی۔“

”لائٹ بجھا دو۔“ احمد نواز نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔  
”ہمیں اس کے اندر آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

شہر کی سڑکیں نسبتاً صاف تھیں اور یہاں روشنی بھی تیز  
تھی اس لیے ماہانے تیز ڈرائیونگ کی اور آدھے گھنٹے سے  
پہلے وہ گھر کے سامنے تھی۔ بارش بہت تیز تھی اور گیٹ بند  
تھا۔ اس نے ہارن دیا کہ شیراز آ کر گیٹ کھول دے۔  
لاؤنج روشن تھا یعنی شیراز وہاں یا جگن میں تھا۔ شاید ڈرائیور  
کر رہا تھا۔ ایک بار ہارن دینے پر کوئی رد عمل نہیں ہوا تو اس  
نے بین پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بہت تیز اور طویل ہارن تھا۔  
شیراز کہیں بھی ہوتا اسے سنائی دیتا۔ مگر اس بار بھی وہ اندر  
سے براہ نہیں ہوا۔ ماہا جھنجلا گئی۔ پتا نہیں شیراز کہاں تھا؟  
اب اسے بھیکنا پڑتا۔ یہ سوٹ اس نے چند ایک بار پہنا تھا  
اور اسے ڈرائیونگ کرایا تھا۔ یہ بیگ جاتا تو اس کی صورت  
ہی بگڑ جاتی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جھنجلاتی

ہوئی کار سے نیچے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھی اور ہاتھ اندر  
ڈال کر کنڈی کھول رہی تھی کہ اچانک لاؤنج کی روشنیاں بند  
ہو گئیں۔

وہ ٹھنک گئی اور اس کے اندر خطرے کا احساس جاگا۔  
اگر یہ شیراز تھا تو روشنیاں بند کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ماہا  
نے سوچا اور پلٹ کر کار تک آئی۔ اس کا دروازہ کھولا اور  
بیگ میں ہاتھ ڈال کر چھری نکال لی۔ پھر وہ دبے قدموں  
سبز حیاں چڑھ کر دروازے تک آئی۔ اس نے آہستہ سے  
ہینڈل پکڑ کر گھمایا تو وہ آرام سے گھوم گیا۔ لاک کھلا ہوا تھا۔  
اس نے دروازہ کھولا اور تاریک راہداری میں جھانکا۔  
”شیراز...“ اس نے پکار کر کہا۔

کوئی جواب نہیں آیا مگر خطرے کا احساس بڑھ گیا۔  
وہ اندر آئی اور اسی لمحے بجلی چمکی تو اس نے فرش پر اوندھے  
منہ پڑے شیراز کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف لپکی۔  
اس پر جھکتے ہوئے چلائی۔ ”شیراز! کیا ہوا...“

اسی لمحے اسے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا  
اور اس نے بے ساختہ چاقو والا ہاتھ گھمایا۔ وہ شاہنواز تھا۔  
چاقو اس کی ران کو چیرتا ہوا چلا گیا۔ اس نے چیخ ماری اور پھر  
ہاتھ گھمایا۔ اٹے لٹے ہاتھ کا تھپڑ بہت توت سے ماہا کے چہرے  
پر لگا۔ وہ پلٹ کر گری اور وہیں ساکت ہو گئی۔ احمد نواز ایک  
طرف سے نمودار ہوا اور اس نے شاہنواز سے کہا۔ ”جلدی  
کردو... ان دونوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔“

زخم لگنے کے بعد شاہنواز پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اس  
نے ماہا کے ہاتھ سے گرا چاقو اٹھایا اور اسے شیراز کی پشت  
میں اتارنا چاہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ پلٹ کر پیچھے گرا۔  
گولی اس کے سینے سے گزرتی ہوئے داخلی دروازے کے  
ساتھ کھڑکی کے شیشے کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تہ خانے کی  
طرف سے ریوالور بدست واحد نمودار ہوا تھا۔ احمد نواز  
چلایا اور بیٹے کی طرف لپکا۔ شاہنواز ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔  
گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔  
”نہیں۔“ احمد نواز چلایا اور پھر اس نے پستول کا رخ  
آگے آتے واحد کی طرف کیا تھا کہ شیراز نے چاقو اٹھا کر  
اس کے پاؤں میں اتار دیا۔ ماہا کی چیخ اسے ہوش میں لے  
آئی تھی۔ شاہنواز کو گولی لگی تھی تو اس کے ہاتھ سے چاقو  
چھوٹ کر وہیں گر گیا تھا۔ ایک دھاڑ کے ساتھ احمد نواز  
پیچھے گیا اور اس کے پستول کی گولی ہوا میں گئی۔ واحد بچ گیا  
تھا۔ پھر وہ سنبھل کر پستول سیدھا کر رہا تھا کہ واحد نے اس  
پر دو فائر کیے۔ ایک گولی نہیں لگی لیکن دوسری احمد نواز کی

جاسوسی ڈائجسٹ 287 مئی 2014ء

کے شیشے سے اسے باہر احمد نواز کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ سوچ  
رہا تھا کہ کیا کرے کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ واحد کو لے کر آیا  
تھا تو دروازے کو اندر سے لاک کرنا بھول گیا تھا۔ اسی لیے  
جب احمد نواز نے ہینڈل گھمایا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس  
کے اندر آنے سے پہلے شیراز تیزی سے آگے آیا۔ وہ نہیں  
چاہتا تھا کہ احمد نواز اندر آئے۔ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”کیا  
حال ہیں؟ آپ اتنی بارش میں نکل آئے۔“

احمد نواز کی جیکٹ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بجلی چمکی تو  
شیراز نے دیکھا اس کے پیچھے شاہنواز بھی کھڑا ہوا تھا۔  
دونوں باپ بیٹے کا انداز بہت عجیب تھا۔ احمد نواز نے سیاٹ  
لہجے میں کہا۔ ”گئی دن سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔  
تیکم بتا رہی تھی کہ ماہا گئی ہوئی ہے؟“

”ہاں... وہ اس کی دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔“  
”اور تم نہیں گئے؟“ احمد نواز نے جیسے ہونے لہجے  
میں پوچھا۔ ”یہ تو بہت قریبی رشتہ بنتا ہے۔“

”وہ... ہاں مجھے کچھ کام تھا۔“ شیراز نے کہا۔ وہ  
یوں دروازے پر کھڑا تھا کہ احمد نواز یا شاہنواز اندر موجود  
افرا تفری کو نہ دیکھ سکیں۔

”لگتا ہے تم اب بھی مصروف ہو۔“ احمد نواز نے اس  
کا حلیہ دیکھا۔

”ہاں، میں کام کر رہا ہوں ورنہ آپ کو اندر بلا لیتا۔“  
شیراز نے کہتے ہوئے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن احمد  
نواز تقریباً اسے دھکیل کر اندر آیا۔

”کوئی بات نہیں، ہم کون سے مہمان ہیں۔ اگر  
تمہیں ضرورت ہو تو ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔“ احمد  
نواز نے کہا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب پر تھا۔ شیراز  
کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے ان باپ بیٹے کے  
ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ شاہنواز نے اندر آ کر  
دروازہ بند کر دیا تھا اور اب اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوا  
تھا۔ اس کا انداز واضح طور پر دمکمی آمیز تھا۔ اندر آتے ہی  
ان دونوں نے وہ سب دیکھ لیا تھا جو شیراز ان سے چھپانا  
چاہ رہا تھا۔ اس نے اس پاس دیکھا۔ نزدیک ہی ریک پر  
اس کے آفس کی چابیوں کا گچھا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا نیل  
کٹر تھا جس کے ساتھ مختصر سا چاقو بھی تھا۔ اس نے چابیوں  
کی طرف ہاتھ بڑھا اور بولا۔

”نہیں شکریہ... مجھے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“  
احمد نواز نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ لاؤنج اور جگن  
کا معائنہ کر رہا تھا پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مکان اور

جاسوسی ڈائجسٹ 286 مئی 2014ء

جاسوسی ڈائجسٹ 287 مئی 2014ء

Scanned By famousurdunovels

دائیں آنکھ سے ذرا نیچے اتر گئی تھی۔ اس کا چہرہ عجیب سا ہوا اور پھر وہ گر گیا۔ یقیناً وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ شیراز نے اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے روشنیاں آن گئیں۔ واحد کا چہرہ راکھ جیسا ہو رہا تھا۔ اس نے نوٹے لہجے میں کہا۔

”شیراز! میں تباہ ہو گیا۔“  
شیراز ماہا کی طرف لپکا۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ اسے اٹھا کر شیراز نے صوفے پر لٹایا اور اس کے گال تھپتھپانے لگا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ واحد گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ اس کی کوشش سے ماہا جلد ہوش میں آگئی اور شیراز سے لپٹ گئی۔ وہ اسے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ شیراز نے اسے یقین دلایا۔ ”اب سب ٹھیک ہے۔ معاذ کہاں ہے؟“  
”میں اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ شکر ہے اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے گھر آتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اس نے ٹھیک کہا، وہ بھی خطرہ جان لیتا ہے۔“  
شیراز نے کہا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو واحد وہاں نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ واحد کہاں ہوگا؟ اس کے خواب کے ایک حصے کی تعبیر اب سامنے آنے والی تھی۔ اس نے پہلے شاہنواز اور احمد نواز کو چیک کیا۔ دونوں مریچکے تھے پھر اس نے ماہا سے کہا کہ وہ پولیس کو کال کرنے کی کوشش کرے اور باہر آیا جہاں واحد سیزھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سرھام رکھا تھا۔ شیراز اس کے پاس بیٹھا تو وہ بولا۔ ”یہ محلہ جسے میں مثالی سمجھتا تھا۔۔۔ یہاں یہ سب ہوتا رہا۔۔۔ میرے خدا۔۔۔“  
اس نے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔“  
”میرا قصور ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا تھا اور میں اس پر بھی نظر نہیں رکھ سکا۔ مجھے نہیں معلوم تھا میرا بیٹا جسے میں اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا، ایک لڑکی کو بے آبرو کرنے میں شامل ہو گا۔“

شیراز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ راحیل کا نہیں اصل قصور شاہنواز کا ہے۔ راحیل صرف اس کے ساتھ تھا اور یہ کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی یہاں سے گزر رہی تھی اور ایسی ہی بارش ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں چوٹ لگی اور اس وقت شاہنواز نے اسے دیکھ لیا۔ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ اسے زبردستی اندر لے گیا۔“

”راحیل اس کے ساتھ تھا۔“

”ہاں لیکن اس نے سوائے لڑکی کے ہاتھ پکڑنے کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔“  
”تو ساتھ دینا اور کہتے ہیں؟“ واحد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ بھی مجرم ہے۔“

”اگر وہ مجرم ہے تو اسے سزا مل چکی ہے۔“  
”ہاں۔“ واحد نے تھکے ہوئے انداز میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اس کی سزا پوری ہو گئی ہے لیکن میری سزا باقی ہے جو میں ساری عمر بھگتتا رہوں گا۔“  
”واحد سر جھکائے اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا اور شیراز اسے جاتا دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ماہا باہر آئی۔ اس نے شیراز سے کہا۔ ”میں نے پولیس کو کال کر دی ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟“

”بتاتا ہوں۔۔۔ اب میں تمہیں سب بتا سکتا ہوں۔“

☆☆☆

دو ہفتے بعد شیراز کا مکان پہلے جیسی حالت میں آ گیا تھا۔ حقیقی صحن کا سبزہ پھر سے اگ آیا تھا اور تہ خانے کی دیواریں اور فرش بنا دیا گیا تھا۔ پولیس نے واحد کو گرفتار کر لیا تھا مگر ایک دن بعد ہی اسے ضمانت پر رہائی مل گئی تھی۔ ردا کی لاش احمد نواز کے مکان کے تہ خانے میں دیوار ہٹا کر اس کے پیچھے چھپا دی گئی تھی۔ دونوں مکانوں کے تہ خانوں کی دیواروں کے درمیان تین فٹ کی جگہ تھی جس میں مٹی تھی لیکن جب لاش وہاں رکھی تو مٹی نکل گئی تھی اور انہوں نے غلت میں ایسے ہی دیوار اٹھا دی تھی۔ احمد نواز جان گیا تھا کیونکہ وہ عین اس وقت آ گیا جب شاہنواز دیوار اٹھا رہا تھا۔ مگر احمد نواز نے بیٹے کا جرم چھپانے میں اس کا پورا ساتھ دیا۔ اس نے دیوار کے پیچھے لاش ہی نہیں اپنی ساری عمر کی ایمانداری اور مثالی سروں کی ساکھ بھی دفن کر دی تھی۔

جب شیراز نے تہ خانے میں کنکریٹ توڑنا شروع کیا تب ہی احمد نواز اور شاہنواز مشکوک ہو گئے تھے اور جب شیراز واحد کو بلا کر اپنے مکان میں لے گیا تب انہیں یقین ہو گیا کہ شیراز نے لاش دیکھ لی ہے اور نہ صرف شاہنواز بلکہ احمد نواز بھی خطرے میں تھا۔ وہ اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے ان کے پیچھے آئے تھے۔ ان کی بد قسمتی کہ انہیں واحد کا پتا نہیں تھا کہ وہ تہ خانے میں ہے اور سچ ہے۔ جس وقت وہ دونوں گھر میں زبردستی داخل ہوئے تو واحد سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کیونکہ اب لاش لازمی سامنے آئی

اور اس کے بیٹے کا جرم اور گناہ بھی سامنے آ جاتا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شیراز کو مار سکے۔ اس لیے وہ خودکشی کرنے جا رہا تھا اور اس نے اپنے سر پر ریوالبور بھی رکھ دیا تھا۔ مگر شیراز اور ماہا کو خطرے میں پا کر وہ اوپر آنے اور ان دونوں باپ بیٹے کو شوٹ کرنے پر مجبور ہو گیا جو اس سارے کیس میں مرکزی مجرم تھے۔

واقعاتی شہادتیں اور راحیل کی ڈائری ان کے خلاف فرد جرم تھی۔ اگرچہ پولیس نے اپنے بیٹی بند بھائی کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن اعلیٰ عدلیہ نے معاملے کا از خود نوٹس لے کر اسے ایف آئی اے کے سپرد کر دیا تھا اور ایف آئی اے نے اپنی رپورٹ میں ردا کے قتل کا اصل مجرم شاہنواز کو قرار دیا۔ احمد نواز اس کی اعانت کا مجرم تھا جبکہ راحیل شریک جرم قرار پایا تھا مگر اسے عدالت میں پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعے کے دو دن بعد ڈاکٹروں نے راحیل کو مردہ قرار دے کر دفنی لیٹر سے ہٹا دیا۔ احمد نواز کی فیملی دونوں باپ بیٹے کی لاشیں ان کے آبائی علاقے میں لے گئی تھی۔ واحد نے اپنے بیٹے کو علاقے کے قبرستان میں دفن کیا اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ راحیل کی قبر ردا کی قبر سے ذرا ہی دور تھی۔ شیراز، ردا کی تدفین میں شریک تھا۔ ماہا افسوس کے لیے ان کے گھر گئی تھی۔ اس نے شیما کو پیشکش کی کہ اسکول میں چھوٹے بچوں کی کلاسز کے لیے کچھ ٹیچرز کی جاب آئی ہیں اگر وہ کہے تو وہ پر کھل سے بات کرے۔ شیما مان گئی۔ وہ خوش تھی کیونکہ اسے گریجویٹیشن کا نتیجہ آتے ہی جاب مل رہی تھی۔

☆☆☆

ثمینہ صادق کے گھر کی نشست گاہ میں شیراز، ماہا، واحد دوسرے محلے والے اور شیما بھی موجود تھی۔ شیراز اور سب کے ذہنوں میں اس معاملے کے بارے میں کئی سوالات تھے اور واحد ہستی جو ان کے جواب دے سکتی تھی، وہ ثمینہ صادق تھی۔ شیراز نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس سے ایک ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو ثمینہ نے انکار کیا مگر پھر وہ مان گئی۔ اس نے شیراز کو کال کی۔ ”آنے والے سڑے کو میرے گھر میں سب آئیں گے۔“

”یہ پارٹی کا موقع نہیں ہے۔“

”پارٹی نہیں ہوگی۔“ ثمینہ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ تم اور بہت سے دوسرے لوگ سمجھتے ہو کہ یہاں جو ہوا ہے، اس میں میرا بھی قصور ہے۔“  
”میں آپ کو قصور وار نہیں سمجھتا۔“

”اس کے باوجود میں وضاحت کرنا چاہوں گی۔“  
ثمینہ نے اصرار کیا۔ ”تو یہ طے ہے کہ سب آرہے ہیں۔“  
شیراز نے سوچا اور جواب دیا۔ ”میں سب کا تو نہیں، ہاں اپنا کہہ سکتا ہوں۔ ہم آئیں گے۔“

”مجھے یقین ہے باقی بھی مان جائیں گے۔“ ثمینہ نے کہا۔ ”پہلے تمہیں کال کی تھی۔ جب میں دوسروں کو تمہارے بارے میں بتاؤں گی تو سب آئیں گے۔“

ثمینہ کا دعویٰ درست ثابت ہوا۔ سارے محلے والے وہاں موجود تھے۔ ثمینہ نے درست کہا کہ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ سب ثمینہ کے اس عمل کے بعد شروع ہوا تھا جو اس نے شیراز پر کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ردا کی لاش تہ خانوں کی دیواروں کے درمیان موجود تھی مگر اس تک پہنچنے کی وجہ ثمینہ ہی تھی۔ لاش کی دریافت نے دو گھرانوں کو تباہ کر دیا۔ شیراز نے یہ سب سنا تھا۔ اسے تصویر نے بتایا تھا مگر وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے ثمینہ کے گھر میں موجود افراد سے کہا۔ ”یہ بات طے ہے کہ شاہنواز اور احمد نواز دونوں مجرم تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ راحیل بھی چھوٹے درجے کا سچ لیکن قصور وار تھا اور اتفاق سے یہ تین افراد ہی کیفر کردار کو پہنچے۔“

تو اس سے متفق نہیں تھا۔ ”لیکن ان کے گھر والوں نے جو صدمہ برداشت کیا؟“

شیراز نے گہری سانس لی۔ ”دیکھا جائے تو کوئی بھی فعل انسان کا انفرادی نہیں ہوتا۔۔۔ اس کے پس پشت کئی لوگ اور عوامل ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے راحیل اور شاہنواز دونوں کے گھر والے اپنے لڑکوں پر نظر نہیں رکھ سکے کہ ان کی اصل سرگرمیاں کیا ہیں اور ان کا کردار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شریف لڑکا ایسی حرکت کر سکتا ہے جو شاہنواز نے اس مظلوم لڑکی کے ساتھ کی۔ یہ کھلی غنڈا گردی اور بد معاشی تھی۔ راحیل نے اس کا ساتھ دیا اور پھر اس کا جرم چھپایا۔ یہ اس کی شرافت تھی کہ اس کا ضمیر اس جرم کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور اس نے خودکشی کر لی۔ شاہنواز جو اصل مجرم تھا، اس کے ضمیر نے اسے مجبور نہیں کیا کیونکہ اس کے پاس ضمیر نام کی چیز ہی نہیں تھی۔ احمد نواز نے اس کا ساتھ دیا۔ حالانکہ وہ نیک نام اور ساکھ والا شخص تھا مگر اولاد کے آگے جھک کر اس نے بھی غلط کام کیا اور اس کی سزا بھگتی۔ میرا خیال ہے جو ہوا، یہ قدرت کی طرف سے تھا۔ اس میں کسی انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“

”بادجو داس کے کہ ردا کی لاش تم نے دریافت کی۔“

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپیڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سمجھتے۔ ہم انہیں بہت سرسری سالیے ہیں۔“  
 ”بہر حال، میں اپنے ضمیر کے سامنے مطمئن ہوں۔“  
 شیراز نے کہا۔  
 ”یقیناً تم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور ایسے ہی لوگ اندر سے توانا ہوتے ہیں تب ہی وہ دوسری دنیا سے رابطے کر پاتے ہیں۔“  
 ”میں مزید کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا۔“ شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”تمہیں مسکرائی۔“ تم بھی ان لوگوں کی طرح بے حس بن جاؤ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

احمد نواز کی فیملی واپس نہیں آئی اور ان کے مکان پر برائے فروخت کی سختی لگ گئی۔ دو مہینے بعد جب کیس ختم ہو گیا تب واحد نے بھی اپنا مکان فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیراز نے سنا تو وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ان چند مہینوں میں وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑا لگنے لگا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ نظر آتی تھی اور اب وہ سنجیدہ رہنے لگا تھا۔ ”تم یہاں سے جا رہے ہو؟“  
 اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے سوچا ہے کہ میں محلے کے قابل نہیں ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے یہ محلہ تمہارے قابل نہیں ہے جسے تم مثالی محلہ کہتے تھے۔“ شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔ ”واحد! میرے دل میں تمہاری عزت اس سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے جتنی پہلے تھی۔ تم نے بہت حوصلے اور بلند کردار کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ احمد نواز نے جس طرح اولاد کی خاطر جرم میں اس کا ساتھ دیا، ایسا کرنا تمہارے لیے بھی تو مشکل نہیں تھا۔ تمہارا بیٹا بھی با ضمیر تھا تب ہی اس نے خودکشی کر لی۔ شاہنواز اپنے باپ کی طرح بے ضمیر تھا اس لیے نہ صرف زندہ رہا بلکہ اپنا جرم چھاننے کے لیے ان باپ بیٹے نے میری اور ماہا کی جان لینے کی کوشش کی اور تم نے ہماری جان بچالی۔“  
 واحد پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”دوست! میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں اس محلے کے قابل نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بات درست ہو لیکن میں اپنے یقین سے اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہوں گا۔“

شیراز ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اس کے خیال میں واحد کا یہاں سے جانا اپنے یقین سے دست بردار ہونے کے مترادف ہی تھا۔



سمجھنے میں نے کہا۔  
 ”یہ بھی میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔“ شیراز نے وضاحت کی۔ ”میری درخواست پر تمہین نے مجھے پھر ہینا ناز کیا اور مجھے کھدائی کا اشارہ ملا۔“  
 ”ہمارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد رو جس دنیا سے چلی جاتی ہیں۔“ شیراز نے کہا۔ ”اس کے بعد واپس نہیں آسکتیں۔ اس لیے یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ ردا کی روح ذمے دار ہے۔“

”ردا کا نام کسی نے نہیں لیا ہے۔“ اس بار تمہین نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اگر کسی بھی وجہ سے ایک چھپا ہوا جرم سامنے آ گیا اور اس کے ذمے داروں کو سزا ہو گئی تو اس میں اعتراض کرنے والی کیا بات ہے؟“  
 ”اعتراض کسی کو نہیں ہے۔“ شیراز نے کہا۔ ”بات صرف یہ ہے کہ وہ اس محلے کے لڑکے...“  
 ”اس لیے اگر وہ کسی لڑکی کو ریپ کی کوشش میں قتل کر دیں تو انہیں اس کا حق حاصل ہے۔“ تمہین نے سچ لہجے میں کہا۔ ”معذرت کے ساتھ... اس واقعے سے اس محلے کا تاثر اتنا مجروح نہیں ہوا جتنا آپ کی اس بات سے ہوا ہے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے رہائش کے لیے اس جگہ کو کیوں چنا۔“

”تمہین ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ شیراز کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ ”مجھے بھی افسوس ہے کہ میں یہاں رہا اور اس کا ایک حصہ رہا۔ ہاں، میں نے قالین کے نیچے چھپا گند سب کے سامنے کر دیا۔ آپ سب چاہتے ہیں کہ اس گند کو چھپا رہنے دیا جاتا؟ اس نام نہاد مثالی محلے کو یونہی مثالی بنا رہنے دیا جاتا؟ کیونکہ ماری جانے والی لڑکی کا اس محلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ شیراز کھڑا ہو گیا۔ ”یا پھر تم ٹھیک نہیں کہہ رہے ہو۔“

شیراز کے بعد باقی سب بھی ایک ایک کر کے تمہین کے گھر سے رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر میں صرف شیراز اور ماہا رہ گئے تھے۔ شیراز نے تمہین کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے ان لوگوں کا رویہ دیکھا... جو ہوا انہیں اس کی وضاحت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، انہیں سارا دکھ اس بات کا ہے کہ اس سانحے کے سامنے آنے پر محلے کا ماحول ختم ہو گیا۔“

تمہین نے سر ہلایا۔ ”یہ صرف اسی گلی کا نہیں، اس پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ ہم اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے محلے اور اپنے شہر سے باہر کے مسائل اور حادثات کو اپنا نہیں